عصرِ حاضر
اور
اسلام کا نظامِ قانون

ڈاکٹر محمد امین

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ
اُردو بازار۔ لاہور

عصرِ حاضر

اور

اسلام کا نظامِ قانون

ڈاکٹر محمد امین

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ
اُردو بازار۔ لاہور

ناشر ____________ ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ ۔ لاہور
کمپوزنگ و طباعت ______ ایمان پرنٹرز ۔ لاہور فون ۲۷۲۶۳۶
طبع اول ____________ نومبر ۱۹۸۹ء
قیمت ____________ روپے

عرض ناشر

اسلامی قانون اور ہم عصر معاشرے میں اس کا نفاذ ہمارے عہد کا ایک زندہ موضوع ہے جس پر تحقیق و تنقیح کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے ۔ ڈاکٹر محمد امین صاحب نے، جنہیں قدیم و جدید سے فیض یابی کا بہرۂ وافر ملا ہے، اپنی اس تازہ تصنیف میں نہ صرف اسلامی قانون کے نظریاتی پہلوؤں (اسلامی قانون کی اصطلاحات ، تاریخ اور مآخذ وغیرہ) پر سیر حاصل بحث کی ہے بلکہ کتاب کا زیادہ حصہ عصری مسائل اور ان کے اسلامی حل کے سلسلے میں تنقید و تحلیل اور تجاویز و تبصروں پر مشتمل ہے ۔ ان مسائل میں اسلامی قانون کی تدریس ، عدالتوں میں اس کی تطبیق اور قانون سازی و اجتہاد کے حوالے سے ہم عصر حکومتی ڈھانچے اور پارلیمنٹ کے قانون سازی کے حق اور اس کے دائرۂ کار جیسے اہم مباحث شامل ہیں ۔ پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کے بارے میں کی جانے والی کوششوں کا بھی انہوں نے بھرپور جائزہ لیا ہے جس سے پاکستان میں ان کوششوں کا ایک تاریخی تطور ہمارے سامنے آتا ہے اور اس سلسلے میں اختیار کئے جانے والے طریق کار اور اس رستے کی عملی مشکلات سے بھی ہمیں آگاہی حاصل ہوتی ہے ۔

ہمیں توقع ہے کہ وکلاء ، طلبہ، ممبران عدلیہ ، صحافی اور پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ سے دلچسپی رکھنے والے دیگر حضرات اس تحقیقی کتاب کو خوش آمدید کہیں گے۔

فہرست

باب سوم: اسلامی قانون - ایک تاریخی تجزیہ

حصہ دوم: عصری مباحث

باب چہارم: اسلام اور قانون سازی

باب پنجم: اسلامی قانون اور عدالتیں

باب ششم: اسلامی قانون کی تعلیم

باب ہفتم: عصر حاضر کے مسلم معاشرے میں اسلامی قانون کی تنفیذ

باب ہشتم: پاکستان میں قانون کی اسلامائزیشن اور تطبیق (ایک جائزہ)

فہرست جداول

فہرست ضمیمہ جات

حصہ اوّل

نظری مباحث

باب اول

مصطلحات اور خلطِ مبحث

جب ہم اسلام کے نظامِ قانون پر بحث کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں یہ واضح کرنا ہو گا کہ اسلام کے نظامِ قانون سے ہماری مراد کیا ہے ؟۔ کیا قانون، اسلامی قانون ، حکم ، فقہ اور شریعت جیسی مصطلحات محض مترادفات ہیں اور اگر نہیں ہیں تو ان میں فرق کیا ہے ؟ دوسرے یہ کہ کیا اسلام ہمیں ایک مکمل قانونی نظام دیتا ہے یا اس نے ہمیں صرف بنیادی ہدایات دینے پر اکتفا کیا ہے اور باقی کام علماء اور فقہاء نے کیا ہے ؟ اس تمہیدی باب میں انہی دو باتوں پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے ہم ان دو سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کریں گے ۔

مصطلحات کی بحث مجرد لفاظی اور کتابی قسم کی بحث نہیں ہے بلکہ یہ نہایت اہم ہے کیوں کہ مصطلحات کے فرق کو ملحوظ نہ رکھنے سے نہ صرف خلطِ مبحث واقع ہوتا ہے اور غلط فہمی پیدا ہوتی ہے بلکہ اس سے غلط نتائج مستنبط ہوتے ہیں جیسا کہ ہم تفصیلاً عرض کریں گے ۔

قانون : یونانی الاصل کلمہ ہے (Kainon)، وہاں سے انگریزی میں آیا تو (Canon) ہوا ۔ (۱) عربی میں کثیر الاستعمال ہے جس کے معنی ہیں اصول و قواعد (۲) مثلاً الماوردی 'الاحکام السلطانیہ' میں کہتے ہیں "لانہ مندوب لحفظ القوانین و استیفاء الحقوق" (۳) اور ابن رشد بدایۃ المجتہد میں کہتے ہیں "۔۔۔۔ لتکون قانون للمجتھد" (۴) اور ابن تیمیہ نے کہا ہے کہ "فلتکن القواعد الفاسدۃ التی جعلوھا قوانین ۔۔۔۔ ثم ان ھذہ القوانین فیھا ما ھو صحیح لاریب ۔۔۔۔" (۵) اور مالکی فقیہ ابن جزی نے اپنی کتاب کا نام 'قوانین الاحکام الشرعیہ و مسائل الفروع الفقھیہ' رکھا ہے ۔ اصطلاحی طور پر فقہاء نے "قانون" کو "فقہ" یا "شریعت" کے متبادل کے طور پر کبھی استعمال نہیں کیا ۔ اسی طرح عصرِ حاضر میں "اسلامی قانون" کی اصطلاح عربوں میں غیر مروّج ہے ۔ "قانون" کی اصطلاحی تعریف موجودہ دور میں یہ ہے کہ "قانون ان قواعد و احکام کا مجموعہ ہے جو سوسائٹی کی تنظیم کے لیے مملکت نافذ کرتی ہے" (۶) ۔ "قانون" کی یہ تعریف "قانونِ وضعی" کی ہے "فقہ اسلامی" کی نہیں ۔ اگرچہ لغوی لحاظ سے قانون اسلامی بھی ہو سکتا ہے ، غیر اسلامی بھی ، مبنی بر وحی بھی ہو سکتا ہے اور انسانی تخلیق بھی ۔

اردو میں لفظ "قانون" عام طور پر انگریزی لفظ Law کے ترجمے کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور اگرچہ خود مغربی محققین Law کی تعریف میں یکسو نہیں ہیں لیکن فقہ اسلامی میں کلمہ

"قانون" ان اصطلاحی معنوں میں کبھی استعمال نہیں ہوا جیسا کہ موجودہ دور میں اس کے معنی لئے جاتے ہیں چنانچہ ہمارے ہاں عام طور پر قانون سے مراد وہ رسوم اور قواعد و ضوابط لئے جاتے ہیں جنہیں مملکت نافذ کرتی ہے اور ان کی خلاف ورزی پر سزا دیتی ہے (۷) اس کے مقابلے میں فقہ کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ان قواعد و ضوابط کا مجموعہ ہے جو علماء نے اپنی دینی تالیفات میں جمع کیے ہیں اور جو قرآن و سنّت اور اجتہادِ شرعی پر مبنی ہیں ۔

فقہ: لغوی طور پر فقہ کا مطلب ہے علم اور فہم (۸) امام راغب اصفہانی کے نزدیک فقہ کا مطلب ہے کسی چیز کے باطن کو جاننا اور اس کا گہرا علم حاصل کرنا (۹) قرآن مجید نے بھی اس لفظ کو فہمِ دقیق کے معنوں میں استعمال کیا ہے ۔

——- ﴿قالوا یا شعیب ما نفقه کثیرا مما تقول﴾ (۱۰)

——- ﴿فلو لا نفر من کل فرقة منهم طائفه لیتفقهوا فی الدین﴾ (۱۱)

صدرِ اسلام میں یہ لفظ (مجرد علم و فہم کے علاوہ) شرعی احکام کے فہم کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا خواہ وہ احکام نظری ہوں یا عملی اور خود ان احکام کو بھی فقہ کہنے کی مثال اس حدیث سے ملتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے "۔۔۔۔ رب حامل فقه الی من هو افقه منه (۱۲) ۔ البتہ دورِ آئمہ میں علوم کی اشاعت اور تخصصات کے وجود میں آنے کی وجہ سے اس لفظ کا اطلاق شریعت سے احکام کے استنباط کے علم اور ان عملی شرعی احکام کے مجموعہ تک ہو کر رہ گیا خواہ وہ قرآن و سنت پر مبنی ہوں یا اجتہادِ شرعی کے ذریعہ مستنبط شدہ ۔ دورِ اجتہاد کے بعد کے زمانے کے وہ احکام بھی جو انہی اصول و قواعد پر مستنبط ہوئے ہیں فقہ ہی کا حصّہ شمار ہوتے ہیں (۱۳) ۔ فقہ کے عملی احکام عبادات اور معاملات کی تفصیل سے بحث کرتے ہیں یعنی انسان کے روابط اپنے خالق کے ساتھ اور اپنے ہم جنس افراد کے ساتھ، اور یہی دو پہلو اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی کی بقا اور حرکت کا اظہار ہیں اور ان کے ٹھیک ہونے پر ہی انسان کی دنیوی اور اخروی زندگی کی کامیابی کا انحصار ہے ۔ البتہ جو چیز فقہ کے دائرے سے باہر ہے وہ عقائد اور اخلاقیات ہیں ۔

شریعت: شریعۃ (ش ر ع) کے معنی اہلِ لغت کے نزدیک ہیں "پانی کے گزرنے کا راستہ" یا "وہ جگہ جہاں جا کر پانی پیا جائے" (۱۴) ۔ اس سے لفظ شریعت کے یہ معنی مجازاً لئے جاتے ہیں کہ یہ وہ سیدھا راستہ ہے جو انسان کو اس کے منبعِ حیات تک لے جاتا ہے نیز ان اصول و ضوابط کو جو انسان کو شاہراہِ حیات پر سیدھا اور منظم طور پر چلنے میں مدد دیتے ہیں ان کو بھی شریعت انہی معنوں میں کہتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کے احکام (اوامر و نواہی) کو بھی شریعت اسی لئے کہا گیا ہے کہ جس طرح پانی انسانی زندگی کی بقاء کا سبب ہے اسی طرح یہ شریعت انسان کی اخلاقی، عقلی اور

روحانی زندگی کی بقاء اور صلاح کی ضامن ہے نیز شریعت وہ سیدھا راستہ ہے جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں اور یہ وہ راستہ ہے جس پر چل کر آدمی حق کے منبع تک پہنچتا ہے ۔

شریعت کا دائرۂ کار کیا ہے ؟ بعض علماء شریعت اور دین کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھتے ہیں کہ جس طرح دین عقائد و عبادات اور معاملات و اخلاقیات سے بحث کرتا ہے اسی شریعت بھی ان سارے امور سے بحث کرتی ہے(۱۵) ۔ اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ عقائد شروع ہی سے ساری انسانیت اور سارے رسولوں کے لئے مشترک رہے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان، رسول کی رسالت اور آخرت پر ایمان وغیرہ(۱۶) لیکن جہاں تک شریعت (یعنی عملی احکام) کا تعلق ہے مختلف رسولوں کی شریعتیں ایک دوسرے سے مختلف رہی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿لکل جعلنا منکم شرعة و منهاجا﴾ (۱۷)۔

اس سے پہلے ہم فقہ کی تعریف میں کہہ چکے ہیں کہ اس میں عملی احکام سے بحث کی جاتی ہے اور یہی تعریف اب ہم نے شریعت کی بھی کی ہے تو آخر شریعت اور فقہ میں فرق کیا ہے ؟ فرق یہ ہے کہ شریعت ان عملی احکام کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے انسانوں کی ہدایت کے لئے نازل کئے ہیں خواہ وحیٔ متلو کی صورت میں (بصورتِ قرآن) خواہ وحی غیر متلو کے ذریعے سے رسولؐ کے اعمال و اقوال کی صورت میں (یعنی سنّت رسول اللہ) ۔ اس کے مقابلے میں فقہ میں نہ صرف ان احکام کو مدون کیا گیا ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا صریح حکم موجود ہے بلکہ ایسے احکام بھی اس میں شامل ہیں جو ان منصوص احکام کی تفسیر و تشریح ہیں یا جو مجتہدین کی اجتہادی کوششوں کا ثمر ہیں ۔ اس بنیادی فرق کی وجہ سے دوسرے بہت سے فرق بھی پیدا ہو جاتے ہیں، مثلاً:

۱ ۔ شریعت کے احکام قطعی اور یقینی ہیں کیونکہ وہ وحی پر مبنی ہیں جب کہ فقہ کے وہ احکام جو اجتہاد پر مبنی ہیں ظنی ہیں اور ان سے علمِ یقینی حاصل نہیں ہوتا ۔

۲ ۔ شریعت کے احکام میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جا سکتی جب کہ فقہ کے اجتہادی احکام وقت اور حالات کے بدلنے کے ساتھ بدل سکتے ہیں ۔

۳ ۔ شرعی احکام کی بلاچون وچراں پابندی ضروری ہے خواہ حکومت انہیں نافذ کرے یا نہ کرے جبکہ فقہاء کے اجتہادات پر عمل اختیاری بات ہے اِلّا یہ کہ حکومتِ وقت اپنی قوتِ نافذہ سے کوئی بات بطور قانون نافذ کر دے ۔

۴ ۔ شریعت سراسر خدا اور اس کے رسول کی طرف سے ہے اور منزّہ عن الخطا ہے جبکہ فقہ میں انسانی عقل اور تدبّر کو دخل حاصل ہے اور اس میں غلطی کا امکان موجود ہے ۔

جیساکہ پیشتر ازیں عرض کیا جا چکا ہے کہ ماضی میں لفظ قانون بحیثیت ایک اصطلاح کے نہ تو شریعت کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور نہ فقہ کے لئے بلکہ یہ اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے اب ہم اگر اسے بحیثیت مصطلح استعمال کرتے ہیں تو آخر اس سے ہم کیا مراد لیتے ہیں، شریعت یا فقہ؟

بعض اصحاب نے یہاں یہ نقطۂ نظر اختیار کیا ہے کہ قانون یعنی (Law) حکم کے مترادف ہے لیکن جس ابہام کی طرف ہم اشارہ کرنا چاہتے ہیں حکم کی اصطلاح اختیار کرنے کے باوجود اس ابہام سے بچ کر نکلا نہیں جا سکتا کیونکہ ، جیساکہ ابھی ذکر ہوا، احکامِ شریعت بھی دو طرح کے ہیں احکامِ منصوصہ اور احکامِ اجتہادیہ اور سوال علی حالہ باقی رہے گا کہ قانون سے مراد احکامِ منصوصہ ہیں یا احکامِ اجتہادیہ ، نیز یہ بھی واضح رہے کہ حکم کی تعریف اصولیوں نے عام طور پر یہ کی ہے "ھو خطاب الشارع المتعلق بافعال المکلفین طلباً او تخییراً أو وضعاً" (١٨) یعنی "یہ مکلفین کے اعمال سے متعلق شارع کا ایک ایسا خطاب ہے جو اپنے اندر طلب ، تخییر اور وضع کی کیفیت لئے ہوئے ہے" اور انہوں نے صاف طور پر لکھا ہے کہ حکم دینے والا یعنی "حاکم" صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ، امام غزالی کہتے ہیں "لا حکم الا اللہ وانہ لا حکم للرسول ولا لسید علی العبد ولا لمخلوق علی مخلوق بل کل ذلک حکم اللہ تعالیٰ و وضعہ لا حکم لغیرہ" (١٩) اور امام آمدی کا کہنا ہے "اعلم انہ لا حاکم سوی اللہ ولا حکم الا ما حکم بہ" (٢٠)۔

اگر یہ کہا جائے کہ حکمِ شرعی کی عدم موجودگی میں (یعنی اگر شارع نے حکم صریح نہ بیان کیا ہو تو) ایک مجتہد ادلہ شرعیہ کے ذریعے اور استنباط و قیاس کے طریقے سے جس نتیجے پر پہنچتا ہے وہ بھی "حکمِ شرعی" ہی ہے یعنی عین شریعت ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ شریعت اور فقہ ایک ہی چیز ہیں اور یہ نہ صرف غلط ہے بلکہ اس سے خلطِ مبحث اور بڑھے گا کیونکہ اس سے ایک تو ہم شریعت کو اس کے اصل مرتبے سے نیچے لا کر فقہ تک کھینچ لائیں گے اور اسے قابل تغیر بنا دیں گے اور اس کے ساتھ ہی فقہاء کو منزّہ عن الخطا اور شارع تسلیم کرنا پڑے گا جب کہ ایک مسلمان کے نزدیک ان دونوں باتوں کا تصور ہی محال ہے ۔

اب اگر "قانون" بطور ایک مصطلح کے نہ تو "شریعت" کے مترادف ہے ، نہ "فقہ" کے اور نہ "حکم" کے تو پھر اس مسئلے کا حل کیا ہے ؟ اس کا ایک سیدھا سادھا حل تو یہ ہے کہ ہم نئی اصطلاحات استعمال نہ کریں بلکہ وہی اصطلاحات استعمال کریں جو ہمارے ہاں پہلے سے رائج ہیں یعنی شریعت ، فقہ، حکم وغیرہ کی اور اگر ہمیں نئی صورتحال سے سابقہ ہو تو نئی اصطلاح ایسی ہونی

چاہیئے جو پہلی اصطلاحات کی نقیض نہ ہو مثلاً سعودی عرب میں ان قواعد و نظم کے لئے جو حکومت جاری کرتی ہے "نظام" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اور اگر ہم کوئی ایسی اصطلاح استعمال کرنے کا فیصلہ کریں جو دوسری اقوام کے ہاں ان کے مخصوص معنوں میں مستعمل ہے مثلاً "قانون" یا "لاء" تو ہمیں چاہیئے کہ پہلے واضح کر دیں کہ اس کے معنی ہمارے نزدیک کیا ہیں تاکہ وہ معنی سب کے لئے معروف ہو جائیں (اگرچہ ابہام کا امکان پھر بھی باقی رہے گا) ۔ اس تفصیل کے بعد اگرچہ اقرب الی الصواب یہی لگتا ہے کہ فقہ کی پرانی اصطلاحات ہی استعمال کی جائیں اور ایسی مصطلحات کو جو اصلاً ہماری نہ ہوں، ہم استعمال نہ کریں تاکہ خلطِ مبحث کا اندیشہ نہ رہے لیکن وقت یہ ہے کہ بعض مصطلحات اتنی معروف اور زبان زدِ عام ہو چکی ہیں کہ ان کی بجائے اصل عربی اصطلاحات کو یا نئی اسلامی اصطلاحات کی مروّج کرنا آسان نہیں ہے ، مثلاً "اسلامی قانون" کا لفظ ہمارے ہاں اس کثرت سے لکھا اور بولا جاتا ہے کہ اس کے بجائے کوئی دوسری اصطلاح استعمال کرنا آسان نہیں ہے ۔ چنانچہ ہم نے طے کیا ہے کہ ہم ، تحفظات رکھنے کے باوجود ، مروّج اصطلاحات استعمال کریں گے لیکن پہلے یہ طے کر لیں گے کہ اس سے ہماری مراد کیا ہے ؟ چنانچہ اس کتاب میں ہم شریعت ، اجتہاد ، دین اور فقہ کے الفاظ ان کے معروف فقہی معنوں میں استعمال کریں گے جب کہ قانون سے مراد ہمارے نزدیک "قانون وضعی" یعنی انسان کا بنایا ہوا قانون ہو گا اور اس کے برعکس اس کتاب میں "اسلامی قانون" کا مطلب ہو گا "وہ قواعد و ضوابط جو قرآن و سنّت اور اجتہادِ شرعی پر مبنی ہوں" خواہ انہیں حکومت نافذ کرے یا نہ کرے ۔ جو قواعد و ضوابط حکومت بنائے اور نافذ کرے اگر وہ "اسلامی قانون" کے مطابق ہوں یعنی قرآن و سنّت پر مبنی ہوں یا اجتہادِ شرعی کے اصولوں کے مطابق بنائے جائیں تو وہ "اسلامی قانون" کا ایک جزء شمار ہوں گے ورنہ بصورتِ دیگر مردود تصور ہوں گے ۔

آئیے اب ایک نظر دیکھیں کہ ان مصطلحات کے معاملے میں یکسوئی نہ ہو تو کیا نتیجہ نکلتا

ہے:

۱ ۔ ڈاکٹر ریاض الحسن گیلانی اپنی انتہائی اچھی کتاب "The Reconstruction of Legal Thought in Islam" میں اسلامی قانون (Islamic Law) سے مراد لیتے ہیں شریعت یعنی خدا کا قانون جو منزل من اللہ ہے ، اکمل و کامل ہے (۲۱) پھر کئی صفحوں میں شریعت کی خوبیاں بیان فرماتے ہیں اور اس کا دوسرے قوانین سے موازنہ کرتے ہیں لیکن آخر میں ایک جگہ فقہ پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فقہ کو بھی عملاً "قانون" کا درجہ حاصل ہے (۲۲) ۔ اب فرمائیے کہ اس "سادہ لوحی" کو کیا کہا جائے کہ شریعت قانون بھی ہے اور فقہ بھی ۔

۲۔ مشہور مستشرق پروفیسر نوئل کلسن نے اپنی کتاب "Conflicts and Tensions in Islamic Jurisprudence" میں یہ مؤقف اختیار کیا ہے اور اسے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی قانون میں تضاد ہے ۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ شریعت اور اجتہاد کے دائرہ ہائے کار میں جو فرق ہے اسے ملحوظ نہیں رکھ سکے نتیجہ یہ ہے کہ جہاں کہیں کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ اجتہادی آراء ایک دوسرے کی مخالف ہوں یا کوئی اجتہادی رائے ، شرعی احکام کے مطابق نہ ہو (ان کی ذاتی رائے میں) تو وہ اسے اسلامی قانون میں تضاد قرار دے دیتے ہیں ۔

۳ ۔ سعودی عرب کے مذہبی اداروں کے موجودہ سربراہ اور مشہور عالمِ دین شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز نے چند سال پیشتر (جب وہ مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے) بادشاہ کو لکھا کہ مملکتِ سعودیہ میں قانون ساز ادارے کو (سعودی عرب میں قانون سازی کے اختیارات بادشاہ کی سربراہی میں کابینہ کو حاصل ہیں) "شارع" لکھا جاتا ہے جو خلافِ اسلام ہے کیونکہ خدا کے سوا کوئی (مطلقاً) شارع نہیں ہے ، چنانچہ بادشاہ نے کابینہ میں یہ بات اٹھائی اور یہ آرڈیننس جاری ہوا کہ قانون ساز اداروں اور افراد کو "شارع" نہ لکھا جائے بلکہ متبادل الفاظ استعمال کئے جائیں (۲۳)۔

۴۔ ریاض (سعودی عرب) میں محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی سے ملحق کالج "معہد العالی للقضاء" (اس ادارے میں فقہ خصوصاً قضاء میں پی ایچ ڈی تک کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام موجود ہے) میں ایک ماہرِ قانون استاد (جو فقہ اسلامی میں خاصی دسترس رکھتے تھے) اور جامعہ الازہر کے ایک پرانے شیخ کے درمیان (جو اسی کالج میں استاد تھے) سیشن ۷۵۔ ۱۹۷۶ء میں یہ علمی بحث چلی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو شارع کہا جا سکتا ہے یا نہیں ۔ ڈاکٹر موصوف نے قرآن و حدیث اور لغت کے حوالے دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ایسا کہا جا سکتا ہے ۔ ازہری شیخ نے اس کی زبردست مخالفت کی اور بات اتنی دور تک پہنچی کہ ڈاکٹر صاحب موصوف ملازمت جاری نہ رکھ سکے (۲۴) ۔

اجنبی اصطلاحات کے استعمال کے بارے میں عملاً یہ کہنا بے سود نہ ہوگا کہ بعض اصحاب کے نزدیک یہ افضل ہے کہ پرانی اسلامی اصطلاحات ہی استعمال کی جائیں ۔ ان کے خیال میں وہ ہمارے علوم اور ان کے مزاج سے زیادہ مطابقت رکھتی ہیں نیز دینی غیرت اور وقار کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اپنی مصطلحات اور اپنا انفرادی تشخص برقرار رکھا جائے ، جب دوسرے لوگ اپنی اصطلاحات چھوڑ کر ہماری اصطلاحات اختیار نہیں کرتے اور اپنی گمراہی پر نازاں ہیں تو کیا ہم ہی

ایسے گئے گزرے ہیں کہ اپنے علوم اور مصطلحات کے سلسلے میں احساسِ کمتری کا شکار ہوں ۔ ان کا موقف یہ بھی ہے کہ دوسری قوموں کے علوم اور ان کی مصطلحات خالی مصطلحات نہیں ہوتیں بلکہ ان کے پیچھے پورا فلسفہ کارفرما ہوتا ہے مثلاً مغرب میں جمہوریت (Democracy) کا اپنا تصور ہے اب صرف "اسلامی" کا سابقہ لگا دینے سے جمہوریت کا وہ تصور جو مغرب میں لفظ "جمہوریت" سے وابستہ ہے، ختم نہیں ہو جاتا لہٰذا "اسلامی جمہوریت" کی اصطلاح کا استعمال غلط ہے ۔ اسی طرح "اسلامی سوشلزم" ، "خود مختار پارلیمنٹ" اور "مجلسِ قانون ساز" جیسی مصطلحات کا استعمال ایک اسلامی ملک میں غلط ہے ۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ شارع نے بعض معاملات میں تفصیلی احکام اپنی حکمت بالغہ سے ہمیں نہیں دیئے اور صرف اصولی احکام دینے پر اکتفا کیا ہے اور یہ اب مجتہدین امت کا کام ہے کہ نصوص اور شرعی اصول و قواعد کی روشنی میں تفصیلات مہیا کریں ، ایسے تفصیلی معاملات میں اب اگر نئے ادارے بنائے جائیں تو ان کے نام رکھنے میں اسلامی اور غیر اسلامی کی بحث فضول ہے بشرطیکہ ان میں صراحۃً کوئی چیز غیر اسلامی نہ ہو ۔ اس کے ساتھ ہی اس نقطۂ نظر کے حامی یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ نئے نظامِ تعلیم کے برسوں سے مروّج ہونے کی وجہ سے پرانی فقہی اصطلاحات آج عوام کے ایک بڑے طبقے کے لئے غیر مانوس ہو چکی ہیں لہٰذا نئی اصطلاحات کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ یہ وضاحت کر دی جائے کہ ان میں اسلامی اصولوں کو برقرار رکھا جائے گا مثلاً "اسلامی جمہوریت" سے مراد ایسی جمہوریت ہے جو مغربی اصولوں کی بجائے اسلامی اصولوں پر مبنی ہو اور ایک اسلامی ملک میں "خود مختار قانون ساز ادارے" کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جس قسم کا قانون چاہے بنا سکتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قرآن و سنت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے فرعی قوانین و ضوابط بنا سکتا ہے ۔

اگرچہ مذکورہ دونوں قسم کی آراء میں وزن ہے اور دونوں نقطۂ ہائے نظر قابلِ توجہ ہیں تاہم ہماری رائے یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اجنبی اصطلاحات استعمال کرنے سے پرہیز ہی کرنا چاہئے اور ان کی بجائے اپنی اصطلاحات یا ایسی نئی اصطلاحات استعمال کرنی چاہئیں جو ہمارا مفہوم کی نقیض نہ ہوں ، ہاں ایسے نام رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں جو مباح ہوں اور جن میں کوئی چیز غیر اسلامی نہ ہو ۔

دوسرا سوال جس کا ہمیں یہاں جواب دینا ہے وہ یہ ہے کہ کیا اسلام ہمیں ایک مکمل قانونی نظام دیتا ہے ؟ اس کا ایک لفظی جواب یہ ہے کہ "ہاں" لیکن اس "ہاں" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قانون سے متعلق تمام جزئیات قرآن و سنت میں موجود ہیں یا یہ نظام اپنی ساری

تفصیلات سمیت منزل من اللہ ہے اور اس میں انسانی عقل و تدبر کا کوئی دخل نہیں ہے ۔ اس مؤقف کی وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ ہم مختصراً بتائیں کہ خود اسلام کیا ہے ، زندگی کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر کیا ہے اور انسان کے قانونی مسائل کو وہ کس طرح حل کرتا ہے ؟

کرۂ ارض پر انسانی زندگی کے بارے میں انسانوں میں دو طرح کے رویّے پائے جاتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ انسان طبعی قوانین کی پیداوار ہے ، اس کا کوئی خالق نہیں ، یہ کسی کو جواب دہ نہیں ، کسی اخلاقی پابندی کی کوئی اساس نہیں ۔ اس نقطۂ نظر کو ہم لادینی نقطۂ نظر کہہ سکتے ہیں ۔ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کائنات ایک خالق کی پیدا کردہ ہے ، انسان کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے جس طرح اس نے پوری کائنات کو ایک حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس میں کارفرما تدبر ہر سو عیاں ہے اسی طرح اس نے انسان کو بھی عبث پیدا نہیں کیا ۔ اس نے انسان کو صرف پیدا ہی نہیں کیا اور اسے اپنی مرضی کے مطابق یا اس کے مخالف زندگی بسر کرنے کی آزادی ہی نہیں دی بلکہ اس کو یہ بتانے کا انتظام بھی کیا ہے کہ اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے ۔ صحیح زندگی بسر کرنے کا یہ طریقہ جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو بتایا ہے اس کا نام "اسلام" ہے ، اس دوسرے نقطۂ نظر کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ بندہ ہے ، ارادے کی جو آزادی اور کائنات میں تصرف کی جو سہولت اسے اس محدود عمر میں دی گئی ہے وہ دراصل اس کے امتحان کے لئے ہے ، اگر وہ اس آزادی کو خالق کی مرضی کے مطابق برتتا ہے ، اس کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے (اور یہی لفظ 'اسلام' کے معنی ہیں) تو وہ درحقیقت کامیاب ہے، اس دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی حقیقی اور پائیدار زندگی میں بھی جہاں اسے خالق کی خوشنودی حاصل ہوگی اور ہر وہ نعمت میسر ہوگی جس کا تصور وہ کر سکتا ہے ۔ نیز یہ کہ خالق نے اپنا پسندیدہ طرز زندگی اسے بتانے کے لئے یہ انتظام کیا کہ خود بنی نوع انسان میں سے ہی کسی ایک فرد کو چن کر اسے براہِ راست اپنی ہدایت اور نگرانی سے نوازا اور پھر دوسرے انسانوں کو کہا کہ یہ میرا نمائندہ ہے اور تمہارے لئے ایک عملی نمونہ ہے ، اگر میری اور میرے احکام کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرنا چاہتے ہو تو اس کی اطاعت کرو ۔

اب جو آدمی اس فلسفۂ تسلیم و رضا کو مان لے اور اپنی مرضی کو ، بغیر کسی جبر کے اور اپنے خود مختار ارادے سے ، اللہ رب العالمین کی مرضی کے تابع کر دے اور اس کے رسول کو اس کا نمائندہ مان کر اس کا مطیع بننا قبول کر لے تو اس کے لئے زندگی گزارنے کے قواعد و ضوابط (قانون) خدا اور رسول ہی بنائیں گے وہ خود تو نہیں بنائے گا ۔ ہاں اسے یہ آزادی ضرور حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اس نقطۂ نظر کا انکار کر دے اور خدا اور رسول کے وجود سے انکار کر کے اپنی زندگی

اپنی خواہشوں کے مطابق بسر کرے لیکن یہ ایک انتہائی غیر منطقی بات ہوگی اگر وہ حاکم و رب تو مانے خدا کو، مطاع تو مانے اس کے رسول کو لیکن ان کی اطاعت نہ کرے اور زندگی گزارے اپنی مرضی سے، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ نہ تو اس خدا و رسول کے ساتھ مخلص ہے جن کی اطاعت کا اس نے دم بھرا اور نہ ہی وہ اپنی ذات کے ساتھ مخلص ہے کہ وہ ایک چیز بقائمی ہوش و ہواس صحیح مانتا تو ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتا، نفاق کا یہ رویہ کفر سے بدتر ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ "منافقین قیامت کے روز درکِ اسفل میں ہوں گے" (۲۵) اور ان کو سخت ترین عذاب دیا جائے گا (۲۶)

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں ایک اور حقیقت کا ادراک بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ آج سے چودہ سو سال پیشتر جب اللہ تعالیٰ نے اپنا نمائندہ بھیجا تو یہ اعلان کر دیا کہ یہ میرا آخری نمائندہ ہے (۲۷) اب اس کے بعد کوئی اور نمائندہ نہیں آئے گا، اس اعلان کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اس کے ساتھ دو اور اعلان بھی کئے جاتے۔ ایک یہ کہ یہ نمائندہ اور اس کی تعلیمات کسی خاص قوم، ملک اور علاقے کے لئے نہیں بلکہ سارے انسانوں کے لئے ہیں (۲۸) ان کے لئے بھی جو آج موجود ہیں اور ان کے لئے بھی جو رہتی دنیا تک آئیں گے۔ اور دوسرے یہ کہ اس کی (پیش کردہ) تعلیمات (کا ڈھانچہ اس طریقے سے مکمل کیا گیا ہے (۲۹) کہ وہ) آنے والے سارے زمانوں کے لئے بھی قابلِ عمل ہیں۔ خود قرآن نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ پہلے زمانے کی شریعتیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ Up-date ہوتی رہی ہیں اور سارے رسول ایک ہی شریعت لے کر نہیں آئے تھے (۳۰)۔ پہلی شریعتیں ایک دوسرے سے کیسے مختلف تھیں اور کیوں کر مختلف تھیں؟ یہ رب العالمین ہی بہتر جانتے ہیں کیونکہ وہی ہیں جنہوں نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے اعمال پر بھی ان کی نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ انسان کائنات میں کیا تصرف کر رہا ہے، تمدن کو کیا رنگ دے رہا ہے، کن تہذیبی رویوں کو اپنا رہا ہے، اپنے لئے کون سی دینی، روحانی، عقلی، جسمانی اور نفسیاتی مشکلات کھڑی کر رہا ہے اور اس کا حل کیا ہے، ان معاملات میں انسان کن مراحل سے گزرا ہے اور کس مرحلے پر اسے کس قسم کی عملی رہنمائی کی ضرورت ہے یہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی بہتر جانتی ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے، اب اپنی مشیت کے مطابق (اور یقیناً انسانی احتیاجات کے مطابق) جب اسی نے یہ فیصلہ کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی جانی والی شریعت آخری شریعت ہے اور کوئی نیا نبی نہیں آئے گا جو آکر نئی شریعت لائے گا یا اس شریعت کی تکمیل کرے گا تو اس نے بنی نوع انسان کو ایک ایسی شریعت دی جو ہر زمانے اور ہر سوسائٹی کی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ یہاں قانون سے متعلق لوگوں کے ذہن میں ایک سوال لازمی طور پر

پیدا ہو گا اور وہ یہ کہ ان کا روز مرّہ کا مشاہدہ ہے کہ چند سال پہلے جو قانون بنایا گیا تھا وہ اب ناکارہ (Obsolete) ہو گیا ہے اور جو آج بنایا جا رہا ہے چند سال بعد اس میں ترمیم کی ضرورت پڑ سکتی ہے ۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شریعت (مجموعہ ہائے ضوابط و قوانین) بنا کر دے دی جائے اور وہ ہزاروں سالوں تک اور ہر قسم کی سوسائٹی میں قابلِ عمل رہے ؟ بظاہر سوال بڑا منطقی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس اشکال کا جو جواب دیا ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر منطقی ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تفصیلی ، قطعی اور ناقابلِ تغیر احکام صرف دو طرح کے معاملات میں دیئے ہیں ایک تو وہ معاملات جن کے بارے میں انسانی عقل اپنے محدود دائرہ کار کی وجہ سے حکم نہیں لگا سکتی اور اگر لگانے کی کوشش کرے تو ٹھیک نتیجے پر پہنچنے کی کوئی گارنٹی نہیں، مثلاً عبادات کہ نماز کیسے پڑھی جائے ؟ کب پڑھی جائے ؟ کتنے رکعت پڑھی جائے ؟ روزے کب رکھے جائیں ؟ کتنے رکھے جائیں ان کے امساک و افطار کے اوقات کیا ہوں ؟ وغیرہ ، ان معاملات میں صرف عقلِ عام (Common Sense) کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ۔ اللہ تعالیٰ نے کمال نوازش سے ان معاملات کی تفاصیل ہمارے لئے بیان فرما دیں ۔

دوسرے وہ انتہائی اہم معاملات جن کے بغیر کسی سوسائٹی کا ڈھانچہ بھلائی اور خیر پر قائم ہی نہیں رہ سکتا یعنی ایمان ، جان ، مال ، نسل اور عقل کے تحفظ کا انتظام (حدود اللہ) ۔

ان دو صورتوں کے علاوہ وہ معاملات جو کائنات میں انسان کے تصرف اور اس کی تمدنی ترقی یا وقت اور مقام کے بدلنے کی وجہ سے اس کی رہنے سہنے کی عادات اور ضروریات سے تعلق رکھتے ہیں ان میں اس ذاتِ حکیم نے قطعی اور تفصیلی احکام دینے کی بجائے صرف بنیادی اصول دینے پر اکتفا کیا اور پھر یہ امت کے صاحبِ علم لوگوں پر چھوڑ دیا کہ وہ نصوص کی روشنی میں اور اس کے بتائے ہوئے قواعد کے مطابق اور اس کی روح اور مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی تفصیلات طے کر لیں ۔ یہ وہ طریقِ کار ہے جسے اجتہاد کہا جاتا ہے اور جو علماء و فقہاء اس ذمہ داری کو نباہتے ہیں ، انہیں مجتہد کہا جاتا ہے ۔ اس طرح خود شریعت کی اجازت اور اس کی روح اور اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق جو تفصیلات یہ مجتہدین طے کرتے ہیں وہ اگرچہ شریعت نہیں ہوتیں ، منزل من اللہ نہیں ہوتیں کیونکہ ان کے طے کرنے میں انسانی عقل و فہم کا استعمال ہوتا ہے لیکن وہ شریعت کے خلاف بھی نہیں ہوتیں بلکہ اسی کے ماتحت اور اسی کے مطابق ہوتی ہیں۔ ان اجتہادی احکام کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ وحی پر مبنی نصوص کی تعداد محدود ہے جب کہ انسانی تمدن کی بوقلمونیوں اور اس کے وسعتِ ادراک و اعمال کی کوئی حد نہیں ، جزئیات کا کوئی شمار نہیں ۔ اگر ہم چودہ سو سال کے دینی لٹریچر پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ سارے

اسلامی علوم پر جو کچھ لکھا گیا ہے اگر اسے جمع کر لیا جائے تو بھی ان کا حجم فقہی تالیفات کے برابر نہیں بنتا اس لئے کہ فقہ کا تعلق عملی زندگی سے ہے اور عملی زندگی کا تعلق ان جزئیات سے ہے جو بے حد وحساب ہیں، مثال کے طور پر اسلام نے شوریٰ کا حکم دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا :۔

۱ ﴿۰۰۰۰ وشاورهم فی الأمر﴾ (۳۱)

۲ ﴿۰۰۰۰ وامرهم شوری بینهم﴾ (۳۲)

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہ تھا کہ آپؐ ہر چھوٹی بڑی بات میں صحابہ سے مشاورت کرتے تھے خواہ جنگ کا موقع ہو یا امن کا یہاں تک کہ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا "مارأیت احدا أکثر مشوره لاصحابه من رسول الله صلی الله علیه وسلم" (۳۳) یعنی میں نے نبی کریمؐ سے بڑھ کر کسی کو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے والا نہیں پایا۔

لیکن ظاہر ہے کہ قرآنی آیات واحادیث مبارکہ سے شوریٰ کے بارے میں پوری تفصیلات مہیا نہیں ہوتیں جن کی آج کے زمانے میں ضرورت ہے مثلاً شوریٰ کے ممبر کتنے ہوں؟ وہ کیسے منتخب کئے جائیں؟ ان کی اہلیت کی تفصیلی شرائط کیا ہوں؟ شوریٰ اور امیر کے درمیان اقتدار کی نسبت کیا ہو؟ کیا شوریٰ میں فیصلے کثرت رائے سے ہوں؟ شوریٰ کے ادارے کا نام کیا ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن کے بارے میں تفصیلی ہدایات ہمیں قرآن وحدیث سے نہیں ملتیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ نعوذ باللہ خدا اور اس کے رسول سے بھول ہو گئی ہے یا یہ کسی کمزوری کے سبب ہوا ہے بلکہ ایسا شارع نے عمداً کیا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ نے تمہارے ذمے بعض فرائض لگائے ہیں، انہیں ضائع مت کرو، بعض حدود کا تعین کیا ہے ان سے تجاوز مت کرو بعض چیزوں کو حرام کیا ہے انہیں حلال نہ ٹھہرالو، بعض چیزوں کو حلال ٹھہرایا ہے انہیں حرام نہ قرار دے لو اور بعض امور میں خاموشی اختیار کی ہے، تم پر رحمت کی خاطر، بغیر بھولے ہوئے، ان کا کھوج لگانے کی کوشش نہ کرو" (۳۴)۔

اب فرض کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اگر شوریٰ کے انتخاب کا ایک طریقہ مقرر فرما دیتے اور وقت گزرنے کے ساتھ وہ طریقہ موزوں نہ رہتا تو پھر کیا ہوتا؟ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شارع نے جن معاملات میں تفصیلی احکام نہیں دیئے وہ عمداً نہیں دیئے کیوں کہ اس میں ہماری بھلائی ہے، شارع ہمیں تنگی سے بچانا چاہتے ہیں اور ہمارے لئے ایسے اصول وضع کرنا چاہتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے قابلِ عمل ہوں اور اس کے لئے وہی طریقہ مثالی تھا جو اس نے اختیار کیا۔

تو ہم ذکر یہ کر رہے تھے کہ شریعت اسلامی نے اس معجزے کو کس طرح ممکن کر دکھایا کہ اس

کے قوانین محدود تعداد میں ہونے کے باوجود لاتعداد مسائل کو حل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں ۔ اس کی ایک صورت تو ابھی ہم نے بیان کر دی ۔ اس کو ایک دوسرے طریقے سے اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ اگرچہ انسانی افعال و اعمال کی تعداد اتنی ہے کہ ہر ایک کے لئے الگ قانون بنانا مشکل ہی نہیں عملاً ناممکن بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ فہم ہے کہ انسانی افعال کو کیفیت اور نوعیت کے لحاظ سے باہم مشابہ مجموعوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً گرامر کا ایک قاعدہ ہوتا ہے لیکن اس کا اطلاق ہر متعلقہ مقام پر ہوتا ہے(۳۵) اسی طرح اگر کسی معاملے میں ایک اصولی حکم اللہ تعالیٰ یا نبی کریمؐ بیان فرما دیں تو اس سے ملتے جلتے سارے معاملات میں (جہاں علت وہی ہو) وہی حکم لاگو کیا جا سکتا ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اصول فقہ کے قاعدے "قیاس" کی بہت زیادہ اہمیت ہے اور شرعی اجتہاد میں اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ امام شافعیؒ اسے اجتہاد کے مترادف کے طور پر استعمال کرتے ہیں ۔

اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اسلامی قانون میں ثبات کا یہ پہلو کمزوری نہیں بلکہ ایک بہت بڑی خوبی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اس کا اندازہ ان لوگوں کے حالات سے کیا جا سکتا ہے جو اس نعمت سے محروم ہیں ، ایک بڑے امریکی قانون دان نے قانونِ اسلامی کی اس عظمت کا اعتراف کیا ہے(۳٦) مغربی نظامِ حیات اس نعمت سے محروم ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں زندگی کی کوئی قدر مستحکم نہیں رہی ، شراب کو کبھی جائز قرار دیا جاتا ہے اور کبھی ناجائز ، برطانیہ نے ہم جنس پرستی کی اجازت کے لئے باقاعدہ قانون بنایا ہوا ہے ، سزائے موت بعض ملکوں میں دی جاتی ہے بعض میں نہیں یعنی معاشرہ جس چیز کو چاہے حلال قرار دے لے اور جس کو چاہے حرام قرار دے لے اور جی چاہے تو چند سال بعد اپنے پچھلے فیصلے کو بدل دے ، نتیجہ یہ ہے کہ مغربی ممالک (اپنی سائنسی ترقی کے علی الرغم) معاشرتی انارکی ، کثرتِ جرائم اور اخلاقی کج روی کے ہاتھوں زوال کی دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں اور یہی بیماریاں غالب آکر ان کی تہذیب کو ایک دن نیست و نابود کر دیں گی ۔ لہٰذا بعض امور میں شارع نے ہمیں جو ناقابلِ تغیر احکام دیئے ہیں تو یہ ہماری ضرورت اور مصلحت کے عین مطابق ہیں ، ان احکام نے معاشرے کا روحانی ڈھانچہ ہی برقرار نہیں رکھا بلکہ ہماری بنیادی مادی احتیاجات کی ضمانت دے کر اور اخلاقی قدروں کو تحفظ دے کر ایک ایسے معاشرہ کے قیام میں ہماری رہنمائی فرمائی ہے کہ اگر ہم اخلاص سے احکامِ الٰہی کی پیروی کریں تو (انشاء اللہ) دین و دنیا دونوں میں کامیابی ہمارے قدم چوم سکتی ہے ۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے ہمیں ایک مکمل قانونی نظام تو دیا ہے اور یہ نظام اپنی اصل میں خدائی

نظام ہی ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اسلامی قانون ایک جامد قانون ہے جو زمانے کی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتا یا اس میں انسانی عقل کا کوئی دائرۂ کار نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس اس میں انسانی عقل و تدبّر کا دائرۂ عمل خاصا وسیع ہے جو اجتہاد کہلاتا ہے ۔ لیکن یہ کام بہرحال مغرب کی خود مختار قانون سازی سے میل نہیں کھاتا بلکہ ان حدود کے اندر رہ کر ہی انجام پاتا ہے جن کی نشاندہی ان نصوص سے ہوتی ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے ناقابلِ تغیر بنایا ہے ۔

حواشی

۱ ۔ وہ اصول وضوابط جو مذہب کے نام پر اہل چرچ نے بنا رکھے تھے ملاحظہ ہو ۔
L.B. Cerzon, A Dictionary of Law P-45
McDonald and Evans, 1979

۲ ۔ الرازی ، مختار الصحاح ، ص ۵۵۳
المنجد ، ۲۲ واں ایڈیشن ، ص ۶۵۶

۳ ۔ الماوردی ، الاحکام السلطانیہ ، ص ۲۴۱

۴ ۔ بدایۃ المجتہد ، ج ۲ ۔ ص ۱۳۱

۵۔ ابن تیمیہ مجموع فتاوی ، الطبعۃ الاولی ، ج ۵ ، ص ۳۴۱

۶ ۔ د/ سمیر عبد اللہ تناغو ، النظریۃ العامۃ للقانون ، ص ۷ ، منشأۃ المعارف بالاسکندریہ ، مصر

۷ ۔ مولانا مودودی نے "قانون" کو انہی معنوں میں لیا ہے ۔ ملاحظہ ہو اسلامی ریاست ، ص ۴۴۶، طبع ۱۹۷۹ء ، لاہور

۸ ۔ الرازی ، مختار الصحاح ، ص ۵۰۹

۹ ۔ الراغب اصفہانی ، المفردات ص ۳۸۴ طبع ۱۴ ، اصح المطابع ، کراچی

۱۰ ۔ ہود ۔ ۹۱

۱۱ ۔ التوبۃ ۔ ۱۲۲

۱۲ ۔ رواہ احمد والترمذی

۱۳ ۔ محمد مصطفی شلبی ، المدخل فی التعریف بالفقہ الاسلامی ، ص ۳۲ دار النہضۃ العربیۃ بیروت ۱۹۶۹ء

۱۴ ۔ ابن منظور، لسان العرب ج ۱۰ ص ۱۴۵ المطبع الامیریۃ بیولاق ۱۳۰۱ھ
فیروز آبادی ، قاموس المحیط ج ۳ ص ۴۴ المطبعۃ الحسینیہ بالقاہرہ ۱۳۳۵

۱۵۔ محمود شلتوت ، الاسلام عقیدہ وشریعہ ، ص ۹ طبع دار الشروق

۱۶ ۔ وما ارسلنا من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الہ الا انا فاعبدون (الانبیاء ۲۵)

۱۷ ۔ المائدہ ۔ ۴۸ ۔ مفسرین کی ایک بڑی تعداد نے اس آیت کی تفسیر میں یہی موقف اختیار کیا ہے کہ مختلف رسولوں کی شریعتیں ایک دوسرے سے مختلف رہی ہیں اگرچہ ان ادیان کے عقائد میں کوئی فرق نہیں ملاحظہ ہو بطور مثال :
— تفسیر قرطبی ج ۶ ص ۲۱۱ ، طبع دار الکاتب العربی، القاہرہ ۱۳۸۷ھ

— الرازی ، التفسیر الکبیر ج ۱۲ ص ۲ ، المطبعہ البھیہ المصریہ ۱۳۵۷ھ
— تفسیر المنار ص ۴۱۳ ، مطبعہ المنار ، مصر

۱۸ ۔ آمدی ، الاحکام ج ۱ ص ۱۳۵ ، دارالکتب العلمیہ ، بیروت
الشوکانی ، ارشاد الفحول ص ۶ ، طبع دارالمعرفہ ، بیروت

۱۹ ۔ الغزالی ، المستصفی ج ۱ ص ۸ ، طبع دارالصادر

۲۰ ۔ آمدی ، الاحکام ، ج ۱ ص ۱۱۳

۲۱ ۔ Dr. Riazul Hassan Gilani, The Reconstruction of Legal Thought in Islam, P-17

۲۲ ۔ Ibid-, P-20

۲۳ ۔ سعودی حکومت آرڈی ننس نمبر ۳۲۸ ، بتاریخ ۱۳۹۶ ۔ ۳ ۔ ۱ھ

۲۴ ۔ دیکھئے تفصیلات کے لئے "ڈاکٹر محمد عبد الجواد ، التطور التشریعی فی المملکۃ العربیہ السعودیہ ، ص ۳۵ ، طبع منشاۃ المعارف بالاسکندریہ ، مصر ۔

۲۵ ۔ ﴿إن المنافقين فى الدرك الاسفل من النار . . . ﴾ النساء ۔ ۱۴۵

۲۶ ۔ ﴿وعد الله المنافقين والمنافقات والكفار نار جهنم خالدين فيها هى حسبهم ، و لعنهم الله ولهم عذاب مقيم﴾ التوبه ۔ ۶۸

۲۷ ۔ ﴿ما كان محمد ابا احد من رجالكم ولكن رسول الله وخاتم النبيين ۰۰۰﴾ الاحزاب ۔ ۴۰

۲۸ ۔ ﴿قل يا ايها الناس انى رسول الله اليكم جميعا ۔۔﴾ الاعراف ۔ ۵۸

۲۹ ۔ ﴿اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتى ۰۰۰﴾ المائده ۔ ۳

۳۰ ۔ ﴿ما فرطنا فى الكتاب من شئ ۰۰۰﴾ الانعام ۔ ۳۸

۳۱ ۔ ﴿لكل جعلنا منكم شرعة و منهاجا ۰۰۰﴾ المائده ۔ ۴۸

۳۲ ۔ ﴿۰۰ وشاورهم فى الامر ۰﴾ آل عمران ۔ ۱۵۹
﴿۰۰ وامرهم شورى بينهم ۰۰۰﴾ الشورى ۔ ۳۸

۳۳ ۔ رواہ الترمذی فی سننہ فی باب ماجاء فی المشاورۃ

۳۴ ۔ رواہ احمد و نسائی

۳۵ ۔ شاہ ولی اللہ الدہلوی ، حجۃ اللہ البالغہ ، عربی ایڈیشن ج ۱ ص ۹۳ طبع دارالتراث ، القاہرہ

۳۶ ۔ See Preface of "Law in the Middle East by Jackson

باب دوم

اسلامی قانون کے مآخذ

جس طرح 'قانون' یا 'اسلامی قانون' کی اصطلاح اپنے موجودہ معنوں میں ماضی میں اسلامی فقہ میں مروج نہیں تھی اس طرح قانون کے "مآخذ" یا "مصادر" کی اصطلاح بھی ہم کتبِ فقہ میں کہیں نہیں پاتے کہ اسلامی قانون کے مآخذ یا مصادر یہ ہیں اور یہ نہیں ہیں ، اس کی بجائے جو اصطلاح ہمیں کتبِ اصول فقہ میں ملتی ہے وہ "ادلۃ الاحکام" کی ہے ۔ "احکام" کے بارے میں ہم ابھی کچھ کہہ چکے ہیں اور "ادلہ" جمع ہے دلیل کی اور عربی میں دلیل کا مطلب ہے "دلیل و حجت" جس سے رشد و ہدایت ملے نیز رہنما اور مرشد کو بھی دلیل ہی کہتے ہیں (۱) ۔ گویا ادلہ الاحکام کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ذرائع جن کی مدد سے احکام کو جانا جاسکے ، ان تک رسائی ہو سکے ۔ اب یہ کوئی اتفاق کی بات نہیں ہے کہ اصولیوں نے "قانون کے مآخذ" کی بجائے "ادلہ الاحکام" کی اصطلاح استعمال کی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ "ادلہ الاحکام" کی اصطلاح فقہ اسلامی کے لئے زیادہ موزوں تھی کیونکہ ادلہ الاحکام میں اہلِ اصول قرآن و سنت کے علاوہ قیاس و اجماع اور اجتہاد و استنباط جیسے دوسرے وسائل کا بھی ذکر کرتے ہیں ۔

اب جہاں تک احکام منصوصہ کا تعلق ہے تو ان کا اثبات صرف قرآن و سنّت سے ہو سکتا ہے اور وہی اس کا مصدر ہیں لیکن جہاں تک احکام اجتہادیہ کا تعلق ہے ان کا اثبات قرآن و سنّت کے ساتھ قیاس و اجماع اور استحسان و مصالح مرسلہ وغیرہ سے بھی ہوتا ہے ، گویا آخر الذکر کو احکامِ اجتہادیہ کا مصدر تو کہا جاسکتا ہے احکامِ منصوصہ کا نہیں ۔ لیکن اگر احکام کی تقسیم منصوصہ اور غیر منصوصہ (یا اجتہادیہ) میں نہ کی جائے بلکہ دونوں طرح کے احکام کے لئے ایک ہی لفظ "احکام" استعمال کیا جائے تو منصوص اور غیر منصوص ادلہ کو علی الاطلاق ان کا مصدر نہیں قرار دیا جاسکتا البتہ دلیل قرار دیا جاسکتا ہے اس لئے اصولیوں نے ان کے لئے مآخذ اور مصدر کی بجائے ادلہ اور امارات کا لفظ استعمال کیا ہے ۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ اگرچہ علماء نے مصادر اور مآخذ کی اصطلاح کبھی استعمال نہیں کی تاہم وہ ادلہ کے مراتب میں فرق کرتے رہے ہیں ۔ بعض نے ادلہ کو "اصلیہ" اور "تبعیہ" میں

تقسیم کیا ہے (۲) اصلیہ سے مراد قرآن و سنّت اور تبعیہ سے مراد اجماع و قیاس و استحسان وغیرہ ہے ۔ بعض نے انہیں "نقلیہ" اور "عقلیہ" میں تقسیم کیا ہے (۳) ۔ نقلیہ سے مراد ہیں وہ ادلہ جو نقل سے ثابت ہوں اور ان کے وجود میں آنے کا سبب اجتہاد نہ ہو اور عقلیہ سے مراد وہ ادلہ ہیں جو مجتہدین کی کاوشوں سے وجود میں آتی ہیں جیسے قیاس ، استحسان اور استصلاح وغیرہ ۔ بعض علماء نے ادلۃ الاحکام کو "متفق علیہ" اور "مختلف فیہ" میں بھی تقسیم کیا ہے(۴) جن ادلہ پر جمہور اہل سنت کا اتفاق ہے وہ چار ہیں ۔ یعنی قرآن و سنت اور اجماع و قیاس ، ان کے علاوہ جو ادلہ ہیں وہ مختلف فیہ ہیں کیونکہ ان پر اہل سنت کے چار آئمہ کا بھی اتفاق نہیں ہے ۔ بعض انہیں قبول کرتے ہیں اور بعض نہیں ۔ لیکن جس طرح ہم نے "اسلامی قانون" کی اصطلاح کو معروف عام ہونے کی وجہ سے قبول کر لیا ہے اسی طرح اگر ہم "اسلامی قانون کے مآخذ" کی اصطلاح بھی استعمال کرنا چاہیں تو ہمیں اس کا مفہوم بھی انہیں خطوط پر واضح کرنا ہو گا جن پر ہم نے "اسلامی قانون" کی تعریف کی تھی ۔ ہم نے کہا تھا کہ اسلامی قانون دو طرح کے قوانین کا مجموعہ ہے ایک وہ قوانین جو براہِ راست وحی پر مبنی ہیں اور دوسرے وہ جو قرآن و سنت کی روشنی میں اور اس کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق مستنبط کئے گئے ہیں ۔ اب جہاں تک احکام منصوصہ کے مصادر کا تعلق ہے تو ان کا مصدر صرف ایک ہی ہے یعنی وحی اور جہاں تک اجتہادی احکام کا تعلق ہے تو ان کے مصادر دو ہیں ایک وحی اور دوسرے اجتہاد ۔ (بلکہ دقّتِ نظر سے دیکھا جائے تو ان احکامِ اجتہادیہ کا حقیقی مصدر بھی صرف وحی ہی ہے کیونکہ خود اجتہاد کی سند بھی وحی ہے اور اجتہاد میں کسی مبنی بر نص حکم کی مخالفت بھی نہیں کی جا سکتی) ، ہماری اس رائے کی تائید امام شافعیؒ کے قول سے بھی ہوتی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ "ادلہ شرعیہ دو قسم کی ہیں ایک جن کا تعلق محض نقل سے ہے اور دوسری وہ جن کا تعلق محض رائے سے ہے ۔ پہلی قسم کتاب و سنّت پر مشتمل ہے اور دوسری قیاس و استدلال پر لیکن در حقیقت ادلہ شرعیہ کتاب و سنّت ہی ہیں کیونکہ قیاس و اجتہاد صرف عقل سے ثابت نہیں ہوتے بلکہ قرآن و سنّت سے ثابت ہوتے ہیں اور یہی ان پر اعتماد کرنے کی وجہ ہے ۔" ہم ان مآخذ اور ان سے متعلق مباحث کا ذکر ، ان کی اہمیت کے پیش نظر ذرا تفصیل سے کریں گے ۔

احکامِ منصوصہ کا مصدرِ وحید ۔ وحی

ہم نے قرآن و سنّت کی بجائے وحی کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ درحقیقت قرآن و سنّت دونوں کا منبع وحی ہے اور وحی اس پیغام کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ اس آدمی تک پہنچاتے ہیں جسے انہوں نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے بطور نمونہ چنا ہوتا ہے ۔

نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی اتری وہ دو طرح کی ہے ایک جو بعینہ ان الفاظ پر مشتمل ہے جن کو اللہ کا فرشتہ (۶) نبی اکرمؐ تک پہنچاتا تھا اور جس کی تلاوت کارِ ثواب ہے اور جسے ہم قرآن حکیم کہتے ہیں ۔

قرآن میں قانونی احکام کا اسلوب

قرآن اصطلاحی معنوں میں کوئی قانون کی کتاب نہیں ہے کہ اس میں احکام کو ترتیب کے ساتھ دفعہ وار بیان کیا گیا ہو بلکہ یہ تو کتابِ ہدایت ہے جو اس حقیقت سے بحث کرتی ہے کہ انسان کی فلاح و نکبت کس امر میں ہے ، اس کے لئے زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ کیا ہے ۔ ایک ایسا طریقہ جو مالکِ حقیقی کی رضا کے عین مطابق بھی ہو اور جو انسان کو موجودہ زندگی اور آنے والی زندگی دونوں میں کامیابی سے ہمکنار بھی کرے ۔ نہ ہی قرآن اس طرح کی تصنیف ہے جس کے ہم عادی ہیں کہ مصنف نے ایک ترتیب اور تنظیم کے ساتھ مختلف موضوعات کا احاطہ کیا ہو بلکہ یہ تو ان خطبوں پر مشتمل ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رہنمائی کے لیے وقتاً فوقتاً نازل فرمایا کرتے تھے تاکہ اس ہمہ گیر انقلاب کی صورت گری منشاء الہی کے مطابق ہو جس کو برپا کرنے پر حضورؐ مامور تھے چنانچہ اس ضمن میں قانونی احکامات بھی آئے ہیں جو مختلف خطبوں میں منتشر ہیں ، حسبِ موقع ان کے بیان میں کہیں اختصار سے کام لیا گیا ہے اور کہیں انہیں وضاحت سے پیش کیا گیا ہے ۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ تفصیلی احکامات وہ ہیں جو اکثر تعبدی ہیں یعنی عبادات وغیرہ پر مشتمل ہیں ، عملی زندگی کے معاملات میں قرآن نے تفصیل صرف وہاں دی ہے جہاں آدمی کے لئے خود تفصیل میں جانا ممکن نہیں ہے ۔ جہاں ایسی ضرورت نہ تھی وہاں قرآن نے بنیادی اور اصولی ہدایات دینے پر اکتفا کیا ہے اور تفصیلات سے گریز کیا ہے کیونکہ یہی تدبیر اور حکمت کا تقاضا تھا ۔

قرآن میں قانونی احکام کا تنوع

اگر ہم قانون کی ان انواع کو ذہن میں رکھیں جو آج کل مستعمل ہیں تو کہا جاسکتا ہے کہ قرآنی احکام عملاً مندرجہ ذیل اقسام کے احکام پر مبنی ہیں :

۱ ۔ پرسنل لاء : جن کا تعلق شادی بیاہ ، نکاح ، طلاق ، وراثت وغیرہ خانگی امور سے ہے اس قسم کی آیات قرآن مجید میں اندازاً ۷۰ کے قریب ہیں ۔

۲ ۔ سول لاء (احکام مدنیہ) : یعنی وہ احکام جن کا تعلق خرید و فروخت ، باہمی لین دین اور معاہدوں سے ہے ، ان سے متعلق آیات بھی تقریباً ۷۰ ہیں ۔

۳ ۔ کریمنل لاء (فوجداری قانون) : یہ وہ احکام ہیں جن کا تعلق جرم اور اس کی سزا سے ہے اور جن کا مقصد لوگوں کی جان و مال اور عزت کی حفاظت ہے ، اس سے متعلق آیات اندازاً ۳۰ ہیں ۔

۴ ۔ پروسیجرل لاء : یہ وہ احکام ہیں جن کا تعلق قضائے شہادت اور حلف وغیرہ سے ہے کہ عدل گستری کا کام کیسے ہو ۔ ان امور سے متعلق اندازاً ۱۳ آیات قرآن مجید میں موجود ہیں ۔

۵ ۔ دستوری احکام : جن کا تعلق نظامِ حکومت اور اس کی مختلف تفصیلات سے ہے اس طرح کی آیات قرآن حکیم میں تقریباً ۱۰ ہیں ۔

۶ ۔ مالی احکام : جن کا تعلق مالی اور اقتصادی معاملات سے ہے مثلاً ذرائع آمدنی اور مدّات خرچ کی تفاصیل ، توزیع دولت کا نظام وغیرہ ، ایسی آیات بھی اندازاً ۱۰ ہیں ۔

۷ ۔ بین الاقوامی قانون : وہ احکام جن کا تعلق افراد اور اسلامی ریاست کے درمیان نیز اسلامی ریاست اور دوسری ریاستوں کے تعلقات کی مختلف تفاصیل سے ہے ، اس طرح کی آیات قرآن مجید میں تقریباً ۲۵ ہیں ۔

سنت

یہ بات امت محمدیہ میں متفق علیہ ہے کہ قرآن حکیم کے ساتھ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی اسلامی قانون کا ایک بنیادی مصدر ہے اور اس بات سے اختلاف نہیں کیا سوائے ماضی میں معتزلہ کے چند غالی گروہوں نے اور موجودہ زمانے میں پاک

و ہند میں منکرین حدیث کے ایک گروہ یا دیگر اسلامی ممالک میں چند متفرق افراد نے ، اور جس طرح امت کی عظیم اکثریت ماضی میں حجّیتِ سنت کے منکر معتزلہ کے ان انتہا پسند گروہوں کی گمراہی پر متفق تھی اسی طرح آج بھی جمہور امت ایسے افراد اور گروہوں کی گمراہی پر متفق ہے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو حجّت نہ مانتے کیونکہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ :

- نبیؐ کریمؐ نے کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کہی

﴿وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی﴾ (۶) - عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ سے جو کچھ سنتا تھا لکھ لیتا تھا - لوگوں نے مجھے اس سے منع کیا اور کہا رسول اللہ ایک انسان ہیں ، کبھی رضا کی حالت میں بولتے ہیں اور کبھی غضب کی حالت میں ، تم سب کچھ لکھ ڈالتے ہو ؟ اس پر میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک حضورؐ سے پوچھ نہ لوں آپؐ کی کوئی بات نہ لکھوں گا - پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے پوچھا تو آپؐ نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "لکھو اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس منہ سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا" (۷) -

- نبی کا ہر قدم نہ صرف اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں اٹھتا ہے بلکہ خدا کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے گویا اسی کی طرف سے ہوتا ہے مثلاً بدر میں جب آپ نے کافروں کی طرف ریت مٹھی بھر کر پھینکی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "یہ تم نے نہیں بلکہ ہم نے پھینکی ہے" ﴿وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی﴾ (۸)

- رسول احکامِ خدا کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتا

"ولو تقول علینا بعض الاقاویل لاخذنا منہ بالیمین ثم لقطعنا منہ الوتین" (۹) - نیز فرمایا

﴿ما کان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتاب والحکم والنبوہ ثم یقول للناس کونوا عباداً لی من دون اللہ﴾ (۱۰)

- نبی بھیجا ہی اس لئے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے

﴿وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ﴾ (۱۱)

- اس کی اطاعت خدا کی اطاعت ہوتی ہے - ﴿من یطع الرسول فقد اطاع اللہ﴾ (۱۲) -

نیز فرمایا:
﴿ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ﴾ (۱۳)
۔ جو بلاحیل و حجّت اور پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ اس کی اطاعت نہ کرے وہ مسلمان ہی نہیں ہے
﴿فلا وربکّ لایومنون حتی یحکّموک فیما شجر بینھم ثم لایجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت ویسلّموا تسلیما﴾ (۱۴)۔ نیز فرمایا:
﴿وما کان لمؤمن ولا مومنة اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرة من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضلّ ضلالاً مبینا﴾ (۱۵)
۔ جو اس کے حضور گستاخی کرے، اس کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں
﴿یا ایھا الذین آمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجھروا لہ بالقول کجھر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لاتشعرون﴾ (۱۶)

اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور قرآن نے ایسے کتنے ہی شواہد کا پتہ چلتا ہے کہ آنحضورؐ کو قرآن کے علاوہ بھی خدا سے رہنمائی ملتی تھی (۱۷) اور اسی لئے نبی کریمؐ نے فرمایا کہ ہدایت کے لئے قرآن کے ساتھ ساتھ میرے فرمودات کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

«الا انی اوتیت القرآن و مثلہ معہ، الا یوشک رجل شبعان علی اریکتہ یقول علیکم بھذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ وما وجدتم فیہ من حرام فحرموہ، وان ما حرم رسول اللہ کما حرم اللہ الا لایحل لکم الحمار الاھلی، ولا کل ذی ناب من السباع» (۱۸)۔

"خبردار رہو، مجھے قرآن دیا گیا ہے اور کے ساتھ ویسی ہی ایک اور چیز بھی۔ خبردار ایسا نہ ہو کہ کوئی پیٹ بھرا شخص اپنی مسند پر بیٹھا ہوا یہ کہنے لگے کہ بس تم قرآن کی پیروی کرو، جو کچھ اس میں حلال پاؤ، اسے حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو حالانکہ جو کچھ اللہ کا رسول حرام قرار دے وہ ویسا ہی حرام ہے جیسے اللہ کا حرام کیا ہوا۔ خبردار تمہارے لئے پالتو گدھا حلال نہیں ہے اور نہ کوئی کچلیوں والا درندہ حلال ہے"۔ اسی لئے علماء قرآن کو "وحی جلی" یا "وحی متلو" (یعنی جس کی تلاوت کی جائے) اور سنّت کو "وحی خفی" یا وحی "غیر متلو" بھی کہتے ہیں۔

قرآن و سنّت کے نقلی دلائل کے ساتھ اگر ہم عقلی طور پر بھی تدبّر اور تفکّر سے کام لیں تو بھی اس نقطۂ نظر کی معقولیت اور اہمیت ثابت ہو جاتی ہے کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کی سکیم یہی ہوتی کہ رسولؐ کے بغیر لوگوں کو ہدایت دینی ہے تو پھر رسول بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی ؟ کتاب کا ایک ایک نسخہ سارے انسانوں کے پاس بھیج دیا جاتا لیکن ظاہر ہے کہ صرف کتاب بھیج دینے سے ہدایت کا پروسیس مکمل طور پر انجام نہیں پاسکتا ، یہی وجہ ہے کہ پیغمبر تو بغیر کتاب کے آتے رہے ہیں لیکن کتاب کبھی بغیر پیغمبر کے نازل نہیں ہوئی ۔ اللہ تعالیٰ انسان کی فطرت سے خوب واقف ہیں کہ ہدایت کا کوئی مجرد تصور اس معاملے میں عملاً اس وقت تک کارگر ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کہ عملی نمونہ انسان کے سامنے موجود نہ ہو چنانچہ انبیاء کو بھیجنے کا ایک بڑا سبب یہی ہوتا ہے کہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ انسانوں کے سامنے نمونے کا ایک انسان (Model) کھڑا کرتا ہے کہ دیکھو یہ ہے ایک ماڈل انسان تمہیں ایسا بننا ہے پھر یہ نبی اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خدا کی شریعت پر عمل کرکے انسانیت کو دکھا دیتا ہے کہ خدا کی ہدایت پر عمل کیسے کرنا ہے ۔ اب اگر اس پروسیس میں نبی کے ایک ماڈل ہونے کی حیثیت کی اور اسے غلطیوں سے بچا کر ہر وقت اس کے رویّوں کی صحت کی اگر اللہ تعالیٰ ضمانت نہ دیں یا اس کا انتظام نہ کریں تو ظاہر ہے نبوّت کا سارا انسٹی ٹیوشن ہی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ اگر اس طرح نمونے کا ایک انسان نبی نوع انسان کی رہنمائی کے لئے کھڑا کریں اور ان انسانوں کو جو ہدایت کے جویا ہوں اس نبی کی اطاعت کا لازمی حکم نہ دیں تو ہدایت کا یہ سارا پروسیس بیکار ہو کر رہ جائے گا لہٰذا نبوّت کے اس انسٹی ٹیوشن کا یہ اساسی تقاضا ہے کہ ہر نبی غلط رویوں سے محفوظ ہو اور اس پر ایمان لانے والے لوگوں کو حکم ہو کہ وہ ہر لحاظ سے اس نبی کی پیروی کریں ۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ان لوگوں کے رویے کا غلط ہونا نمایاں ہو جاتا ہے جو ایک نبی پر ایمان تو لائیں لیکن (اس پر نازل کی گئی کتاب کے علاوہ) اس کے رویّوں ، اس کے اسوہ، اس کی کہی ہوئی باتوں اور کئے ہوئے کاموں کو حجت اور من جانب اللہ نہ مانیں ۔

یہاں دو باتوں میں فرق کرنا ضروری ہے ایک ہے مطلق طور پر نبی کریمؐ کی سنّت (یعنی آپؐ کا قول ، فعل اور تقریر) کی حجیت کا انکار جو منافیٔ ایمان ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ کسی خاص خبر کے بارے میں یہ علمی استدلال کہ یہ کمزور ہے ، روایت کے لحاظ

سے یادرایت کے لحاظ سے اس دوسرے رویے کی گنجائش علمی طور پر موجود ہے اور علماء سلف و خلف سے ایسے اختلاف کی بیشمار نظیریں منقول ہیں ، لیکن اس علمی اختلاف کے مستحق وہی لوگ ہیں جو اس کے اہل ہیں ، جس طرح ایک پڑھے لکھے ادبیات کے پروفیسر کو مستند ڈاکٹر مان کر اس سے علاج نہیں کروایا جاتا اسی طرح ذخیرۂ حدیث کے بارے میں علمی اختلاف کا حق صرف انہیں کو ہو گا جو اس میدان کے مرد ہیں نہ کہ وہ لوگ جو عربی زبان سے نابلد ہوں ، علوم قرآن و سنّت سے بے خبر ہوں انہیں احادیث سے کھیلنے کی اجازت دے دی جائے گی ۔ خلاصہ یہ کہ علمی طور پر احادیث کے متون واسناد میں اختلاف کی گنجائش ایک حد تک موجود ہے لیکن ایک دفعہ یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ فلاں چیز سنّت ہے یا سنّت سے ثابت شدہ ہے پھر ایمان و عقل کی سلامتی کے ساتھ کسی مسلمان کے لئے اس کی حجیت سے انکار ناممکن ہے ۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی بے جا نہ ہو گا کہ اگرچہ امّت کے لئے رسول کی حیثیت ہمیشہ رسول اور نبی ہی کی ہوتی ہے اور یہی صفت رسول کی دوسری صفات پر غالب ہوتی ہے لیکن اس سے صرفِ نظر بہرحال نہیں کیا جاسکتا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) حاکم بھی تھے ، ممکن ہے کسی معاملہ میں کوئی حکم انہوں نے بحیثیت حاکم دیا ہو ۔ اور وہ قاضی بھی تھے اور ممکن ہے ان کے بعض احکام بحیثیت قاضی جاری ہوئے ہوں ، اسی طرح آپؐ ان ساری حیثیتوں کے ساتھ ساتھ ایک بشر اور انسان بھی تھے صحابہ کرام کو جہاں شبہ پڑتا تھا وہ آپؐ سے پوچھ لیتے تھے کہ آپؐ یہ حکم کس حیثیت میں دے رہے ہیں چنانچہ جنگِ بدر میں حباب بن منذرؓ نے پوچھا کہ آپؐ نے لشکر کو جہاں پڑاؤ کا حکم دیا ہے وہ وحی کی بناء پر ہے یا جنگی مصلحت کے طور پر آپؐ کی ذاتی رائے پر مبنی ہے ، جب آپؐ نے جواب دیا کہ ذاتی رائے پر مبنی ہے تو انہوں نے اس سے بہتر جگہ کی نشاندہی کی اور حضورؐ نے ان کا مشورہ قبول فرما لیا (۲۰) ۔ اسی طرح آپؐ نے حضرت بریرہؓ کو جو اپنے خاوند کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھیں یہ کہا کہ تم اس کے ساتھ گزارہ کرو ، انہوں نے کہا آپؐ حکم دیتے ہیں ؟ آپؐ نے جواب دیا حکم نہیں دیتا ، بطور سفارش کہہ رہا ہوں تو حضرت بریرہؓ نے کہا کہ وہ یہ مشورہ قبول نہیں کرسکتیں (۲۱) ۔

اسی طرح کھجوروں میں پیوند والا معاملہ ہے کہ انصار نے سمجھا کہ حضورؐ نے انہیں بحیثیت نبی یہ حکم دیا ہے کہ کھجوروں میں پیوند نہ لگاؤ لیکن جب پیوند نہ لگانے سے

کھجوروں کی پیداوار متاثر ہوئی اور معاملہ آپؐ کے علم میں آیا تو آپؐ نے فرمایا 'انما انا بشر اذا امرتکم بشئ من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشئ من رأيي فانما انا بشر' اور ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں 'انتم اعلم بامر دنیاکم' (۲۲) یعنی دینی رہنمائی کے لئے تو مجھ سے رجوع ضروری ہے لیکن جہاں تک مختلف دنیوی معاملات میں مہارت کا تعلق ہے تو اس میں متعلقہ شخص خود بہتر فیصلہ کرسکتا ہے۔ اب یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کیونکہ نبی ہر فن مولا نہیں ہوتا اور نہ یہ کمال نبوت کے لئے مستلزم ہے کہ نبی ماہر کسان بھی ہو، طبیب حاذق بھی ہو، بہترین تاجر بھی ہو، اچھا طباخ بھی ہو ۔ گویا وہ دنیا بھر کے کام جانتا ہو اور سارے حرفوں، پیشوں اور صنعتوں کا ماہر ہو، ظاہر ہے ان ساری تفصیلات کا اور اس طرح کے معاملات کا تعلق نبی کی نبوت سے نہیں ہے بلکہ بحیثیت انسان اس کی ذات سے ہے ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ احادیث میں مذکور آپؐ کے بعض فیصلوں سے نتائج کے استنباط میں فقہاء کے درمیان خاصے اختلافات واقع ہوئے ہیں کہ وہ آپؐ نے کس حیثیت سے کئے ، آیا بحیثیت نبی یا بطور حاکم و قاضی مثلاً بنجر زمینوں کی آبادکاری، جہاد میں مقتول کافر کے سامان کی ملکیت اور بیوی کو اس کے خاوند کے مال میں سے (بغیر اس کی اجازت کے) تصرف کا حق دینا وغیرہ (۲۳) ۔

لیکن ان واقعات سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہو گا کہ ہر عامی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس سنّت کا چاہے یہ کہہ کر انکار کردے کہ یہ تشریع عام نہیں ہے (یعنی سب لوگوں کے لئے ہمیشہ کے لئے واجب العمل نہیں ہے) بلکہ تشریع خاص ہے (یعنی صرف قاضی اور حاکم کی حیثیت سے متعلقہ افراد کے لئے یا کسی خاص زمان و مکان کے لئے ہے) اور نہ کسی گروہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس بنیاد پر حدیث کے سارے ذخیرے کو اٹھا کر پھینک دے اور یہ کہے کہ حضورؐ بھی اپنے زمانے کے مرکزِ ملّت تھے اور جس طرح آپؐ نے اپنے زمانے میں قانون سازی کا کام کیا تھا اسی طرح آج کے زمانے کا مرکزِ ملّت بھی دینی احکام کا تعین کرے گا ۔

سنّت اور قانون و دستور کی بحث میں بعض لوگ ایک اور غلطی کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے جو معاشرہ قائم کیا وہ گویا شریعت کی تطبیق کی ایک صورت تھی (۲۴) بالفاظ دیگر آپؐ نے شریعت کے مطابق احوال و واقعات کی جو صورت

گری کی وہ خود حجّت یا قانون و دستور کا کوئی مصدر و ماخذ نہیں ہے بلکہ صرف ایک نمونہ اور نظیر ہے کہ جب ہم بعد کے زمانوں میں شریعت کی تطبیق کی کوشش کریں تو نبی کریمؐ کی تطبیق شریعت کی پہلی کوشش کو بطورِ نمونہ سامنے رکھیں ۔ ہم اس نقطۂ نظر کا پہلے ابطال کر چکے ہیں لہذا دلائل کے دہرانے کی ضرورت نہیں ۔

تاہم یہ مدنظر رہے کہ جس طرح حضورؐ کے زمانے میں ہوتا رہا کہ لوگ خود فیصلہ نہیں کر لیتے تھے کہ آپؐ کی کونسی بات مبنی پر وحی ہے اور کون سی بات آپؐ کی ذاتی رائے پر مبنی ہے اور کونسا حکم تشریع خاص ہے اور کونسا حکم تشریع عام بلکہ یہ جاننے کے لئے وہ خود حضورؐ سے رجوع کرتے تھے، اسی طرح آج بھی اگر اہل علم کے سامنے یہ سوال پیدا ہو کہ آپؐ کا کوئی فرمان کس حیثیت کا حامل ہے وہ تشریع عام ہے یا تشریع خاص یا آپؐ نے بحیثیت نبی جاری کیا ہے یا بطور حاکمِ وقت یا بحیثیت قاضی ! تو ایسے معاملات میں حضورؐ ہی کی سنّت اور طریقے کو حتمی مرجع قرار دیا جانا چاہئے ، اور اپنی ذاتی پسند و ناپسند پر انحصار کرنے کی بجائے وہاں سے جو روشنی ملے اسی پر عمل کیا جانا چاہئے اس طرح یقیناً کوئی بڑا مسئلہ پیدا نہیں ہو گا اور اگر کوئی اختلافی صورت سامنے آئی بھی تو امت میں ایسے متقی علماء کی کمی نہیں جن پر عام مسلمان اعتماد کرتے ہیں ، ان کے متفقہ فیصلے پر عمل کر کے قابلِ اطمینان حل تلاش کیا جا سکتا ہے ۔ علمی اختلاف کی گنجائش موجود ہے لیکن بہر حال اس بنیاد پر سارے ذخیرۂ احادیث کا انکار کر کے صرف گمراہی ہی مول لی جا سکتی ہے ۔

سطورِ بالا سے یہ بھی واضح ہو گیا ہو گا کہ فقہی لحاظ سے حضورؐ صرف شارح اور مفسرِ قرآن ہی نہیں ہیں یعنی وہ صرف قرآنی قوانین کی تفسیر و تشریح و تطبیق ہی نہیں فرماتے بلکہ خود شارع یعنی قانون بنانے اور قانون دینے والے بھی ہیں اور یہ منصب انہیں کسی اور نے نہیں بلکہ خود حاکمِ مطلق (Sovereign) نے عطا کیا ہے۔ قرآن میں ہے ۔ ﴿ ---ویحل لھم الطیبات و یحرم علیھم الخبائث --- ﴾ الاعراف ـ ۱۵۷
وہ ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے ۔ اسی لئے فقہاء نے یہ کہا ہے کہ احادیث صحیحہ قرآن کے حکم "خاص" کو "عام" اور "عام" کو "خاص" قرار دے سکتی ہیں کہ دونوں کی اصل ایک ہے ۔

غرض اس میں کوئی شک نہیں اور امت کی عظیم اکثریت اس پر متفق ہے (اور یہی قرآن کے احکام کا اقتضاء بھی ہے) کہ نبی کریم کی سنت، اسلامی قانون و اجتہاد کا قرآن حکیم کے بعد ایک بنیادی ماخذ ہے جو مسلمانوں کے لئے حجت ہے اور اس سے کوئی انکار نہیں کرتا سوائے گمراہوں کے۔

اجتہاد

اسلام میں قانون سازی کا دوسرا مصدر اجتہاد ہے، اجتہاد عربی لفظ ہے جس کا مطلب ہے "کسی معاملے میں مقدور بھر جدوجہد کرنا" (۲۵) اور شرعی اصطلاح میں اس سے مراد یہ ہے "کہ اگر کسی معاملے میں شرعی حکم معلوم یا واضح نہ ہو تو شریعت کے حکم کے مطابق اور اس کی قائم کردہ حدود کے اندر کسی فقیہ کا اس حکم کو معلوم یا واضح کرنے کی مقدور بھر کوشش کرنا"۔

اجتہادی احکام اس لحاظ سے شریعت ہی کا ایک پرتو ہیں کہ ان کا دائرۂ کار وہی ہے جو شریعت نے ان کے لئے مقرر کیا ہے نیز یہ کہ وہ کسی طرح بھی شرعی قوانین و نصوص کی مخالفت میں نہیں جا سکتے لیکن اس لحاظ سے وہ وضعی احکام ہیں کہ بہر حال وہ انسانی غور وفکر ہی کی پیداوار ہیں، ان میں غلطی کا امکان بہر صورت موجود رہتا ہے اور انسانی دخل اندازی کی وجہ سے ان سے علمِ ظنی تو حاصل ہوتا ہے علمِ قطعی نہیں۔

یہاں ہم اجتہاد سے متعلق بعض ضروری مباحث، اس کی شرعی سند، دائرۂ کار، شرائط، وسائل اور اقسام وغیرہ پر مختصر طور پر روشنی ڈالیں گے۔

اجتہاد کی شرعی سند

اجتہاد کا شرعی حجت ہونا قرآن و سنت اور اجماع سے ثابت ہے نیز یہ اسلامی شریعت کے مزاج اور منہاج کا تقاضا بھی ہے۔

قرآن اور اجتہاد

قرآن مجید میں آتا ہے ﴿فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون﴾ یعنی "اہلِ ذکر سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے" اور یہاں ذکر سے مراد مجرد علم نہیں ہے بلکہ جیسا کہ بعض اہل علم

نے کہا ہے ، اس سے مقصود کتاب و سنت کا علم ہے ۔(۲۷)

گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے عامۃ الناس سے یہ فرما رہے ہیں کہ اگر تم کسی معاملے میں نہیں جانتے کہ وہاں خدا و رسول کا حکم و منشاء کیا ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لو جو کتاب و سنت کا علم رکھتے ہیں اور تمہاری رہنمائی کر سکتے ہیں ۔ اسی طرح قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ آتا ہے "ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم﴾ (۲۸) یعنی "جب کوئی اہم واقعہ پیش آ جائے تو مسلمانوں کو چاہئیے کہ اسے ایسے اولی الأمر کے پاس لے جائیں جن میں استنباط کی صلاحیت ہو" ۔ اکثر علماء کا کہنا ہے کہ اولی الامر صرف مسلمان حکمران اور سردار ہی نہیں ہیں بلکہ اولی الأمر کی تعریف میں علماء بھی شامل ہیں اور معاملہ اگرچہ براہِ راست فقہی اور اصطلاحی استنباط سے متعلق نہیں ہے لیکن فقہی استنباط بھی بہر حال اس میں شامل ہے اور مقصود اس آیت سے یہ ہے کہ جب بھی کوئی اہمیت کی بات ہو تو عام آدمی کو خود ہی کوئی فیصلہ کر لینے کی بجائے ان اصحاب امر و علم تک معاملہ لے جانا چاہئے جو اس کی اچھی طرح چھان پھٹک کر سکیں اور ہر قسم کی اونچ نیچ پر غور کر کے مناسب فیصلہ کر سکیں ۔

اسی طرح سورۃ توبہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وما کان المؤمنون لینفروا کافۃ فلو لا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون﴾ (۲۹) یعنی "یہ ضروری نہ تھا کہ اہلِ ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے بلکہ ہر (قوم اور) آبادی میں سے کچھ لوگ ایسے نکلنے چاہئیں تھے جو دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس آ کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے شاید کہ اس طرح وہ ڈرنے کا رویہ اختیار کرتے" یہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں ہر جگہ ایسے آدمی ہونے چاہئیں جو دینی علوم میں تخصص پیدا کریں اور عام مسلمانوں کے کام آئیں کیونکہ ہر آدمی کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ شریعت کا خصوصی (Specialized) علم حاصل کر سکے ۔

سنت اور اجتہاد

جیسا کہ پچھلے باب میں آ چکا ہے نبی کریمؐ ان معاملات میں اجتہاد کرتے تھے جہاں وحی کے ذریعے آپؐ کی [illegible] نہ کی جاتی تھی اور بعض معاملات میں جہاں آپؐ اجتہاد کی بناء

پر صحیح فیصلہ نہ کر سکے وہاں اللہ تعالٰی نے وحی کے ذریعے اس کی تصویب کر دی لیکن آپؐ کو کبھی اجتہاد سے منع نہیں کیا اور نہ اس طرح کی کسی تصویب کے بعد آپؐ نے اجتہاد کرنا چھوڑ دیا بلکہ آپؐ برابر اجتہاد کرتے رہے اور صرف اپنے اجتہاد کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے ساتھیوں کی اس سلسلے میں حوصلہ افزائی اور تربیت بھی کرتے رہے مثلاً آپؐ نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف قاضی اور حاکم بنا کر بھیجا تو ان سے پوچھا کہ فیصلے کیسے کیا کرو گے؟ انہوں نے کہا:کتاب اللہ کے مطابق ، آپؐ نے فرمایا:اگر وہاں حکم نہ ملے تو؟ انہوں نے کہا:سنت رسول کے مطابق ، "اور اگر وہاں بھی حکم نہ ملے تو؟" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ، اس پر انہوں نے کہا کہ حتی المقدور کوشش کروں گا کہ غور و فکر سے صحیح فیصلے تک پہنچ سکوں ۔ ان جوابات سے آپ بہت خوش ہوئے اور ان کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا جس نے انہیں اس کام کے لئے ایک اہل آدمی کے انتخاب کی توفیق بخشی (۳۰)۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ہے کہ دو فریق اپنا مقدمہ لے کر حضورؐ کی خدمت میں پہنچے ، مجلس میں اس وقت حضرت عمرو بن عاصؓ بھی موجود تھے آپؐ نے ان سے فرمایا کہ تم فیصلہ کرو ۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ ! آپؐ کی موجودگی میں فیصلہ کروں ، آپؐ نے فرمایا: کرو (کوئی بات نہیں) ، انہوں نے کہا اگر کروں تو پھر کیا ہو گا ؟ آپؐ نے فرمایا اگر تم نے صحیح فیصلہ کیا تو دس گنا اجر ملے گا اور اگر صحیح فیصلہ نہ کر سکے تو بھی ایک نیکی تو ملے گی ہی (۳۱) ۔ بخاری کی روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ اگر کوئی حاکم یا قاضی فیصلہ کرے (یعنی اجتہادی فیصلہ اپنی رائے سے) تو اگر وہ صحیح فیصلہ کر پائے تو اسے دہرا اجر ملے گا اور اگر اس نے غلطی بھی کی تو ایک نیکی کے اجر سے محروم نہیں رہے گا (۳۲) ۔

اسی طرح بنو قریظہ کے معاملے میں ہوا کہ جب حضرت سعد بن معاذؓ کی تحکیم کا فیصلہ ہوا اور انہوں نے فیصلہ دیا کہ یہودیوں کے مردوں کو قتل کر دیا جائے اور عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا جائے تو آپ نے فرمایا "تم نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا" (۳۳) ۔ اس طرح آپ نے اپنے ساتھیوں کی اجتہاد کرنے میں حوصلہ افزائی فرمائی اور ان کی تربیت بھی کی، اگرچہ یہ الگ قانونی نقطہ ہے کہ آپؐ کی موجودگی میں صحابہ کا کوئی اجتہادی فیصلہ اس وقت ہی قابل ہو سکتا تھا جب آپؐ اس کی توثیق فرما دیتے ۔ چنانچہ

اہل یمن نے حضرت علیؓ کے ایک فیصلے کو ، جب وہ قاضی بن کر وہاں گئے تھے ، مان کر نافذ نہیں ہونے دیا جب تک کہ حضورؐ کے پاس آکر انہوں نے حضورؐ سے اس فیصلے کے ٹھیک ہونے کی تصدیق نہ کروا لی (۳۴) گویا اجتہاد و قضا کے معاملات میں حضورؐ کی زندگی میں آپؐ کی اپنی ذات با برکات ہی حرفِ آخر تھی ۔

اجتہاد پر صحابہ کرامؓ کا اجماع

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد صحابہ کرامؓ کو بہت سے نئے اور پیچیدہ معاملات کا سامنا کرنا پڑا جہاں انہوں نے اجتہاد کیا ۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں اجتماع یا شورائی اجتہاد کی اور آخری دور میں انفرادی اجتہاد کی بے شمار مثالیں صحابہ کے سامنے آئیں لیکن کسی طرف سے بھی اجتہاد کی مخالفت میں کوئی آواز نہیں سنی گئی جس سے یہ نتیجہ بآسانی نکالا جا سکتا ہے کہ اجتہاد کے حجت ہونے پر صحابہ کرام کا اجماع تھا ۔ خلافتِ راشدہ کے بعد امّت کے اہلِ علم کی عظیم اکثریت بشمول ائمہ اربعہ اجتہاد کی قائل و موید رہی ہے اور صرف بعض اہل ظاہر اور چند دوسرے متشدد لوگوں نے قیاس و اجتہاد کی مخالفت کی ہے ۔

مزاجِ شریعت کا لازمی تقاضا

جیسا کہ پہلے باب میں ذکر ہوا شریعت کو جس نہج پر اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اجتہاد کا عمل جاری رہے ۔ اللہ تعالیٰ نے شریعت کا منہاج یہ رکھا ہے کہ ان امور میں جو اپنی طبیعت میں پختہ و دائم ہیں اور امور مہمات میں سے ہیں (مثلاً انسان کے دین، نسل، اس کے شرف و عقل اور اس کی املاک کا تحفظ کہ ان کے بغیر صالح سوسائٹی کا قیام ممکن ہی نہیں ہے) وہاں تو اس نے تفصیلی ، دائمی اور ناقابلِ تغیّر قوانین مہیا فرمائے لیکن ان امور کے علاوہ وہ امور جن پر زمان و مکان کے بدلنے اور تمدن کے ترقی کرنے سے فرق پڑ سکتا ہے ان کے بارے میں شریعت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ان میں اصول و مبادی دینے پر اکتفا کرتی ہے اور یہ بات امت کے اہل علم پر چھوڑ دیتی ہے کہ وہ حسبِ ضرورت شریعت کے اصول و قواعد کی روشنی میں تفصیلی ضابطے بناتے رہیں ، مثلاً شوریٰ اسلام میں ایک بنیادی اصول ہے ۔ قرآن مجید میں ہے "و امرھم شوریٰ بینھم" (۳۵) لیکن اللہ تعالیٰ نے ان تفصیلات سے قرآن مجید میں تعرض

نہیں کیا کہ شوریٰ کا ادارہ کیسے بنے گا ؟ اس کے ممبران کتنے ہوں گے ؟ کیسے چنے جائیں گے؟ کیسے کام کریں گے ؟ کیوں کہ اگر ایسا کر لیا جاتا تو یہ شریعت کے کمال کے خلاف ہوتا کیونکہ یہ تفصیلات اگر مہیا کی جاتیں تو لازماً اس وقت کے عرب معاشرے کی ضروریات کے ہی مطابق ہوتیں اور بعد میں کسی اور زمانے میں عرب سے باہر ایسے حالات ہو سکتے تھے جہاں یہ تفصیلات کام نہ آتیں تو اس طرح یہ بات شریعت کے کمال اور کے خلاف جاتی، لہذا خالق کائنات نے جو اس شریعت کا نازل کرنے والا ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی دانا و حکیم نہیں ، ایسا انتظام کیا جو ہمیشہ کے لئے مناسب اور کارآمد ہے ۔ چنانچہ اس مختصر گفتگو سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شریعت مطہرہ کا ڈھانچہ اور مزاج ایسا بنایا ہے کہ اجتہاد اس کا لازمی تقاضا ہے ۔

اجتہاد کا دائرۂ کار

اسلام میں اجتہاد کے دائرۂ کار کی تین ممکنہ صورتیں ہیں ایک تو نصوص سے براہ راست متعلق، دوسرے نصوص سے بالواسطہ طور پر متعلق اور تیسرے مباحات کا وسیع دائرہ ان امور میں جن کے بارے میں کوئی نص موجود نہیں ہے ۔

۱ ۔ یہ بنیادی بات تو معلوم و معروف ہے کہ جہاں حکم منصوص موجود ہو وہاں اجتہاد کا گزر نہیں ہوتا لیکن نصوص چونکہ ایک انسانی زبان میں نازل ہوئی ہیں اس لئے بعض اوقات ان سے ایک سے زیادہ معنی لئے جانے کا احتمال باقی رہتا ہے ، ایسی صورت میں اجتہاد کا میدان یہ ہے کہ مختلف مفاہیم و معانی میں سے مناسب ترین معنی اور مفہوم کا انتخاب کرنا اور اس کے لئے دلیل دینا مثلاً قرآن مجید میں مطلقہ عورتوں کے بارے میں ہے "والمطلقات یتربصن بانفسھن ثلاثۃ قروء" (۳۶) اب عربی زبان کے لحاظ سے یہاں ثلاثۃ قروء کے معنی تین حیض بھی لئے جا سکتے ہیں اور تین طہر بھی ، اجتہاد سے یہ معلوم کیا جائے گا کہ ان دونوں معنوں میں سے کس کو اختیار کیا جائے اور کیوں؟

نصوص کی دوسری حالت جہاں اجتہاد کا دخل ہوتا ہے وہ احادیث الرسولؐ کی سند کا معاملہ ہے ۔ اگر کسی حدیث کی نسبت حضورؐ سے بالیقین ثابت ہو جائے تو اس پر عمل واجب ہو جاتا ہے لیکن اس امر میں بہرحال اہلِ علم کے درمیان اختلاف ہو سکتا ہے

کہ کوئی حدیث سچ مچ حضورؐ کی حدیث ہے بھی یا نہیں، اس کے راوی کیسے ہیں ، کوئی راوی درمیان میں سے غائب تو نہیں ، کوئی راوی جھوٹا اور ناقابل اعتماد تو نہیں ، وغیرہ وغیرہ مثلاً مسند احمد کی ایک حدیث ہے ﴿صوموا لرویتہ، وافطروا لرویتہ، وانسکوا لھا فان غم علیکم فاتموا ثلاثین وان شہد شاھدان مسلمان فصموا وافطروا'' یعنی چاند دیکھ کر روزہ رکھنا شروع کرو اور چاند دیکھ کر ہی روزہ رکھنا بند کرو لیکن اگر بادل ہوں اور چاند نظر نہ آئے تو تیس پورے کر لو لیکن اگر دو مسلمان چاند ہونے کے بارے میں شہادت دیں (کہ انہوں نے چاند دیکھا ہے) تو ان پر اعتماد کرتے ہوئے روزہ رکھنا شروع کرو یا رمضان ختم کرو'' اس حدیث کی سند یہ ہے ''حدثنا عبداللہ حدثنی ابی ثنا یحیی بن زکریا بن زکریا ، قال حجاج بن الحرث الجدی قال خطب عبدالرحمن بن زید بن الخطاب فی الیوم الذی یشک فیہ قال الا انی قد جالست اصحاب رسول اللہ وسألتھم الا وانھم حدثونی ان رسول اللہ قال ''صوموا لرؤیتہ ۔۔۔'' (۳۸) ۔

سند سے صاف ظاہر ہے کہ راوی نے (جو تابعی ہیں) کسی خاص صحابی کا نام لئے بغیر حدیث روایت کر دی ہے جو اس کی کمزوری پر دلالت کرتی ہے ۔ امام نسائی نے اس حدیث کا ذکر اپنی سنن میں کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کا ایک راوی مجروح ہے لیکن ساتھ ہی کہا ہے چونکہ یہ حدیث بعض دوسرے راویوں سے بھی ثابت ہے لہذا یہ قابل قبول ہے (۳۸) ۔

۲ ۔ جہاں تک ان امور کا تعلق ہے جو منصوص سے بالواسطہ متعلق ہیں تو وہ تین طرح کے ہیں :

ا ۔ منصوص پر قیاس کرنا: یعنی اگر کسی واقعہ میں ایک حکمِ منصوص موجود ہے تو اس سے ملتے جلتے واقعات میں (جن میں وہی ''علت'' پائی جائے جو منصوص واقعے میں پائی جاتی ہے تو اس میں بھی وہی حکم لگایا جائے گا مثلاً شارع نے شراب پینا حرام قرار دیا اور اس کی علت نشہ کا ہونا ہے تو اس پر قیاس کرتے ہوئے ہر وہ چیز جو کھائی یا پی جائے یا کسی دوسرے طریقے سے جسم میں داخل کی جائے اگر وہ نشہ کرے گی تو اس منصوص حکم پر قیاس کرتے ہوئے اسے بھی حرام قرار دیا جائے گا ۔

ب ۔ منصوص سے استنباط کرنا: جن امور میں شریعت نے تفصیلات دینے کی بجائے

اصول و قواعد عنایت فرمانے پر اکتفا کیا ہے ، ان کی روشنی میں تفاصیل اور فروعات کا تعین کرنا، جیسا کہ ہم نے شوریٰ کی مثال دی کہ اصل حکم تو شارع نے مشاورت کا دے دیا لیکن تفصیلات سنت کے مختلف وقائع اور احکامات سے مستنبط کی جا سکتی ہیں ۔

ج۔ منصوص کی تطبیق: جن احکام کے بارے میں نصوص وارد ہوئی ہیں جب ان کو سوسائٹی میں عملاً نافذ کیا جائے تو بہت سے تفصیلی ضابطے اور ذیلی قواعد بنانے پڑتے ہیں جن کے لئے اجتہاد کی ضرورت پڑے گی مثلاً زکوٰۃ کی ادائیگی کے مسئلے ہی کو لیجئے ، جدید زمانے کی ضرورتوں اور حالات کے پیش نظر آج اگر زکوٰۃ کے نظام کو سوسائٹی میں نافذ کرنا مقصود ہو تو بہت سے قواعد بنانے پڑیں گے ، منصوص احکام کی تطبیق کے لئے ان کی دفعہ وار تدوین (Codification) اجتہاد ہی کا ایک حصہ ہے اور یہ کام صحیح طریقے سے کوئی ایسا آدمی نہیں کر سکتا جو علومِ شریعت کا ماہر نہ ہو ۔

۳ ۔ اجتہاد کے سلسلے میں تیسرا دائرۂ کار ان امور پر مشتمل ہے جو براہِ راست تو نصوص سے متعلق نہیں ہے لیکن مقاصدِ شریعت کی روشنی میں اور قرآن و سنت کی سپرٹ کے مطابق مصالحِ عامہ اور عادات و اعراف کو پرکھا جاتا ہے کہ ان میں کوئی چیز شریعت اور اس کی روح سے متصادم تو نہیں ہے ، مثلاً ٹریفک ، ڈاکخانے اور ٹیلیفون کی تنظیم کے لئے قواعد سازی یا ان رسوم و رواج کو قبول کرنا جو لوگوں میں معروف و مروّج ہو چکی ہوں ۔ اس تیسرے دائرے میں چونکہ وسعت ہے اس لئے فقہاء نے اجتہادی کوششوں کو منضبط کرنے کے لئے چند شرائط کا ذکر کیا ہے یہ شرائط سلبی بھی ہیں اور ایجابی بھی ۔

سلبی شرائط

۱۔ قرآن و سنّت میں مذکور کسی حکم کے خلاف اجتہاد نہیں کیا جا سکتا اگر کوئی کرے تو وہ قابلِ رد ہو گا ۔

۲۔ یہ کہ ایسا کوئی حکم سابقہ اجماع کے خلاف نہ ہو (ہماری رائے میں یہ شرط اجماع صحابہ تک محدود ہونی چاہئے کیونکہ ان کے بعد اجماع کا ثابت کرنا امرِ محال ہے ۔ بشرطیکہ وہ اجماع ایسے امور سے متعلق نہ ہو جو زمان و مکان اور اعراف سے متاثر ہوتے ہیں ۔)

ایجابی شرائط

۱۔ یہ کہ اجتہاد صرف حقیقی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کیا جائے فرضی اور وہمی امور کے لئے اجتہاد (خصوصاً حکومتی سطح پر) ایک بے معنی بات ہے ۔

۲۔ ہر ایسے اجتہاد کو لازماً شریعت کے مقاصد اور دین کے مبادی کے مطابق ہونا چاہئے کیونکہ دین و شریعت سے ہٹ کر کوئی نئی چیز نکالنا اجتہاد نہیں کھلی گمراہی ہے ۔

۳۔ یہ اجتہاد ایسا ہونا چاہئے کہ عامۃ الناس کی عقل و سمجھ میں آنے والا ہو کیونکہ معاشرے میں ایسا اجتہاد عموماً مصالح و اعراف صالحہ کی حفاظت اور مشقت و حرج دور کرنے کے لئے کیا جاتا ہے ۔ اب اگر کوئی فقیہ کسی معاملے کا کوئی ایسا حل پیش کرے جو پبلک کے لیے پیچیدہ اور ناقابلِ فہم ہو تو یہ ان کو مشقت میں ڈال دے گا بجائے اس کے کہ ان کو مشقت سے نکالے ۔

شرائط المجتہدین

جو فقہاء اجتہاد کرتے ہیں ان کو مجتہد کہا جاتا ہے ۔ اجتہاد کی اہلیت کے لئے اصولیوں نے جن صفات و مؤہلات کا ذکر کیا ہے ، وہ دو قسم کی ہیں ۔ ۱۔ علمی شرائط اور ۲۔ عملی شرائط ۔

علمی شرائط

ان میں پہلے نمبر پر قرآن و حدیث کا گہرا علم ہے، اس کا اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ مجتہد کو سارے قرآن اور احادیث پر دسترس حاصل ہو یا احکام سے متعلق جو آیات و احادیث ہیں کم از کم ان پر اسے عبور حاصل ہو (۴۰) ۔ نیز قرآن و سنّت کے علوم سے متعلق جو امور ہیں (مثلاً اسبابِ نزول ، ناسخ و منسوخ ، عام اور خاص ، مطلق اور مقید وغیرہ) ان پر بھی اسے عبور حاصل ہو ۔

مجتہد کے لئے ضروری ہے کہ سب مسائل میں ماضی کے فقہاء و مجتہدین کے اختلاف و اتفاق کے بارے میں اسے علم ہو ، یہ اعلیٰ ترین درجہ ہے اور اس سے نچلا قابلِ قبول درجہ یہ ہے کہ کم از کم زیرِ بحث مسئلے میں اسے مختلف فقہاء و مجتہدین کی آراء کا علم ہو تا کہ وہ اپنی انفرادی رائے سے اجماع خصوصاً اجماع صحابہ کی خلاف ورزی نہ

کرے (۴۱) ۔

ایک اور ضروری چیز عربی زبان پر عبور ہے کیونکہ قرآن و سنّت دونوں عربی زبان میں ہیں لہٰذا جو اس زبان کی باریکیوں کو نہ سمجھتا ہو وہ اجتہاد نہیں کر سکتا اس کا اعلیٰ ترین درجہ تو یہ ہے کہ فقیہ مجتہد فی اللغہ ہو (۴۲) یا کم از کم عربی زبان اور اس کے قواعد اور ادب کا ماہر ضرور ہو تاکہ اس زبان کے ذریعے سے وہ قرآن و حدیث کے مطالب کو گہرائی اور دقّتِ نظر سے سمجھ سکے ۔

مجتہد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ علم اصولِ فقہ میں گہری نظر رکھتا ہو کیونکہ اصولِ فقہ میں مہارت کے بغیر وہ ان اصول و قواعد کو نہیں سمجھ سکتا جن پر اجتہاد کا دارومدار ہوتا ہے (۴۳) ۔اسی طرح مجتہد کے لئے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کے احوال سے باخبر ہو، کیونکہ غیر منصوص امور اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کا تعلق لوگوں کے مصالح کی حفاظت یا ان پر سے مشقت کی دوری سے ہوتا ہے، اب اگر فقیہ کو لوگوں کے مسائل اور ان کی نوعیت اور کیفیت کا پتہ ہی نہ ہو تو وہ ان مسائل میں صحیح طریقے سے اجتہاد کیسے کر سکتا ہے (۴۴) ۔

عملی شرائط

عملی شرائط میں سے پہلی شرط تو یہ ہے کہ مجتہد عاقل و بالغ ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک ہے کہ تین طرح کے آدمی شرعی تکالیف کے مکلف نہیں ہوتے ۔ بچہ جب تک بالغ نہ ہو جائے، سویا ہوا شخص جب تک جاگ نہ جائے اور بیہوش (مریض) جب تک وہ ہوش میں نہ آئے (۴۵) ۔ دوسری شرط یہ ہے کہ مجتہد مسلمان ہو (۴۶) کیونکہ اگر وہ مسلمان نہ ہو اور نہ وہ اسلام کے بنیادی عقائد پر ایمان رکھتا ہو تو اس کے اجتہاد کا کیا اعتبار اور کیا فائدہ ؟ کیونکہ نہ تو صحیح معنوں میں وہ اجتہاد کا حق ادا کر سکے گا اور نہ ہی لوگ اس کے دلائل کو صدقِ دل سے قبول کریں گے (۴۷) ۔ عملی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ مجتہد عادل ہو (۴۸) متقی اور پرہیزگار ہو لوگوں میں عام طور پر اس کی شہرت اچھی ہو کیونکہ اگر وہ سیرت و اخلاق کے اعلیٰ مقام پر فائز نہ ہو تو لوگ دین کے نازک مسائل میں اس کی رائے پر کیسے بھروسہ کریں گے ۔

اجتہاد کے وسائل

اجتہاد کے وسائل سے ہماری مراد وہ طریقے ہیں جن کو استعمال کرتے ہوئے ایک مجتہد اجتہاد کرتا ہے ۔ ہم نے ان کو مآخذ کی بجائے وسائل کہنا زیادہ مناسب سمجھا ہے، جن امور کو بعض لوگ گہرائی میں جائے بغیر سہولت سے شریعت کا مآخذ کہہ دیتے ہیں ، قدیم فقہاء نے انہیں ادلہ التشریع کہا ہے اور یہاں بھی وہ ان میں متفق علیہ اور مختلف فیہ کی صورت میں فرق کرتے ہیں، عام اہل سنت قرآن و سنت اور اجماع و قیاس کو متفق علیہ ادلہ سمجھتے ہیں اور استحسان ، مصالح مرسلہ ، مذہب صحابی اور عرف وغیرہ کو مختلف فیہ ، ہم نے جس ترتیب سے ان کا ذکر کیا ہے اس لحاظ سے قرآن و سنّت تو مآخذ کی فہرست میں آ گئے اور باقی وسائل اجتہاد کی ذیل میں آ گئے ، جہاں تک اجماع کا تعلق ہے ہم اسے اقسامِ اجتہاد میں بیان کریں گے ۔

وسائل اجتہاد میں سے جن پر ہم یہاں مختصر گفتگو کریں گے وہ ہیں قیاس ، استحسان ، مصالح مرسلہ اور عرف ۔

قیاس

اصطلاح فقہ کے طور پر قیاس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی واقعے میں حکمِ منصوص موجود ہو تو کسی دوسرے واقعہ میں جس میں حکمِ منصوص موجود نہ ہو لیکن اس میں وہی علّت پائی جائے جو پہلے واقعے میں تھی تو پہلے واقعے کے حکم کو دوسر واقعے پر بھی منطبق کیا جائے گا ، علّت کے اشتراک کی وجہ سے ، آئمہ اربعہ اور دیگر فقہاء نے اس کا بکثرت استعمال کیا ہے یہاں تک کہ امام شافعیؒ نے 'رسالہ' میں قیاس کو اجتہاد کے معنی میں استعمال کیا ہے اور قیاس کا کسی نے انکار نہیں کیا سوائے ظاہریہ ، نظامیہ اور بعض شیعہ گروہوں کے ۔ قیاس کی حمایت میں نہ صرف قرآنی آیات موجود ہیں بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ کرامؓ نے آپؐ کی اتباع میں اس کا بکثرت استعمال کیا ہے ، اس کی تفصیلات امام ابن قیم نے "اعلام الموقعین" میں دی ہیں ۔

قیاس کی بحث میں اہم ترین عنصر احکام کی "علّت" کا ہے چنانچہ اصولیوں نے علّت کی تعریف ، شرائط ، اقسام ، اس کی پہچان اور ثبوت کے طریقے وغیرہ کتبِ اصولِ فقہ میں تفصیل سے بیان کئے ہیں جن کا تفصیلی مطالعہ کئے بغیر اجتہاد کرنا ممکن نہیں

ہے ۔

بعض ہم عصر سکالر مغربی قانون کی پیروی میں فقہ اسلامی میں بھی قیاس کی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے (۴۸) حالانکہ یہ قیاس مع الفارق ہے وضعی قوانین میں قیاس کی حجت واقعی تسلیم نہیں کی جانی چاہئے کیونکہ ان قوانین میں ایسی متفق علیہ، خدا کی طرف سے نازل کردہ اور تحریف سے محفوظ ، نصوص موجود نہیں ہیں جنہیں لوگ تقدس اور ایمان کا درجہ دیتے ہوں ، جب وہاں اصل ہی ثابت نہیں ہے "تو قیاس کس پر کیا جائے گا ۔ اس کے برعکس شریعتِ اسلامی کی نصوص ثابت شدہ ، مقدس اور متفقہ طور پر محترم اور ناقابلِ تغیر ہیں لہذا ان نصوص پر قیاس کر کے نئے معاملات میں اس حکم کا انطباق کیا جا سکتا ہے ۔ گویا شریعت کے قیاس کو "قانون وضعی کے قیاس" پر قیاس کرنا ایک غلط قیاس ہے ۔

استحسان

استحسان دراصل قیاس ہی کی ایک شاخ ہے اور عمومی مفہوم اس کا یہ ہے کہ قیاس پر مبنی قاعدے کی سختی سے پابندی کی وجہ سے اگر حرج اور مشقت واقع ہوتی ہو تو اس کی بجائے کسی دوسری دلیل کو اس پر ترجیح دے کر اس پر عمل کر لیا جائے اس سلسلے میں فقہاء اگرچہ نص، اجماع ، ضرورت اور قیاس فقہی سب کو (اصولاً) شمار کرتے ہیں (۴۹) لیکن استعمالاً استحسان دراصل یہی ہے کہ رفعِ حرج اور جلبِ منفعت کے لئے قیاس خفی کو قیاس جلی پر ترجیح دی جائے ۔

اس قاعدے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے ؟ دراصل جو چیز ہر تشریع کی جان ہے وہ رفعِ حرج، دفعِ مشقت اور جلبِ تیسیر (حصولِ آسانی) ہے نیز یہ کہ انسانی ضرورتوں اور مصلحتوں کا دامن اس قدر وسیع اور متنوع ہے کہ قاعدہ و قانون میں اس کو سمیٹنا نہایت مشکل ہے یہی وجہ ہے استحسان سے ملتے جلتے قاعدوں کا وجود ہم دوسرے نظام ہائے قانون میں بھی پاتے ہیں، انگریزی قانون میں نصفت (Equity) یونانیوں میں (Epieikeia) اور رومیوں میں (Aequija) اس کا ایک مظہر ہیں ۔ اسلامی فقہ میں استحسان کے قاعدے کا مطلب قرآن و سنت کی نصوص کا ترک نہیں ہے بلکہ (قیاس پر مبنی) کسی خفی اور کمزور دلیل کو (قیاس پر مبنی) کسی واضح اور قوی دلیل پر ترجیح

دینا ہے کسی اہم شرعی مقصد (مثلاً رفع حرج یا جلب منفعت) کی خاطر۔ چونکہ اس دوسری قوی دلیل کی حمایت بھی شریعت کی نصوص ہی کرتی ہیں اس لئے فقہاء اور اصولیین دفعِ مشقت اور جلبِ تیسیر سے متعلق آیات و احادیث کو استحسان کی حمایت میں پیش کرتے ہیں چنانچہ یہ سارا معاملہ شریعت کی حدود کے اندر ہی رہتا ہے اس سے خارج نہیں ہوتا۔

استحسان کا مذکورہ بالا مفہوم اگر ذہن میں رکھا جائے تو اس کی مخالفت سمجھ میں نہیں آتی۔ جن بزرگوں نے اس کی مخالفت کی ہے مثلاً امام شافعیؒ اور امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے تو اس بنیاد پر کی ہے کہ یہ اتباع ذوق و ہوی ہے اور گویا اپنی شریعت ایجاد کرنا ہے (۵۰)ف
جہاں تک تلذذ اور اتباع ذوق و ہوی کا تعلق ہے اس کی مخالفت تو ہر کوئی کرتا ہے، اس کو شرعی دلیل تو کوئی بھی نہیں مانتا، استحسان میں بھی اگر قیاسِ خفی کو ترجیح دی جاتی ہے قیاسِ ظاہر پر، تو اس کی بنیاد بھی کوئی قوی تر دلیل ہی ہوتی ہے اتباع نفس نہیں ہوتا۔ اس معاملے کی مثال ایسے ہی ہے جیسے بعض کبار صحابہؓ سے رائے کی مذمت میں اقوال منقول ہیں، ظاہر ہے یہاں جو رائے مذموم ہے وہ دینی امور میں ذاتی رائے سے فیصلہ کرنا ہے بغیر شرعی دلیل کے، ورنہ جہاں تک اس رائے کا تعلق ہے جس پر دلیل موجود ہو تو یہ تو وہی چیز ہے جسے اجتہادِ شرعی کہتے ہیں اور جس پر کبار صحابہؓ نے خود عمل کیا ہے۔

استصلاح (المصالح المرسلہ)

مصلحت و ضرورت کی بناء پر اجتہادی فیصلے کی بنیاد رکھنے کو فقہ کی اصطلاح میں استصلاح کہا جاتا ہے۔ بعض مصالح ایسے ہیں کہ شریعت نے خود ان کی تائید کی ہے مثلاً حفظِ جان کہ اس کے لئے شارع نے قصاص کا حکم دیا یا حفظِ مال کہ چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا قرار دیا۔ ایسے مصالح اور ان کے حکم کے بارے میں ظاہر ہے اجتہاد کا کوئی دخل نہیں۔ اسی طرح بعض مصالح ایسے ہیں جن کی نفی خود شارع نے کر دی مثلاً کوئی کہے کہ وراثت میں عورت اور مرد کا حصہ برابر ہونا چاہئے کیونکہ مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ عورت اور مرد میں مساوات ہو تو یہ غلط ہو گا کیونکہ اس مصلحت کی نفی خود قرآن نے کر دی ہے اور اس کو تسلیم نہ کرتے ہوئے وراثت میں عورت اور مرد کے الگ الگ حصے مقرر کر دیئے ہیں۔

تو جو مصلحت یہاں زیرِ بحث ہے اور جس کا تعلق اجتہاد سے ہے وہ ایسی مصلحت ہے کہ نہ اس کی صریح تائید شریعت نے کی ہو اور نہ ہی اس کی واضح نفی کی ہو بلکہ وہ ایسی مصلحت ہے جو مطلق ہو اور اس کے بارے میں اثباتاً یا نفیاً کوئی شرعی حکم موجود نہ ہو (۵۱)۔

فقہی قاعدے کی بنیاد مصلحت پر رکھنا صرف اس دلیل پر کہ رفعِ حرج اور جلبِ مصلحت خود شریعت کو مطلوب ہے ایک وسیع امر ہے جس کو منضبط کرنا ذرا مشکل ہے ۔ جن کثیر فقہاء نے اس کی تائید کی ہے وہ اپنی حمایت میں قرآن و سنت سے دلیل لاتے ہیں اور عملِ صحابہؓ سے وہ تمام مثالیں پیش کرتے ہیں جو انہوں نے حفظِ مصالح کے لئے کیں مثلاً قرآن مجید کا جمع کرنا ، دیوان کا مرتب کروانا جیلیں بنوانا وغیرہ اور اس کے مقابلے میں جو لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر مصالح پر فقہی احکام کی بنیاد رکھی جائے جن کی واضح تائید شریعت نہ کرتی ہو تو یہ حرص و ہوس کا دروازہ کھولنے والی بات ہے اس کا غلط استعمال ہو سکتا ہے اور اسے روکنے کی کوئی صورت نہ ہو گی ۔

جمہور علماء نے اس مؤخر الذکر نقطۂ نظر کو تسلیم کرنے کے باوجود مصالح کی بنیاد پر فیصلے کرنے کے حق میں رائے دی ہے کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ انسانی معاشرہ ہر آن تغیر پذیر ہے ، نئے واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور اگر لوگوں کو پیش آمدہ احوال و ظروف کا مناسب حل شریعت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے پیش نہ کیا جائے تو یہ ایک بہت بڑا فتنہ ہو گا شریعت مطہرہ کے خلاف ، کیونکہ اس سے شریعت کے ہمیشہ قابلِ عمل ہونے کے وصف پر حرف آئے گا اور اس کو جمود کا طعنہ آسانی سے دیا جا سکے گا نیز یہ کہ لوگ حرج اور مشقت میں مبتلا ہوں گے جس سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ شریعت لوگوں پر اتاری ہے ۔ تاہم فقہاء نے مصالح کو منضبط کرنے کے لئے چند قواعد وضع کئے ہیں جن میں سے چند معروف یہ ہیں :

۱۔ یہ کہ مطلوبہ مصلحت حقیقی مصلحت ہو، مجرد اوہام و احتمالات پر مشتمل نہ ہو مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ مرد سے حقِ طلاق واپس لے کر عدالت کو دے دیا جائے کیونکہ مرد اس حق کی وجہ سے عورت پر ظلم کر سکتا ہے تو یہ حقیقی اور ثابت شدہ مصلحت نہ ہو گی کیونکہ یہاں مصلحت کے احتفاظ کا ادعا کرنے والوں نے یہ نہیں سوچا کہ

اگر مرد سے حق طلاق مستقلاً واپس لے لیا جائے تو پھر عائلی زندگی میں جو مشکلات پیدا ہوں گی ان کے نقصان کا دائرۂ کار کتنا وسیع ہو گا۔

۲۔ یہ کہ مصلحت کا تعلق عامۃ الناس سے ہو کسی ایک شخص یا طبقے کے لئے خاص نہ ہو کیونکہ اس سے بڑھ کر ظلم کی بات اور کیا ہو گی کہ حکمرانوں اور امراء و با اثر طبقات کی خواہشیں اور مفادات پورے کرنے کے لئے اسلام اور شریعت کے نام پر قانون سازی کی جائے جب کہ عامۃ الناس کا اس میں کوئی بھلا نہ ہو، جیسا کہ ہمارے معاشرے میں سرمایہ دار و جاگیردار اکثر ایسے قوانین مصلحت عامہ (Public Welfare) کے نام پر بنواتے رہتے ہیں جن سے ان کے طبقاتی مفادات کا تحفظ ہوتا ہے اور نام بیچارے عوام کا لگتا ہے۔

۳۔ یہ کہ مصلحت و ضرورت کو کسی ایسے مقصد کے لئے استعمال نہ کیا جائے جس کے بارے میں پہلے سے شرعی حکم نص کی صورت میں موجود ہو۔

اگر دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو مصالح مرسلہ اور استحسان کا دائرۂ کار تقریباً ایک ہی ہے دونوں کے اعتبار والغاء کے دلائل بھی کم و بیش وہی ہیں، جس کام کو احناف نے استحسان کے نام سے کیا ہے، مالکیہ نے اس کو مصالح مرسلہ کے عنوان سے کیا ہے اور جن لوگوں نے استحسان یا استصلاح کا بظاہر انکار بھی کیا ہے، وہ بعض حالات میں مجبور ہوئے ہیں کہ حقیقی ضروریات کے لئے وسیع تر استنباط سے کام لیں خواہ وہ استصلاح یا استحسان کا نام نہ بھی لیں۔

عرف

عرف و رواج کی اہمیت یہ ہے کہ ایک مجتہد اجتہادی فیصلہ کرتے وقت لوگوں کے اعراف و عادات سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا کیونکہ شریعت کی بنیاد جلب مصلحت اور رفعِ حرج پر ہے لہٰذا ہر وہ رسم و رواج جو مقاصدِ شریعت کو پورا کرتا ہو یا کم از کم شریعت کے خلاف نہ ہو اس کا لحاظ کرنا اجتہادی معاملات میں ضروری ہے کیونکہ اس میں لوگوں کے لئے سہولت اور آسانی ہے جو شریعت کو عین مطلوب ہے۔ تاہم یہ واضح رہے کہ صرف وہی عرف قابلِ لحاظ ہے جو شریعت کی نصوص اور اس کے مقاصد کے خلاف نہ ہو اور چونکہ نصوص کی مخالفت میں کسی دوسرے قاعدے کی رعایت نہیں کی جا سکتی لہٰذا عرف کا لحاظ صرف اجتہادی امور میں ہوتا ہے۔

عرف کے لحاظ کی مثالیں خود نبی کریمؐ کی سنّت سے ثابت ہیں مثلاً دیت کا عاقلہ پر فرض کیا جانا، شادی میں کفو ہونے کا تصور، ولایت و وراثت میں عصبیت کا لحاظ اور بیع و تملیک کی مختلف صورتوں کا جواز وغیرہ ۔ چونکہ آپؐ ہر وقت رحمت الٰہی کی نگرانی میں ہوتے تھے لہٰذا اگر یہ بات قابلِ اعتراض ہوتی تو آپؐ کو وحی جلی کے ذریعے ٹوک دیا جاتا جیسا کہ بعض دوسرے معاملات میں آپؐ کے بعض فیصلوں کی تصحیح گئی ۔

صحابہ کرامؓ نے بھی مفتوحہ ممالک کے اعراف و قواعد کو برقرار رکھا، ان کی زبان، کلچر اور مذہب کا لحاظ رکھا، حضرت عمرؓ نے عراق، شام اور مصر میں موجود لگان اور مالگزاری کے طریقوں اور مستعمل زبان کو برقرار رکھا خلیفہ عبدالمالک کے زمانے میں کہیں جاکر ان علاقوں کی زبان عربی قرار پائی ۔

فقہاء نے بھی تدوین فقہ کے وقت اور بعد کے ادوار میں بھی ہمیشہ لوگوں کے اعراف کو ملحوظ رکھا ہے حضرت امام مالکؒ کے مذہب میں عمل اہلِ مدینہ کی اہمیت اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ۔ امام شافعیؒ جب عراق سے مصر گئے تو انہوں نے مقامی حالات کی مناسبت سے بہت سی سابقہ آراء سے رجوع کر لیا چنانچہ کئی امور میں ہمیں ان کی قدیم اور جدید آراء میں اختلاف سے سابقہ پڑتا ہے ۔ احناف نے بھی بہت سے مسائل میں عرف پر انحصار کیا ہے مثلاً اگر عورت اور مرد میں مہر کے معجل اور مؤجل ہونے پر اختلاف ہو جائے تو فیصلہ مقامی عرف کے مطابق ہوگا ۔

موجودہ زمانے میں بھی قانون بناتے وقت مجتہدین کا یہ کام ہے کہ وہ لوگوں کے اعراف کا خیال رکھیں اس لئے ہم نے مجتہدین کی شرائط میں یہ ذکر کیا ہے کہ مجتہد ایسا ہونا چاہئے جسے لوگوں کے احوال و اعراف کی خبر ہو تاکہ وہ ان کی مراعات کا اہتمام کر سکے ۔

اجتہاد کے مصادر اور وسائل کے مختصر ذکر کے بعد اب ہم اجتہاد کی اقسام اور اس سلسلے میں فقہ کی خصوصی اہمیت کا ذکر کریں گے ۔

اجتہاد کی اقسام

اجتہاد کی اقسام مختلف جہات سے زیرِ بحث آ سکتی ہیں مثلاً انفرادی اور اجتماعی

اجتہاد ، شخصی اور حکومتی سطح پر اجتہاد، کامل اور جزئی اجتہاد، اجتہاد مطلق اور مقید وغیرہ۔

یہاں اجتہاد سے ہماری مراد وہ اجتہاد ہے جسے اصولیوں اور فقہاء نے فقہی یا شرعی اجتہاد کہا ہے نہ کہ اجتہاد لغوی معنوں میں یا فقہ کے علاوہ کسی اور علم میں جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں عالم مجتہد فی اللغۃ ہے ، (یعنی لغات و لسانیات میں اعلیٰ ترین درجے کا ماہر ہے) اجتہاد اور مجتہد کے الفاظ کے اس طرح کے استعمال کو فقہی یا شرعی اجتہاد پر محمول نہیں کرنا چاہئے ۔

جہاں تک اصطلاحی اجتہاد کا تعلق ہے اگر ایک مجتہد اپنی شخصی حیثیت میں اجتہاد کرے تو وہ مجرد فتویٰ اور شخصی اجتہاد ہو گا یا اگر مجتہدین کی ایک جماعت مل کر بھی اجتہاد کرے تو بھی اس کی حیثیت فتاویٰ کی ہی ہو گی ، مسلم عوام میں سے جس کسی کو اس مجتہد یا ان مجتہدین کے علم و تقویٰ پر اعتماد ہو وہ ان فتاویٰ پر عمل کر سکتا ہے لیکن کسی کو ان کے ماننے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اِلّایہ کہ حکومت اسے اپنی قوت نافذہ سے قانون کا درجہ دے دے ۔ اکثر علماء کی یہ رائے بھی ہے کہ اگر کسی اجتہادی مسئلے میں عالم اسلام کے سارے مجتہدین متفق الرائے ہو جائیں تو اس پر عمل مسلمانوں کےلئے ضروری ہو جاتا ہے ، یہ وہ چیز ہے جسے اصطلاحاً اجماع کہا جاتا ہے ، تاہم خلفاء راشدین کے بعد ایسے اجماع کا ثابت کرنا ناممکن کی حد تک مشکل ہے چنانچہ بہت سے علماء نے جن میں امام احمد بن حنبل بھی شامل ہیں اجماع کو اجماعِ صحابہؓ تک محدود سمجھا ہے (۵۱) ۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ اجماع کا ادارہ اسلام میں ایک عظیم الشان ادارہ ہے اگرچہ بعض علماء اجماع کی شرعی حجت پر دیئے جانے والے دلائل کو بہت مضبوط نہیں سمجھتے (۵۲) لیکن ان دلائل کی قطعیت یا کمزوری سے قطع نظر کرتے ہوئے عقلی طور پر بھی اگر ہم غور کریں تو اجماع کا ادارہ اہمیت کا حامل ہے جس کی نظیر انگریزی یا کسی دوسرے نظامِ قانون میں نہیں ملتی (۵۳) کیونکہ یہ اسلامی قانون میں تسلسل ، مضبوطی اور ارتقاء کا مظہر ہے نیز مباحات میں یہ نہ صرف انسانی عقل و تفکر کے استعمال کا ایک ارفع نمونہ ہے بلکہ اس نے اسلامی قانون کو اس کے ماخذ سے جڑے رہنے میں اور ہر حال میں پیش آمدہ مسائل و مشکلات کا منطقی حل پیش کرنے اور

شریعت کو ہمیشہ کے لئے کار آمد اور مضبوط قوت متحرکہ ثابت کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور یہ اسلامی فقہ کو ان تجدد پسندوں سے بچانے کا ایک ہتھیار ہے جو ٹھوس علم کی کمی اور اپنی ناپختہ ذہنیت کی وجہ سے ، خود اپنے آپ کو اور اپنے ماحول کو اسلام کے مطابق بدلنے کی بجائے خود اسلامی قانون کو بدیسی معیاروں کے مطابق بدلنا چاہتے ہیں ۔

اجتہاد کو جو چیز قوت تنفیذ مہیا کرتی ہے وہ مملکت اور اس کا اقتدار ہے اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ مسلمان ریاست اجتماعی اور شورائی اجتہاد کا انتظام کرے، مجتہدین کو جمع کرے اور بحث و مناقشے کے بعد جو طے ہو اسے اسلامی مملکت میں بطورِ قانون نافذ کر دیا جائے، یہ صورت خلافتِ مجیدہ میں موجود تھی لیکن چونکہ سوء حالات سے یہ طریقہ جاری نہ رہ سکا اور حالات نے یہ رخ اختیار کر لیا کہ اسلامی قانون علماء و فقہاء کے ہاتھوں پرائیویٹ طور پر مدون ہوا لہذا مسلمان حکومتیں اس میں آسانی سمجھنے لگیں کہ وہ ائمہ اربعہ کے معروف فقہی مذاہب میں سے کسی ایک کو مملکت کے نظام قانون کے طور پر اختیار کر لیتیں تاہم ہماری رائے یہ ہے کہ موجودہ حالات میں پہلے نقطۂ نظر کو بھی بعض احتیاطی تدابیر کے ساتھ اپنانے میں کوئی حرج نہیں پاکستان میں اب تک اسی نقطۂ نظر کو اپنایا گیا ہے اگرچہ اس کا پس منظر دوسرا ہے ۔

جہاں تک اجتہادِ کامل اور اجتہادِ جزئی (تجزء الاجتہاد) کا تعلق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مجتہد ممکن ہے فقہ کی کسی خاص شاخ یا مسئلے میں تو مجتہدانہ قدرت رکھتا ہو لیکن فقہ و قانون کے سارے شعبوں میں اجتہادی مہارت نہ رکھتا ہو ۔ ممکن ہے ماضی میں یہ بات قابل مناقشہ رہی ہو لیکن ہمارے زمانے میں اس کی وہ حیثیت باقی نہیں رہی کیونکہ ہمارا دَور تو ہے ہی تخصص (Specialization) کا دَور ۔ موجودہ قانونی حلقوں میں بھی سول، فوجداری، ٹیکسیشن ، لیبر وغیرہ کے تخصصات موجود ہیں نیز کالجوں اور یونیورسٹیوں ہی میں نہیں بلکہ دینی مدارس اور جامعات میں بھی فقہ و قانون ، عقیدہ و کلام اور علومِ قرآن و حدیث وغیرہ کے تخصصات موجود ہیں ۔

جہاں تک اجتہادِ مطلق اور مقید کا تعلق ہے تو بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اجتہادِ عام یا اجتہادِ مطلق ائمہ اربعہ پر ختم ہو چکا ہے اب صرف مقید اجتہاد باقی ہے یعنی اب جو بھی اجتہاد کرے اسے چاہئے کہ ان ائمہ میں سے کسی ایک کے بیان کردہ اصول و ضوابط

کے مطابق ہی کرے، آزادانہ غور و تحقیق سے ، یا اپنے وضع کردہ اصولوں سے براہِ راست قرآن وسنت سے استنباط کی کوشش نہیں ہونی چاہئے ، ہماری رائے یہ ہے کہ "طبقات الفقہاء" یا "طبقات المجتہدین" کی جو تقسیم ہمارے ہاں عام طور پر معروف ہے (۵۵) اس سے مقلدانہ روش کی بو آتی ہے ۔ قرآن وسنّت سے کوئی دلیل اس اَمر پر نہیں لائی جا سکتی کہ اجتہاد (یعنی اجتہادِ مطلق) بس کسی خاص زمانے تک یا بعض خاص شخصیات تک محدود تھا اور اس کے بعد اجتہاد (مطلق) نہیں کیا جا سکے گا اور/یا ان کے بعد کوئی مجتہد نہیں آسکے گا اور نہ ہی ان بزرگوں (یعنی ائمہ اربعہ) میں سے کسی نے کبھی یہ کہا ہے کہ ہمارا کہا (اور ہمارے منضبط کردہ اصول و قواعد) حرفِ آخر ہیں اور اب قیامت تک کسی کی مجال نہیں کہ وہ اس سے اختلاف کرتے ہوئے اجتہاد کر سکے ۔ گو اکثر اہلِ علم اس بات کو جانتے ہیں کہ ان ائمہ کے فقہی مذاہب کے اصول و ضوابط جس جامع طریقے سے خود انہوں نے اور ان کے ہونہار تلامذہ نے مدون کر دیئے ہیں اس کے بعد اب اس بات کی گنجائش کم ہی رہ جاتی ہے کہ ان سے باہر نکل کر عقل جہاں گیر کو موقع تگ و تاز ملے اور اس بات کا ادراک بھی عصرِ حاضر کے سنجیدہ علماء کو ہے کہ بحث و تحقیق کی آزادی اپنی جگہ لیکن مذاہبِ اربعہ کی طرز پر اب مزید فقہی مذاہب کا بنانا اور انہیں مروج کرنے کی کوشش کرنا ایک سعی لاحاصل اور کار بے خیر ہے جس کا نتیجہ امت میں انتشار کے سوا کچھ نہ ہو گا تاہم اس کے باوجود ہم یہ بات اصولی طور پر غلط سمجھتے ہیں کہ اجتہاد (مطلق) کو ائمہ اربعہ تک منحصر سمجھا جائے اور آئندہ کے لئے اس کو مقید کرنے کے موقف پر اصرار کیا جائے ۔

فقہ کی قانونی حیثیت

اسلامی قانون کے مآخذ کے اس باب میں اس سوال کا جواب دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کیا اسلامی فقہ (یعنی ماضی کے فقہاء کے اجتہادات کا مجموعہ) ہمارے دَور میں اجتہاد کے لئے مآخذ ہے ؟ ہمارے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے اور اصلاً یہ بات اتنی سادہ اور اصولی ہے کہ اس کے لئے ہمیں دلیل دینے کی ضرورت ہی نہیں لیکن جیسا کہ ہم نے پچھلے باب میں ذکر کیا ہے ، اسلامی فقہ کی نمو ایک مثالی ماحول میں نہیں ہوئی بلکہ مخصوص حالات میں ہوئی ، مسلمانوں کے ہاں سیاسی نظام نے بہت جلد پٹڑی سے

اتر کر ایک خاص ڈھب اختیار کر لیا اور اس بدلے ہوئے ماحول میں اور اس وقت کے حالات کے مطابق انتہائی بہتر طریقے سے فقہ اسلامی کی نو ہوئی جسے ایک جملے میں اس طرح سمیٹا جا سکتا ہے کہ یہ فقہ صالح علماء کے ہاتھوں غیر سرکاری طور پر مدون اور مروج ہوئی، اس کے بعد حالات نے یہ رخ اختیار کیا کہ عظیم علماء کے عقیدت مند اور متبع شاگردوں نے اس اجتہادی سلسلے کو آگے بڑھانے کی بجائے آہستہ آہستہ جو موجود تھا اسی پر اکتفا کر لیا، پہلے اس کی تشریح و تصریح اور اجمال و اختصار میں لگے رہے اور پھر آہستہ آہستہ تقلید نے ان کو تقدس کا رنگ دینا شروع کر دیا اور اب صورت حال یہ ہے کہ چاہے علماء صراحتاً اسے مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ امرِ واقعہ ہے کہ ہمارے لوگ (خاص طور پر پاک و ہند میں) قرآن و حدیث کے لئے اتنے متعصب نہیں ہیں جتنے ان فقہی مسالک کے لئے ہیں۔ ہمارے ہاں فرقہ وارانہ فسادات کی جڑ بھی یہی چیز ہے، اس چیز نے ہماری مسجدوں کو تقسیم کر رکھا ہے، مدرسوں کو تقسیم کر رکھا ہے، عوام کو تقسیم کر رکھا ہے اور یہ کم علم مولوی حضرات تک ہی محدود نہیں کہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے یا مخالف فریق کا کوئی نمازی کسی دوسری مسجد میں نماز پڑھ لے تو مسجد دھلوائی جائے کہ وہ ناپاک ہو گئی ہے بلکہ اچھے پڑھے لکھے علماء کا یہ حال ہے کہ آج سے چند سال پیشتر ایک وقیع علمی جریدے میں ایک شیخ الحدیث صاحب سے ایک خاتون نے ایک مسئلے کا شرعی جواب پوچھا تو شیخ الحدیث صاحب نے جواب میں "ہدایہ" کی عبارت سے "حکم شرعی" نقل کر کے جواب دے دیا۔ تو قصۂ کوتاہ یہ کہ ماضی کے فقہاء کے اجتہادات کی اپنی قدر و قیمت ہے، وہ ایک عظیم الشان علمی ذخیرہ ہے جس پر ہم جتنا بھی فخر کریں کم ہے اور حقیقت یہ ہے کہ خدا کے انتہائی نیک اور ذہین بندوں نے اپنی عمریں صرف کر کے اتنا عظیم الشان علمی کام کیا ہے کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے لیکن اس مبنی بر حقیقت مدح سرائی کے باوجود اصولاً اس کام کا رتبہ یہ نہیں ہے کہ وہ مآخذ اجتہاد ہے، بیشک وہ بہترین نظیر ہیں جن سے صرفِ نظر ممکن نہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ماضی کی ان مضبوط علمی بنیادوں پر ہی آج ہم اپنی اجتہادی کاوشوں کی بنیاد رکھ سکتے ہیں اور ان سے صرفِ نظر کرنا پرلے درجے کی نالائقی اور کم ظرفی ہو گی لیکن اس کا بہر حال یہ مطلب نہیں کہ ان بزرگوں کے فرمودات حرفِ آخر یا سند اور مآخذ ہیں، نہیں بلکہ وہ ہمارے لیے اس بات کا بہترین نمونہ ہیں کہ اجتہاد کیسے کیا جاتا ہے، اس کا صحیح طریقہ کیا

ہے، اس کے اصول و ضوابط کیا ہیں؟ پھر جہاں ان اجتہادات میں کوئی چیز ہمارے حسبِ حال ہو اسے جوں کا توں اختیار کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن جہاں صدیوں پہلے کے یہ اجتہادات ہماری ضروریات کے مطابق نہ ہوں وہاں نئے سرے سے اجتہاد کرنے میں بھی کوئی چیز مانع نہیں ہونی چاہئے اور نہ ہی اس موقع پر اجتہادِ مطلق اور مقید کی بحث درمیان میں آنی چاہئے کیونکہ مسلمانوں کے لئے ہر حال میں حجت قرآن و سنت ہیں نہ کہ کوئی خاص فقہ۔

حواشی

۱ ۔ لسان العرب ج ۱۱ ص ۲۴۸
۲ ۔ محمد مصطفی شلبی ، المدخل فی التعریف بالفقہ الاسلامی ص ۲۲۲
۳ ۔ محمد مصطفی شلبی ، اصول الفقہ الاسلامی ص ۲۷ ومابعدھا طبع دارالنہضہ العربیہ بیروت
۴ ۔ عبدالوھاب خلاف ، علم اصول الفقہ ص ۰ ومابعدھا
۵ ۔ الشاطبی ، الموافقات ج ۳ ص ۴۱
۶ ۔ النجم ۳ ، ۴
۷ ۔ سنن الدارمی ج ۱ ص ۱۰۳ طبع ملتان
۸ ۔ الانفال ۔ ۱۷
۹ ۔ الحاقہ ۴۴ ۔ ۴۶
۱۰ ۔ آل عمران ۷۹
۱۱ ۔ النساء ۔ ۸۰
۱۲ ۔ النساء ۔ ۸۰
۱۳ ۔ الفتح ۔ ۱۰
۱۴ ۔ النساء ۔ ۳۶
۱۵ ۔ الاحزاب ۔ ۳۶
۱۶ ۔ الحجرات ۔ ۲
۱۷ ۔ دیکھئے تفصیلات کے لئے:
۔ مولانا مودودی ، سنت کی آئینی حیثیت ص ۱۲۰ - ۱۲۶
۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی، حجیت حدیث صفحہ ۲۰ ، ۲۱
۱۸ ۔ سنن ابی داؤد ، کتاب السنہ
۲۰ ۔ ابن عربی ، احکام القرآن ج ۱ ص ۲۹۹ اور البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۹۴
۲۱ ۔ ابن ماجہ ، کتاب الطلاق
۲۲ ۔ صحیح مسلم ، کتاب الفضائل
۲۳ ۔ دیکھئے تفصیلات کے لئے علامہ محمد طاہر العاشور کی کتاب "مقاصد الشریعہ الاسلامیہ" ، صفحہ ۲۹ ومابعدھا اور دیگر امہات کتب فقہ ۔

۲۴ ۔ عبدالملک عرفانی، جدید اسلامی ریاست صفحہ ۳
۲۵ ۔ تاج العروس ج ۲ ص ۲۳۰
۲۸ ۔ النساء ۔ ۸۳
۲۹ ۔ التوبہ ۔ ۱۲۲
۳۰ ۔ مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۲۴۲ طبع المکتب الاسلامی بیروت
۳۱ ۔ مسند احمد بن حنبل ج ۴ صفحہ ۲۵۵
۳۲ ۔ صحیح البخاری ج ۷ ص ۱۵۷ طبع استانبول
۳۳ ۔ ابن ھشام ؒ سیرۃ النبیؐ (عربی) ج ۳ ص ۲۵۹
۳۴ ۔ محمد رضا ؒ علیؓ ابن ابی طالب، صفحہ ۱۲ ، طبع مکتبہ مصطفی البابی الحلبی ، القاہرہ ۔
۳۵ ۔ الشوریٰ ۔ ۳۸
۳۶ ۔ البقرہ ۔ ۲۲۸
۳۷ ۔ مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۳۲۱ طبع بیروت
۳۸ ۔ دکتور محمد اسلام مدکور ، مناہج الاجتہاد ص ۳۲۵
۳۹ ۔ نسائی ، کتاب الصوم
۴۰ ۔ غزالی ، المستصفی ج ۲ ص ۳۵۰
شوکانی ، ارشاد الفحول، دار المعرفہ بیروت
۴۱ ۔ عبدالوھاب ، علم اصول الفقہ ص ۵۲
۴۲ ۔ شاطبی ، الموافقات ، ج ۴ صفحہ ۱۰۸ طبع مکتبہ التجاریہ
۴۳ ۔ شوکانی ، ارشاد الفحول ص ۲۵۲
ابن قدامہ، روضہ الناظر وجنۃ المناظر ص ۲۰۳ طبع بیروت
۴۴ ۔ دکتور محمد سلام مدکور ، مناہج الاجتہاد ص ۳۶۴
ابوالاعلیٰ مودودی، الحکومۃ الاسلامیہ ، ص ۱۱۹
۴۵ ۔ سنن الدارمی ، ج ۱ ص ۱۷۱ طبع دار الاحیاء السنہ النبویہ
۴۷ ۔ غزالی ، المستصفی ج ۲ ص ۳۵۰
احمد بن حمدان، صفۃ الفتوی والمفتی والمستفتی ص ۱۳
۴۸ ۔ عبدالحمید متولی ، مبادی نظام الحکم فی الاسلام ، ص ۷۶ طبع نشأۃ المعارف بالاسکندریہ ، مصر
۴۹ ۔ التحریر بشرح التیسیر ج ۴ ص ۷۸
۵۰ ۔ الشافعی ، الرسالۃ ، ص ۵۰۳ ومابعدھا
۵۱ ۔ عبدالوھاب خلاف ، علم اصول الفقہ ، ص ۸۴ طبع دار القلم ۱۹۷۲م

۵۲ ۔ الشوکانی ، ارشاد الفحول ص ۸۱ ، ۸۲ طبع دار المعرفہ بیروت ۱۳۹۹ھ
۵۳ ۔ ارشاد الفحول ص ۲۷ وما بعدھا
۵۴ ۔ Mohamad Iqbal, Recostruction of Religious Thought in Islam, P-135, Lahore

باب سوم

اسلامی قانون ۔ ایک تاریخی تجزیہ

پچھلے ابواب میں جو بحث کی گئی ہے اس سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ جہاں تک شریعت کے منصوص احکام کا تعلق ہے وہ ناقابلِ تغیر ہیں اور امت ان میں کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتی۔ یہ تشریعی کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر ختم ہوگیا تھا اس لئے آنحضرت کے بعد شریعت کا ارتقاء نہیں ہوا کہ اس کی تاریخ لکھی جائے یا اس کا تجزیہ کیا جائے ۔ دراصل جس چیز کو عہدِ حاضر کے علماء "تاریخ التشریع الاسلامی" یا "تاریخ الفقہ الاسلامی" کہتے ہیں وہ تاریخ ہے مختلف ادوار اور مختلف معاشروں میں شریعت کی تطبیق کی کوششوں کی نیز یہ تفصیل ہے ان اجتہادی کاوشوں کی جو شریعت کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں نو بہ نو مسائل کو حل کرنے کے لئے فقہاء و علماء نے پچھلے ادوار میں کیں ۔ ہمارے پیش نظر ان سطور میں فقہ و اجتہاد کی تفصیلی تاریخ قلم بند کرنا نہیں ہے بلکہ ہم اس تاریخ کا ایک طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے اس کے اہم عناصر کو واضح کریں گے اور ان عوامل کی نشاندہی کی کوشش کریں گے جنہوں نے اس کی صورت گری کی ہے ،اس کے رخِ روشن کو سنوارا ہے یا اس پر دھبوں کی صورت اختیار کی ہے ۔

عصرِ نبوت

ہم پچھلے باب میں بوضاحت یہ بتا چکے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شریعت کا مدار وحی پر تھا ،وحی متلو کی صورت میں جو قرآن مجید کی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہے یا پھر وحی غیر متلو کی صورت میں جو نبی اکرمؐ کی سنّت پر مشتمل ہے اور جس میں آپؐ کے اقوال، افعال اور تقریر (تقریر یہ ہے کہ آپؐ کے سامنے کوئی فعل ہوا اور آپؐ نے نہ اس کی تنقیص فرمائی اور نہ ہی تحسین کی) شامل ہے ۔ اسی طرح نہ صرف آپؐ کے اجتہادات اس کا ایک جزو ہیں بلکہ آنحضرتؐ کی زندگی میں صحابہ کرامؓ کے اجتہادات بھی اسی ضمن میں آتے ہیں کیونکہ یہ اجتہادات مطلق نہ تھے بلکہ اپنی آخری صورت میں حضورؐ کی تصدیق و توثیق کے محتاج تھے چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ جب حضرت علیؓ قاضی بن کر یمن گئے تو ایک مقدمہ میں فریقِ مخالف نے ان

کے فیصلے کو اس وقت تک ماننے سے انکار کر دیا جب تک حضورؐ نے اس کی توثیق نہ فرمادی چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا اور آپؐ نے حضرت علیؓ کے فیصلے کی توثیق و تحسین فرمائی (۱) تو فیصلہ نافذ کیا گیا ۔

اسی طرح ایک دفعہ جب حضرت عمرو بن العاصؓ آپؐ کی مجلس میں موجود تھے اور فریقین ایک مقدمہ لے کر حاضر ہوئے تو آپؐ نے حضرت عمروؓ سے فرمایا کہ وہ اس کا فیصلہ کریں ، انہوں نے متعجب ہو کر کہا کہ آپؐ کی موجودگی میں مَیں فیصلہ کروں تو آپؐ نے فرمایا کہ ہاں ! اگر تم نے ٹھیک فیصلہ کیا تو تمہیں دس گنا اجر ملے گا اور اگر غلط فیصلہ کیا (یعنی صحیح فیصلہ نہ کر سکے) تو پھر بھی اکہرا اجر تو ملے گا ہی (۲) ۔

یہاں یہ سوال ذہن میں آسکتا ہے کہ جب آخری مرجع رسول اللہؐ تھے تو صحابہؓ کو اجتہاد کی اجازت دینے کی ضرورت کیا تھی ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نبی اکرمؐ کی ژرف بین نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ آپؐ کے بعد امت کو اجتہاد کی ضرورت پڑے گی لہذا آپؐ نے اپنے اہل علم ساتھیوں کی تربیت اس معاملے میں بھی اپنی موجودگی میں خود شروع کر دی پھر چونکہ اجتہاد کا معاملہ ایسا ہے کہ اس میں غلطی کا امکان بہرحال موجود ہوتا ہے اور تقویٰ پسند طبعیتیں اس سے کترانے پر مائل ہو سکتی ہیں ، اس لیے آپؐ نے فرما دیا کہ اجتہاد میں غلطی کرو گے تو بھی ثواب ملے گا (لیکن یہ کام بہرحال کرنے کا ہے) اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ بھی صحابہؓ کے سامنے تھا کہ کئی معاملات میں آپؐ نے وحی کی عدم موجودگی میں ذاتی اجتہاد سے فیصلہ کیا تو قرآن نے اس کی توثیق نہیں کی (۳) بلکہ تصحیح کی اور بدر کے معاملے میں تو آپ کے فیصلے پر تنقید بھی کی (۴) لیکن اس کے باوجود حضورؐ نے اجتہاد کی روش ترک نہیں کی اور برابر اجتہاد کرتے رہے تو اس میں ایک سبق تھا صحابہ کرامؓ کے لئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ قانونی معاملات میں کیا رویہ اختیار کریں گے اور یہ سب ایک منطقی نتیجہ تھا اس حقیقت کا کہ آپؐ اللہ کے آخری نبی تھے ، آپؐ کی شریعت آخری شریعت تھی اور اس شریعت کو تا ابد قائم رہنا تھا اس لئے ضروری تھا کہ قانونی مسائل میں ایسا طریقِ کار اختیار کیا جاتا جو ہمیشہ کے لیے قابلِ عمل ہوتا ۔

دورِ خلافتِ راشدہ

ان حالات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو اہلِ علم صحابہ کرامؓ نے سراسیمہ ہو کر میدان نہیں چھوڑ دیا بلکہ وقت کے چیلنج کو قبول کیا ، نہ صرف اپنے روزمرہ کے انفرادی اور

اجتماعی معاملات میں اجتہاد کی روش برقرار رکھی بلکہ جوں جوں فارس و روم کے علاقے فتح ہوتے گئے اور مسلمانوں کو ان معاشروں کے تمدن و ثقافت سے اور ہر روز نئے معاملات سے واسطہ پڑتا گیا وہ بلا جھجک قرآن سنت کی روشنی میں اجتہادی فیصلے کرتے گئے ۔

خلافتِ راشدہ کا دَور اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے ایک زریں دَور تھا کیونکہ اس زمانے میں قانون سازی اور قانون کی تنفیذ و تطبیق کے لئے جو ادارے معرض وجود میں آئے وہ شریعت کے معیارِ مطلوب کا ہر لحاظ سے ایک اعلیٰ نمونہ تھے اور جن کی خصوصیات یہ تھیں :

- خلفاء راشدین خود مجتہدین تھے
- وہ بیک وقت دینی رہنما اور سیاسی حکمران تھے
- انہوں نے حکومتی سطح پر "شورائی اجتہاد" یا "اجتماعی اجتہاد" کا نظام وضع کیا ۔

دراصل کسی بھی قانونی نظام کی بنیاد اس کے سیاسی نظریئے ، فلسفۂ زندگی اور تمدنی حکمت عملی پر مبنی ہوتی ہے ۔ خلافتِ راشدہ میں سیاسی نظام ، شریعت کے تقاضوں اور اس کی روح کے عین مطابق تھا جس میں خلیفہ عام لوگوں کی رائے سے منتخب ہوتا تھا، وہ خود شریعت پر عمل کرتا تھا اور لوگوں سے اس پر عمل کرواتا تھا ۔ وہ اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے جواب دہ تو سمجھتا ہی تھا لیکن اس سے بڑھ کر وہ اپنے آپ کو خدا کے ہاں مسئول سمجھتا تھا ، تقویٰ اور خوفِ خدا کی یہی صفت اسے ہر کام عدل و انصاف پر قائم رکھتی تھی اور اسے ہر نوع کے ممکنہ انحراف سے بچاتی تھی ۔ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کا خادم گردانتے اور ان کے بیت المال کو امانت سمجھتے تھے ، اجتماعی مسائل کو وہ مسلمانوں کے سربرآوردہ لوگوں اور اہلِ علم کی آراء اور تعاون سے حل کرتے تھے ۔ خلافتِ راشدہ اور خصوصاً حضرت عمرؓ کے زمانے میں جو شوریٰ تھی اس کے خدوخال یہ تھے :

اس شوریٰ کے ممبران میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ اہلِ علم صحابہؓ شامل تھے ۔ دقیق علمی اور فقہی مسائل میں ان سے رائے لی جاتی اور بحث و مناقشے کے بعد جس رائے پر اتفاق ہو جاتا اسے اختیار کر لیا جاتا ۔

ایسے معاملات میں جو قانونی ہونے کے علاوہ عام سماجی اور معاشرتی اہمیت کے حامل ہوتے تھے ان کو اہلِ علم کے علاوہ قبیلوں کے شیوخ اور شہریوں کے سربرآوردہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا تھا اور فیصلہ ان کی کثرتِ رائے سے کیا جاتا تھا ویکھئے مثال کے طور پر طاعون عمواس کا معاملہ (۵) یا پھر ارض سواد کا قضیہ (۶)۔

ان فقہی اور قانونی مباحث میں خلیفہ (یعنی حکومت کا سربراہ) اگرچہ خود شرکت کرتا تھا بلکہ خود اس کی صدارت بھی کرتا تھا لیکن بحث و مناقشہ کی عام اجازت ہوتی تھی اور لوگوں کو خلیفہ کی رائے کے خلاف بولنے کا پورا پورا حق حاصل ہوتا تھا اور خلیفہ اپنی مرضی منوانے کے لیے کسی پر کوئی دباؤ نہیں ڈالتا تھا بلکہ فیصلے لوگوں کی آزادانہ مرضی سے ہوتے تھے (۸) ۔ ہاں اگر بحث کے نتیجے میں خلیفہ کی رائے کو دوسرے لوگ تسلیم کر لیتے ، اپنی آزاد مرضی سے ، تو یہ الگ صورت ہوتی ۔ مثلاً ارض سواد میں بعض اکابر صحابہؓ کا حضرت عمرؓ کی مخالفت کرنا اور طاعون عمواس میں حضرت عمرؓ کے فیصلے پر حضرت ابو عبیدہؓ کا تبصرہ (۹) ۔

اگر کسی معاملے میں ان کی رائے کے خلاف بھی کوئی فیصلہ ہوتا تو وہ اس کا احترام کرتے مثلاً حضرت عمرؓ ایک آدمی سے واقف تھے جس کا معاملہ عدالت میں چل رہا تھا، ایک دن وہ سرِ راہ مل گیا تو آپؓ نے پوچھا کہ تمہارے معاملے کا کیا فیصلہ ہوا، اس نے بتایا کہ حضرت علیؓ (جو قاضی تھے) نے یہ فیصلہ کیا ہے ۔ تو آپؓ نے جواب دیا کہ اگر میں ہوتا تو اس کے برعکس یہ فیصلہ کرتا ، اس نے کہا کہ آپ یہ فیصلہ اب کیوں نہیں نافذ کرتے جبکہ آپ امیر المومنین ہیں؟ آپ نے فرمایا نہیں ، میں اپنا فیصلہ نافذ کرتا اگر بات قرآن و سنت کی ہوتی لیکن جب فیصلہ رائے اور اجتہاد پر منحصر ہے تو جیسی رائے قاضی (حضرت علیؓ) کی تھی ، ویسی ہی میری بھی تو ایک رائے ہی ہے (۱۰) ۔

اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانے میں مؤلفۃ القلوب کے سلسلے میں حضرت عمرؓ نے زمین کی وہ رجسٹری پھاڑ دی جو انہوں نے کچھ لوگوں کو جاری کی تھی اور اس کے لئے دلیل دی تو حضرت ابوبکرؓ نے اس کا برا نہیں مانا ۔ حضرت عمرؓ نے جب عورتوں کا مہر کم کرنا چاہا تو ایک عورت نے برسرِ منبر انہیں ٹوک دیا اور آپ کو کہنا پڑا کہ تم ٹھیک کہتی ہو عمر غلطی پر تھا ، ایسی ہی اور کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں ۔

شوریٰ میں کبار صحابہ کی موجودگی کو یقینی بنانے کے لیے حضرت عمرؓ نے ان کو مدینہ سے باہر جانے کی ممانعت کر دی تھی ۔ فقہاء صحابہ کی موجودگی نے ہی خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں "اجماع" کو ممکن بنایا جبکہ بعد کے زمانے میں اس کا حصول آسان نہ رہا ۔

خلفاء راشدین صرف حسب و نسب ہی میں دوسروں سے ممتاز نہ تھے بلکہ زہد و تقویٰ اور علم و عمل میں بھی دوسروں سے بڑھ کر تھے ، وہ حکومت و مملکت کے سربراہ ہی نہ تھے ، نماز اور

خطبے کے امام بھی تھے، اہلِ علم کے قدردان ہی نہ تھے بلکہ خود بھی اہلِ علم اور مجتہد تھے۔ انہیں حکومت سے زیادہ اعلاء کلمۃ اللہ کی فکر ہوتی تھی، شریعت کی ہر امکانی خلاف ورزی کرنے والے کے خلاف خلیفہ کا درہ ہر وقت تیار رہتا تھا۔ قانون کے نفاذ میں غریب اور امیر کا کوئی لحاظ نہ ہوتا تھا، حضرت عمرؓ نے اپنے اور عمرو بن عاصؓ کے بیٹے کو سزا دلوا کر اس کا ثبوت مہیا کر دیا تھا۔ عادل اور فقیہ لوگوں کو قاضی مقرر کیا جاتا تھا اور حق دار کو اس کا حق دلوایا جاتا تھا۔

اس عہد کے خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ خلفاء راشدین نے جمع قرآن (۱۰) کا انتظام تو کیا لیکن حفاظتِ قرآن کے خوف سے نہ تو احادیث لکھنے کی عمومی حوصلہ افزائی کی (اگرچہ کچھ چیزیں لکھی ہوئی موجود تھیں) اور نہ ہی صحابہ نے اپنی فقہی آراء کو مدون کیا تاہم اس کے باوجود فقہی لحاظ سے دو نقطہ ہائے نظر اس عہد سے ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں ایک یہ کہ نصوص قرآن و حدیث کے ظواہر پر عمل کیا جائے اور دینی امور میں غلطی سے بچنے کی خاطر اجتہاد و رائے سے امکانی حد تک گریز کیا جائے۔ اس نقطۂ نظر کے حامل تھے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور زید بن ثابتؓ وغیرہ، دوسرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ چونکہ شریعت کے احکام مبنی بر علل ہیں اس لئے ان علل پر غور کر کے نئے مسائل میں ان کی تطبیق کی جا سکتی ہے (اگرچہ وہ بھی اس کو عملی واقعات اور مشکلات تک ہی محدود رکھتے تھے اور وہ بھی بصد احتیاط) اس نقطۂ نظر کے حامل تھے حضرت عمرؓ حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہ چنانچہ خلفاء راشدین خصوصاً حضرت عمرؓ کے زمانے میں جو بعض تبدیلیاں ہوئیں وہ خدانخواستہ کسی قرآنی و نبوی حکم کا نسخ نہ تھیں بلکہ وہ حالات کے بدلنے یا زوالِ علت کے سبب سے تھیں مثلاً تین طلاقوں کا نفاذ، مولفۃ القلوب کا خاتمہ، عورتوں کو مسجد جانے سے روکنا وغیرہ۔

بہر حال یہی دونوں نقطۂ نظر تھے جو بعد میں "مدرسہ اہل الحدیث" اور "مدرسہ اہل الرائے" کی صورت میں نمودار ہوئے۔

عصرِ ما قبل التدوین

سیاسی اختلاف اور کشمکش کی بنیاد تو خلافتِ راشدہ ہی میں پڑ گئی تھی جب حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مظاہرے اور ہنگامے ہوئے، امیر معاویہؓ حضرت علیؓ کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے نیز خوارج کا فرقہ وجود میں آیا لیکن حضرت علیؓ کی زندگی تک خلافت منہاجِ نبوت پر قائم رہی، ان کی شہادت کے بعد سیاسی حالات نے جو رخ اختیار کیا، اس کے برے اثرات فقہ پر

بھی ظاہر ہوئے ۔ ان حالات کی تلخیص یہ ہے کہ بنو اُمیہ قوم کی مرضی کے بغیر تلوار کے زور سے ان پر مسلّط ہو گئے ۔ حکومت کو خلافت کی بجائے انہوں نے میراث کے نظم پر قائم کیا ، مسلمانوں کے بیت المال کو اپنے لئے حلال کر لیا، سیاسی رشوتوں کو عام کیا ، مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کی حرمت کو پامال کیا اور خوفِ خدا اور تقویٰ کی بجائے ہر قیمت پر اپنے اقتدار کو محفوظ کرنے کے لئے جائز و ناجائز کی تفریق ختم کر دی اور جب خدا کے کچھ نیک بندوں (مثلاً حضرت حسین ابن علیؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ) نے امت کو انحراف سے بچانے کی کوشش کی تو ان کو ظالمانہ طریقے سے کچل دیا ۔ ان حالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت کے علماء بنو امیہ سے مایوس ہو گئے ، انہوں نے اپنی دنیا الگ بسالی اور سیاست (جس پر دین کی بجائے دنیاداری کا غلبہ ہو گیا تھا) سے کنارہ کش ہو گئے ، دوسری طرف حکمران تھے جنہیں دین کے مقابلے میں دنیاوی مفادات عزیز تھے چنانچہ دین و دنیا کی وہ تفریق بد قسمتی سے معاشرے میں وجود میں آگئی جو اس کی تعلیمات اور اس کے تقاضوں کے خلاف تھی اور جس کے برے اثرات آج بھی صدیاں گزرنے کے باوجود معاشرے میں موجود ہیں کیونکہ یہ تفریق مستقلاً باقی رہی اور ملّت کے مزاج میں رچ بس گئی ۔ چنانچہ آج بھی بڑے بڑے صلحاء اور علماء دین و تقویٰ کا تقاضا یہ سمجھتے ہیں کہ سیاست اور دنیاوی آلائشوں سے بچ کر رہا جائے (نیز یہ اس نقطۂ نظر کے منفی اثرات تھے کہ بعد میں تصوف کا وہ سلسلہ چلا جو شریعت کے مزاج کے خلاف بھی تھا اور جس نے مسلمانوں میں خانقاہیت کے اثرات پیدا کر کے انہیں جہاد اور تسخیر کائنات سے غافل بھی کیا) اور مسلمان حکمران یہ سمجھتے ہیں کہ سیاست و حکومت کے اسرار و رموز تو ان کا کام ہے ملّا اور مولوی کو اس سے کیا مطلب یہ تو مسجد و مدرسہ میں جائیں اور اللہ اللہ کریں ۔

یہ فلسفہ بنیادی طور پر اسلام کی روح کے خلاف ہے ۔ کیونکہ اس میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں اس میں علماء اور غیر علماء اور حکمرانوں اور غیر حکمرانوں کا کوئی طبقہ یا خاندان نہیں لیکن بد قسمتی سے بنوامیہ کی سیاست کی وجہ سے یہ تفرقہ وجود میں آگیا اور اس کے برے اثرات ابھی تک ہمارے معاشرے میں موجود ہیں ۔

اس تفریق کا ایک لازمی نتیجہ یہ تھا کہ شوریٰ کا دَور ختم ہونے کی وجہ سے حکومتی سطح پر قانون سازی کا سلسلہ ختم ہو گیا ، مطلق العنان حکمرانوں کو یہ بات کسی طور گوارا نہ ہو سکتی تھی کہ ان کے ہوتے ہوئے قانون سازی (یعنی حکومتی سطح پر اجتہاد کا ادارہ) دوسروں کے ہاتھوں میں چلی

جائے دوسری طرف ملت تھی جو سیاسی طور پر ان کی تلواروں کی تابع ہو گئی تھی لیکن دین کے معاملے میں ہر چھوٹی بڑی بات میں حکمرانوں (یا دربار سے وابستہ علماء) کے فتاویٰ پر عمل کرنے پر تیار نہ تھی چنانچہ جہاں تک روز مرّہ کے معاملات میں دینی رہنمائی کا معاملہ تھا وہ اس کے لئے ان قدسی صفات فقہاء و علماء کے پاس زیادہ اطمینان کے ساتھ گئی جو مساجد و مدارس میں قرآن و حدیث کا درس دیتے تھے، اس طرح فقہ اسلامی کی نمو غیر سرکاری سطح پر ہونے لگی ۔

جہاں تک قضاء کا تعلق تھا حکمرانوں نے اس میں مداخلت نہیں کی کیونکہ اس میں ان کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہ تھا چنانچہ قاضی اسلامی شرع کے مطابق فیصلے دیتے رہے لیکن اس میں بھی خرابی یہ پیدا ہوئی کہ چونکہ کوئی مرکزی نظام موجود نہ تھا اس لیے ایک ہی جیسے معاملات میں قاضی مختلف جگہوں پر مختلف فیصلے دیتے رہے اس طرح کی صورتحال تقریباً پہلی صدی ہجری کے آخر تک جاری رہی جس کی وجہ سے اموی عہد کے مشہور دانشور ابن مقفع نے خلیفہ منصور کو ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں کہا گیا کہ اس صورتحال کا تدارک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک ہی قانونی نظام کا اہتمام کیا جائے ۔ شائد یہی نقطۂ نظر تھا جسے ملحوظ رکھتے ہوئے منصور نے امام مالکؒ سے یہ درخواست کی کہ وہ فقہ کا ایک مجموعہ مرتب کریں امام مالکؒ نے احادیث اور احکام فقہ کا یہ مجموعہ موطأ کے نام سے جمع تو کر دیا لیکن انہوں نے یہ پسند نہیں کیا کہ اسے ساری اسلامی مملکت میں نافذ کر دیا جائے کیونکہ انہیں اس امر کا احساس تھا کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے بعد سے اصحاب رسول اللہ اسلامی سلطنت میں پھیل گئے تھے، چنانچہ سلطنت کے مختلف حصوں میں کسی کے پاس کم احادیث تھیں اور کسی کے پاس زیادہ ، کہیں ترقی یافتہ تمدن کی وجہ سے مسائل کی کثرت تھی اور کہیں زندگی ابھی تک سادہ اور پیچیدگیوں سے پاک تھی ، ان حالات میں امام مالکؒ نے موطا کی تنفیذ کی حمایت نہیں کی ۔ تاہم معاشرے میں ایک قانونی خلا موجود تھا جسے حضرت امام ابو حنیفہؒ نے محسوس کیا اور اسے پورا کرنے کی غیر رسمی لیکن بھرپور اور عمدہ کوشش کی ، اور فقہ اسلامی کو غیر سرکاری سطح پر مدون کیا ، پھر ان کے شاگردِ رشید امام ابو یوسف نے قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کیا اور حنفی فقہاء کو قاضی مقرر کروا کے اس قانونی خلا کو پر کر دیا ۔

اس مرحلے کا ایک اور امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں احادیث کی خوب اشاعت ہونا شروع ہو گئی ۔ صحابہ کرام کے اوّلین دَور میں اس کی بہت زیادہ ضرورت بھی نہ تھی اور کچھ حفظِ قرآن کا تقاضا بھی تھا لیکن اب ان دونوں باتوں کی احتیاط کی ضرورت نہ تھی بلکہ اسلامی سلطنت کی

وسعت اور مسائل کی کثرت کی وجہ سے اس چیز کی ضرورت تھی کہ احادیث کو عام کیا جائے چنانچہ یہ ہو گیا لیکن اس کے ساتھ ہی وضعِ احادیث کا دروازہ بھی کھل گیا کیونکہ سیاسی اور مذہبی اختلافات کی کثرت بھی واقع ہو چکی تھی ، سیاسی اختلاف کا سبب امت کا شیعہ ، خوارج اور جمہور میں بٹ جانا تھا ، شیعہ اپنے آپ کو محبانِ علیؓ سمجھتے تھے اور خلافت کو آلِ علیؓ کا حق سمجھتے تھے ۔ خوارج خلافت کو جمہور امت کے لئے عام سمجھتے تھے ، جبکہ جمہور اس وقت امویوں کی حکومت پر طوعاً و کرہاً رضامند ہو چکے تھے اور ہر کوئی اپنے آپ کو برحق ثابت کرنے کے لئے حدیث سے سند لانا چاہتا تھا ۔ تاہم اس کے ساتھ محدثین نے حفظ و تدوینِ حدیث کا اہتمام کرنا بھی شروع کر دیا اور خود ان لوگوں میں سے بھی جو کہ اصلاً عرب نہ تھے بڑے بڑے علماء اور محدثین پیدا ہوئے ۔

دوسری طرف مذہبی اختلافات کا بڑا سبب فقہ میں اہل الرائے اور اہل الحدیث کے دو مستقل نقطہ ہائے نظر کا بن جانا تھا، جن لوگوں کو ترقی یافتہ تمدن اور کثرت مسائل کا سامنا تھا وہ قیاس و استنباط پر مجبور تھے مثلاً کوفہ و بصرہ کے لوگ ، اور دوسری طرف جو لوگ حجاز میں تھے جہاں زندگی سادہ اور پیچیدگیوں سے مبرا تھی اور مقابلتاً احادیث کی اشاعت بھی وہاں زیادہ تھی ، انہیں اجتہاد و استنباط کی کم ضرورت پڑتی تھی اور وہ ظاہر النصوص پر عمل کرتے ہوئے گزارا کر سکتے تھے ۔ نصوصِ قانون کی تعبیر و تفسیر میں یہ اختلاف عالمی طور پر مشہور اور انگریزی میں Literal interpretation اور Liberal interpretation کہلاتا ہے ۔

دورِ تدوین

پہلی صدی ہجری کے بعد عدالتی نظام جس خلا سے گزر رہا تھا اور شورائی اجتہاد کا سلسلہ حکومتی سطح پر ختم ہو جانے کے بعد جس طرح غیر رسمی اور انفرادی سطح پر مجتہدین کے ذریعے معاشرے کے مسائل جس انداز سے حل ہو رہے تھے ظاہر ہے کہ یہ سلسلہ مستقل طور پر اس طرح نہیں چل سکتا تھا اور فطری طور پر ارتقاء کا اگلا مرحلہ آنے والا تھا چنانچہ یہ مرحلہ آیا اور جس چیز نے اس نمو کے لئے راستہ ہموار کیا وہ "اسلامی تہذیب و تمدن" کی ہمہ جہتی ترقی تھی -- یہ تمدنی اور تہذیبی ترقی خواہ بعض لوگوں کی رائے میں اسلام کے نقطۂ نظر سے معیاری نہ ہو لیکن اس نقطۂ نظر سے اہم ہے کہ مسلمانوں نے جس معاشرے اور مظاہر تمدن کا خاکہ ابھارا وہ بہرحال اسلام سے منتسب تھا اور ہے ۔ اگر ہم میں سے بعض اپنی رائے میں اسے اس معیار کے مطابق نہیں

پاتے جس کا نمونہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آپؐ کے خلفاء راشدینؓ نے چھوڑا تو بھی جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے وہ اسے اسلام کا نمائندہ معاشرہ ہی کہیں گے ۔ تو ہم کہہ رہے تھے کہ عباسی سلطنت کا دور مسلمانوں کا عہدِ زرین کہا جاتا ہے ، بہت سے ممالک فتح ہو چکے تھے اور مسلمان سلطنت کی سرحدیں اندلس سے لے کر ترکستان تک پھیلی ہوئی تھیں ، بڑے بڑے شہر وجود میں آچکے تھے صرف بغداد کی آبادی بیس لاکھ سے تجاوز کر رہی تھی ، تجارت ، زراعت اور صنعتیں ہر سو پھیلی ہوئی تھیں اور لوگ خوشحال تھے ۔اس ماحول میں علمی ترقی بھی خوب ہوئی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ ، بصرہ ، کوفہ ، دمشق ، بغداد اور فسطاط وغیرہ علمی مراکز بن چکے تھے اور یہاں کی مساجد جامعات کا درجہ اختیار کر چکی تھیں ، اس علمی رونق کو جس چیز نے بڑھایا وہ نو مسلموں (موالیوں) کا اسلامی علوم میں رسوخ تھا وہ پرانی تہذیب اور تمدن کے حامل تو تھے ہی اور اسلامی علوم کی تحصیل نے ان کے جوہر کو صیقل کر دیا ، پھر رومی اور فارسی علوم خصوصاً منطق اور فلسفہ وغیرہ کی کتب کا ترجمہ ہوا اور مسلمان اہلِ فکر پر اس کے اثرات پڑنا شروع ہوئے ، عباسی خلفاء نے اس علمی حرکت کی بہت حوصلہ افزائی کی اور مترجمین کو گرانقدر مشاہرے اور انعامات پر دیئے ، نیز ان کے لیے بڑے بڑے کتب خانے بنوائے ۔

اس دنیوی اور مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ، قرآن مجید کو حفظ کرنے کا ذوق بڑھا اور مختلف قراتوں نے منضبط صورت اختیار کی ، پھر علماء نے حدیث کی تدوین کا پورا پورا حق ادا کر دیا ، شروع شروع میں احادیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کے آثار اکٹھے ہی مدون کر دیئے جاتے تھے (جس کی مثال موطأ امام مالک ہے) پھر مسانید کا رواج شروع ہوا یعنی ایک صحابی سے جتنی بھی روایتیں منقول ہوں ان سب کو یکجا کر دیا جائے ، پھر آخر میں تیسری صدی کے وسط میں محدثین نے احادیث کے مجموعہ کو بڑی چھان پھٹک کے بعد اس ترتیب میں مدون کیا جو آج صحاح ستہ وغیرہ کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں اور جرح و تعدیل کے فن نے اس میں ان کی بڑی مدد کی ۔

فقہی نقطۂ نظر سے اس زمانے میں جو کام ہوا اس کے کئی اہم پہلو ہیں ، ایک تو یہ کہ فقہ کی تدوین ہوئی اور وہ بھی اس طریقے سے جو اپنی مثال آپ ہے اور غیر سرکاری مجلس علماء کے ذریعے ، اس کے بانی امام ابو حنیفہ تھے جنہوں نے اپنے ممتاز شاگردوں اور دوسرے علماء کو جمع کیا اور تقریباً بیس برس تک ایک ایک معاملہ لے کر اس پر بحث کی گئی اور آراء و نتائج کو مدون کیا گیا ، دوسرے علماء اور فقہاء نے بھی یہ کام کیا جن میں سے کچھ بڑے علماء کے مذاہب (مثلاً

مذہبِ امام اوزاعی ، امام طبری اور داؤد ظاہری وغیرہ) تو مرورِ زمانہ کے ساتھ فنا ہو گئے اور جو وقت کا دباؤ اور امتحان پاس کر گئے ان میں سے چار زیادہ مشہور ہیں یعنی مذہب امام ابو حنیفہ ، امام شافعی ، امام مالک اور امام احمد بن حنبل ۔ ان میں سے حنفیہ اجتہاد کی مختلف صورتوں کے کثرت استعمال کی وجہ سے مشہور ہیں اور حنبلی ظاہر النص کے تمسک میں شدت سے کام لیتے اور اجتہاد سے بچتے ہیں جبکہ شافعیہ اور مالکیہ دونوں کے بین بین ہیں ۔ چونکہ یہ زمانہ تدوین کا تھا اس لئے آراء کی تمحیص و تنقیح کی مختلف صورتیں عروج پر تھیں مثلاً مناظرے ، مجادلے اور مناقشے ، زبانی بھی اور بعض اوقات تحریری بھی ۔

پھر اس زمانے میں نہ صرف یہ کہ فقہی آراء مدون ہوئیں بلکہ علمِ اصول فقہ بھی وجود میں آیا اور اجتہاد (استنباط و قیاس وغیرہ) کے اصول و قواعد وضع ہوئے ، امام ابو حنیفہ کے دو ممتاز شاگردوں قاضی ابو یوسف اور محمد بن الحسن نے بھی اس موضوع پر لکھا لیکن وہ بد قسمتی سے ہم تک نہیں پہنچ سکا تاہم امام شافعی نے جو کچھ اس موضوع پر لکھا وہ "الرسالہ" کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے اور وہی اصولِ فقہ کے بانی مدون مانے جاتے ہیں اگرچہ چاروں معروف فقہی مذاہب کے سرکردہ علماء نے اپنے اپنے اصول وضع کیے ہیں جو ان مذاہب کی اصولِ فقہ کی کتب میں موجود ہیں ۔

اس زمانے میں جو اجتہاد ہوا اور جو فقہی آراء مدون ہوئیں وہ نہ صرف ان مسائل کا احاطہ ہی کرتی تھیں بلکہ واقعات کو فرض کر کے ان کے جوابات دیئے جاتے تھے اس کو فقہ تقدیری کہتے ہیں اس طرح فقہی آراء کا ایک عظیم ذخیرہ وجود میں آگیا جو بظاہر ایک لمبے عرصے تک کے لیے کافی تھا ۔

فقہی آرا کی تدوین اور اس کے مجموعوں کے مشتہر ہو جانے کا یہ فائدہ ہوا کہ عدالتی نظام کا خلا ختم ہو گیا ، کیونکہ اہلِ معاملہ یہ جان لیتے تھے کہ قاضی کس فقہی مسلک سے تعلق رکھتا ہے اور کیسے فیصلہ دے گا ، پھر انہی دنوں قاضی ابو یوسف نے خلیفہ ہارون رشید کی طرف سے قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کر لیا اور ان کی وجہ سے حنفی قاضیوں کا تقرر ہونے لگا اور اس طرح عدالتی کاروائی سہل اور آسان ہو گئی ۔

یہاں اس طرف اشارہ کرنا بھی بے جا نہ ہو گا کہ عباسی خلفاء نے اس علمی و فقہی حرکت کی عموماً حوصلہ افزائی کی ، وہ علماء کی قدر و منزلت کرتے تھے اور ان کی خدمت کو سعادت سمجھتے تھے تاکہ ان کی حکومت اور سلطنت اس سے متاثر نہ ہو چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ امام مالک کو منصور نے

موطأ مدون کرنے کو کہا اور ہارون رشید اپنے بیٹے ان کے پاس تعلیم کے لیے بھیجتا رہا لیکن جب انہی امام مالک نے طلاق مکرہ کے خلاف فیصلہ دیا تو انہیں کوڑوں سے مارا پیٹا گیا (عباسی حکمران بیعت لیتے وقت انقضاء عہد کی صورت میں طلاق کا حلف لیتے تھے) لیکن علماء عمومی طور پر اس روش پر قائم رہے کہ حکمرانوں سے ربط و ضبط نہ رکھا جائے چنانچہ امام ابو حنیفہ نے کوڑے کھائے اور جیل چلے گئے لیکن قضاء قبول نہیں کی ، یہی رویہ دوسرے جلیل القدر فقہاء کا تھا ۔

ان فقہی مذاہب کے ازدہار و انتشار کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بعد کے علماء و فقہاء ان مذاہب سے منسلک ہو گئے اور وہ ان میں اضافہ کرتے رہے اور تدوین و استنباط کے عمل کو مختلف جہتوں سے صیقل کرتے گئے نیز ان کا علمی اور مادی رسوخ بھی اس سلسلے میں نافع ثابت ہوا اور جس چیز نے اس کام کو وسعت و اہمیت بلکہ حرفِ آخر بنا دیا وہ عوام کی ایک کثیر تعداد کا ان مذاہب سے منسلک ہو جانا ہے چنانچہ اس وقت بھی عالمِ اسلام کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد فقہ حنفی کی پیرو ہے جبکہ دوسری فقہیں بھی مختلف اسلامی ممالک میں موجود ہیں ۔

دورِ تقلید

عباسی خلافت لمبے عرصہ تک عروج کا زمانہ دیکھ کر بالآخر کمزور ہو کر انتشار کا شکار ہو گئی ، اندلس میں اموی ، مصر میں اخشیدی ، شمالی افریقہ میں فاطمی اور مشرق میں سامانی سلطنتیں قائم ہو گئیں خود عراق میں جو کہ خلافت کا مرکز تھا بنو بویہ اور پھر سلاجقہ نے اپنے جھنڈے گاڑ دیئے اور خلافت بطورِ تبرک باقی رہی تا آنکہ ہلاکو خان نے ۶۵۶ھ میں بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی ۔ بعد میں عثمانی ترکوں نے بزم آرائی کی حتیٰ کہ پہلی جنگ عظیم میں مصطفیٰ اتاترک نے اس بیمار خلافت کی قبا چاک کر دی اور "جدید" یعنی لادین اور مغرب پرست ترکی کی بنیاد رکھی ۔

شروع شروع میں خلافت سے الگ ہو کر جو سلطنتیں بنیں وہ بھی جاندار تھیں ، وہاں بھی علماء کی قدر و منزلت ہوتی تھی اور علم پروری سعادت سمجھی جاتی تھی لیکن پھر بھی فقہاء میں وہ روح باقی نہ رہی جو کہ پچھلے دَور کا طرۂ امتیاز تھی ، جس نے امام ابو حنیفہ سے یہ کہلوایا تھا کہ "(صحابہ کے بعد) جیسا اسلاف کو حقِ اجتہاد ہے ویسا ہی ہمیں ہے (۱۱) (یعنی ہم ان کی تقلیدِ محض کیوں کریں)" اور جس نے امام مالک سے یہ کہلوایا تھا کہ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا یہ کسی کا

حق نہیں کہ ہم بلاچون وچراں اس کے قول کو اختیار کریں اور اپنی رائے چھوڑ دیں" (۱۲) اب بھی اجتہاد ہوتا تھا لیکن اپنے مسلک اور فقہی مدرسہ کی حدود کے اندر ، آزادانہ (یعنی قرآن و سنت سے براہِ راست استنباط و قیاس کے ذریعے) نہیں ۔ پھر یہ مرحلہ بھی گزر گیا اور علماء ترجیح و تخریج مسائل پر قناعت کر گئے اجتہاد کو اتنے اونچے تخت پر بٹھا دیا گیا کہ جسے دیکھا تو جا سکے لیکن چھوا نہ جا سکے ، بلکہ بعض علماء نے اس پر باقاعدہ کتابیں لکھیں کہ اب اجتہاد کے دروازے بند ہو چکے ہیں اور بعض نے یہاں تک کہہ دیا کہ عدم اجتہاد پر اجماع ہو چکا ہے ۔ ایسا کیوں ہوا ؟ اس کے مختلف اسباب ہیں ، خود سیاسی عدم استحکام اور انتشار بھی اس کا ایک سبب ہے کیونکہ جب حکومتیں مضبوط تھیں تو اگرچہ حکمران ، علماء کو سیاسی امور میں مداخلت یا بالادستی کا موقع دینے کو تیار نہ تھے لیکن اس ایک بات کے علاوہ وہ فقہاء کی قدر و منزلت کرتے تھے ، ان کو بحث و تحقیق کی سہولتیں بہم پہنچاتے تھے اور اکتسابِ رزق کی جد و جہد سے بے نیاز رکھتے تھے جس سے علم و ادب اور فقہ و تحقیق کے امور میں حوصلہ افزائی قدرتی بات تھی لیکن جب سیاست پر ادبار چھا گیا اور حکومتوں میں ضعف آگیا تو علم و فقہ کے میدان میں بھی وہ ہمہ ہمی اور وہ رونقیں نہ رہیں جو کبھی اس کا طرۂ امتیاز تھیں ۔ اس کا دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ اجتماعی اجتہاد یا شورائی اجتہاد کا جو ادارہ خلافتِ راشدہ کے بعد سے ٹوٹا ہے تو پھر کبھی نہیں بن سکا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اجتہاد اور تدوین فقہ کا سارا کام مدرسوں اور مسجدوں میں ہوا ، اس کا فائدہ جہاں یہ ہوا کہ یہ کام حکمرانوں کی خواہشوں ، مصلحتوں اور پابندیوں کی گرفت سے آزاد رہا ، وہاں نقصان اس کا یہ ہوا کہ یہ کام منضبط طور پر نہ ہو سکا ، اجتہاد کی ہر ایک کو کھلی چھٹی تھی لہذا علماء نے یہ دیکھ کر کہ اگر کم علم اور کم سواد لوگوں کو اجتہاد کی بے قید آزادی ملی رہی تو یہ بات ایک بڑے فتنے کو جنم دے گی یہ کہنا شروع کر دیا کہ اب اجتہاد کی ضرورت ہی نہیں ، جو سرمایۂ فقہ و آگہی اس وقت موجود ہے وہی ہمارے لئے کافی ہے ۔ یہ بات خاص طور پر دلوں کو اس لئے لگتی تھی کہ عہدِ زریں میں فقہاء نے صرف ان مسائل کا حل نہیں بتایا تھا جو ان کو درپیش تھے بلکہ انہوں نے دفتروں کے دفتر ان مسائل پر بھی لکھے تھے جو ابھی پیش نہیں آئے تھے لیکن بعد کے زمانے میں پیش آسکتے تھے (۱۴) ۔ اس طرح فقہی مسائل کا ایک عظیم الشان ذخیرہ وجود میں آگیا تھا جس کی موجودگی میں نئی کوششوں کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی ۔

تقلید کے مستحکم ہونے کا ایک بڑا سبب عدالتی نظام تھا ، شروع کی صدیوں میں قاضی عام طور پر ایسے صاحب علم آدمی کو مقرر کیا جاتا تھا جو مجتہد ہوتا تاکہ اگر کسی مسئلے میں قرآن و

سنت سے براہِ راست حکم نہ ملے تو وہ قیاس و استنباط سے کام لے سکے لیکن [illegible] جو قاضی مقرر کیا جانے لگا جن کا تعلق کسی خاص مدرسۂ فقہ سے ہوتا یعنی اگر خلیفہ یا قاضی القضاۃ حنفی ہوتا تو قاضی بھی عموماً حنفی ہوتے یا اگر حکمران (یا قاضی القضاۃ) شافعی ہوتا تو وہ شافعی قاضی مقرر کرتا عام لوگوں کا اس میں فائدہ یہ تھا کہ چونکہ فقہی مذاہب مدون ہو چکے تھے اور مختلف م[illegible] میں کسی مذہب کا نقطۂ نظر معلوم کرنا آسان تھا اس لئے اصحاب معاملہ کو اس میں سہولت رہتی ۔

تقلید کے مستحکم ہونے اور فقہی مدارس کے جڑیں پکڑنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ ابتدائی مرحلے کے بعد جس دَور کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں بھی ان فقہی مذاہب میں بڑے بڑے جلیل القدر عالم پیدا ہوئے جن کے علم و زہد کی وجہ سے عوام ان پر اعتماد کرتے تھے اور حکمران ان کے مشورے سے قاضیوں کا تقرر کرتے تھے اور خود ان علماء کی کسر نفسی کا یہ عالم تھا کہ اجتہاد کا اہل ہونے کے باوجود ائمہ مذاہب کے رسم کردہ دائرۂ کار کے اندر رہتے ہوئے کام کرتے تھے، نیز انہوں نے فقہی مذاہب میں پہلے سے کئے ہوئے کام کو بھی مزید آگے بڑھایا ، ان سے مزید مسائل کا استخراج کیا ، ان کی کتب کی شرحیں لکھیں اس طرح فقہی مذاہب عوامی زندگی میں داخل ہو کر مستحکم ہو گئے ۔

بہرحال جن حالات نے اجتہاد کو ختم کر کے تقلید کو رواج دیا ان میں سے چند ایک اہم عوامل کا ذکر ہم نے کیا ہے ، اگرچہ یہاں یہ بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے ، (جیسا کہ اشارۃً ذکر ہو چکا ہے) کہ اجتہاد سے تقلید کا یہ سفر اچانک واقع نہیں ہوا بلکہ بتدریج ہوا پہلے مجتہد فی المذہب آئے ، پھر اصحاب ترجیح ، اصحابِ تخریج اور آخر میں تقلید محض ۔ اسی طرح اس مرحلے میں تدوین فقہ بھی کئی مرحلوں سے گزری پہلے فقہ کی کتابیں مع ادلہ کے تفصیل سے لکھی جاتی تھیں پھر اس کا خاتمہ ہوا ، پھر کتابوں کو مختصر کر کے لکھا جانے لگا حتیٰ کہ وہ چیستان بن کر رہ گئیں اور انہیں سمجھنا مشکل ہو گیا ، جب یہ صورت ہوئی تو ان کی شرحیں اور حاشیے لکھے جانے لگے ۔ اسی طرح ایک کام جمع فتاویٰ کا ہوا جو اپنی کمزوریوں کے باوجود فائدے سے خالی نہیں ۔

دورِ جہالت

بارہویں صدی ہجری میں فقہ اور فقہاء میں جمود نیز مغربی تہذیب کی برتری نے حکمرانوں کی ذہنی مرعوبیت یہاں تک پہنچ گئی کہ انہوں نے "ترقی" اور "روشن خیالی" کے نام پر

شریعت اسلامی کو چھوڑ کر مغربی قوانین کی پیروی شروع کر دی ، چنانچہ مقر خلافت (ترکیا) میں حکومت نے ۱۸۳۹ء میں "تنظیمات" کے نام سے نئے سرے سے قانون سازی کا ایک منصوبہ بنایا جس کی اساس شریعت اسلامی کی بجائے مغربی خصوصاً فرانسیسی قوانین پر تھی ، چنانچہ اس طریقے پر ۱۸۴۰ء میں فوجداری قانون کو منظم کیا گیا ، قانون تجارت ۱۸۵۰ء میں بنایا گیا اور ۱۸۸۰ء میں سول کورٹس کے پروسیجرز وغیرہ بھی اسی طریقے سے بنا دیئے گئے (۱۵) ۔

مصر میں جب محمد علی نے اپنی حکومت بنائی تو شرعی عدالتیں ختم کر کے سول عدالتیں قائم کی گئیں اور ان کے لئے جو مجموعہ قانون تیار کروایا وہ حرفاً فرانسیسی قوانین سے لیا گیا تھا ۔ اسی طرح جب ہندوستان میں انگریزوں نے اپنے زیرِ تسلّط علاقے پر شرعی قوانین کی حکمرانی ختم کی تو باقی مسلمان ریاستوں نے بھی دیکھا دیکھی شرعی قوانین ختم کر دیئے (۱۶) دوسری طرف رضا شاہ نے ایران میں اور مصطفی کمال اتاترک نے خلافتِ عثمانیہ کے بعد شرعی قوانین مکمل طور پر ختم کر دیئے ، ہم کہتے ہیں کہ اسلامی قانون کی تاریخ کا یہ ایک بہت بڑا سانحہ ہے جو اس دور میں رونما ہوا کہ خود مسلمان حکومتوں نے شرعی قوانین ختم کر دیئے اور اپنی رضا و رغبت سے دوسری قوموں (غیر مسلموں) کے قوانین کی پیروی شروع کر دی اور یہ حالت بڑی حد تک اب بھی باقی ہے اسی لیے ہم نے اسے "دور جہالت" سے تعبیر کیا ہے ، اگر انگریزوں اور فرانسیسیوں نے مسلمان ممالک پر قبضہ کر کے وہاں سے شرعی قوانین ختم کر دیئے تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں کہ دشمنوں سے تو دشمنی ہی کی توقع کی جاتی ہے دوستی کی نہیں لیکن یہاں تو کیفیت یہ ہے کہ :

من از بیگانگاں ہر گز نہ نالم
کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد

پچھلی صدیوں میں انفرادی انحراف اور ضلال کی اکا دکا مثالیں تو ملتی ہیں لیکن بحیثیتِ مجموعی ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مسلمان حکمرانوں اور مسلمان حکومتوں نے اپنی مرضی سے اور علی الاعلان شرعی قوانین چھوڑ کر دوسرے قوانین اپنا لئے ہوں ، کیونکہ مسلمان ہوتے ہوئے اس کا تصور ہی محال ہے ، قرآن نے صاف کہا ہے کہ "جو لوگ اللہ کے احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ فاسق ہیں" (۱۷) "وہ ظالم ہیں" (۱۸) ، اور "وہ کافر ہیں" (۱۹) لیکن ظلم اور جہالت کا یہ دَور یہیں نہیں تھا بلکہ ہماری ذلّت و نکبت کی انتہا یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ آزادی ملنے کے بعد بھی مسلمان ممالک شریعت کو اپنانے کو تیار نہیں بلکہ اگر کوئی دین کا تابع گروہ انہیں اس طرف متوجہ بھی کرتا ہے تو وہی گردن زدنی ٹھہرتا ہے :

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

اور تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مغربی استعمار جو کہ ڈیڑھ ، دو صدی تک مسلمان علاقوں پر مسلّط رہا تو اس نے نہایت عیاری اور منصوبہ بندی سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کے سارے ادارے تباہ کر ڈالے ، ان کا عدالتی اور تعلیمی نظام برباد کر ڈالا اور پورا تہذیبی ڈھانچہ ہلا ڈالا ، پھر اس راکھ پر اس نے نئی عمارت تعمیر کی ، اپنی مرضی کے تعلیمی ادارے کھولے ، مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں کو زَر اور زمین دے کر توڑا ، انہیں جاگیریں اور ملازمتیں دیں اور اس طرح ایک ایسا مراعات یافتہ طبقہ پیدا کیا جو ان کا وفادار اور ان کی تہذیب کا رسیا تھا اور اپنے آقائے نعمت کی خیر خواہی میں آخری حد تک جانے کو تیار تھا ، پھر جب ان استعماری حکمرانوں کو یہ ملک چھوڑ کر جانا پڑا تو وہ یہ اہتمام کر کے گئے کہ ان کا تربیت یافتہ اور ان کی تہذیب کا اندھا مقلّد یہ طبقہ ہی برسرِ حکومت رہے ۔ چنانچہ مغربی استعمار جہاں سے بھی گیا وہ اپنے پیچھے سیاستدانوں اور بیوروکریٹس (فوجی اور سول دونوں) کا ایک ایسا طبقہ چھوڑ کر گیا جو شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار تھا ، جو یورپیوں اور امریکنوں سے زیادہ ان کی تہذیب کا رسیا تھا اور شریعت کی مخالفت میں اپنے مغربی آقاؤں سے زیادہ آگے جا سکتا تھا ۔

پھر قدرت کا انتظام دیکھئے کہ اس دور میں جب کہ مسلمان آزاد ہو رہے تھے اس نے مسلمانوں کے اندر ایسے جاندار مسلمان اٹھا دیئے جو حق کا علم لے کر کھڑے ہو گئے اور جن کا نعرہ یہ تھا کہ اسلامی شریعت کو بہر حال معاشرے میں نافذ اور غالب کیا جانا چاہئے ۔ عرب ملکوں میں اخوان المسلمون ، پاک و ہند میں جماعت اسلامی اور انڈونیشیا میں ماشومی پارٹی اس کی زندہ مثالیں ہیں لیکن خود مسلمان حکمرانوں نے ان تحریکوں کو کچل دینے کی پوری پوری کوشش کی اور چونکہ مسلمان عوام اپنے عقیدے کی بناء پر اس امر پر مجبور ہیں کہ شریعت کی بحالی کے اس مطالبے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں چنانچہ ایسے نام نہاد حکمرانوں اور عام مسلمان پبلک کے درمیان دوری بڑھتی گئی اور ان میں بجائے اس کے کہ مفاہمت ہوتی جو ملکی ترقی اور بہتری کے کام آتی ان کے درمیان ایک ایسی کشمکش شروع ہو گئی جس کی کوئی انتہا نہیں اور جس کی وجہ سے مسلمان اقوام کی تعمیری قوتیں رائگاں جا رہی ہیں اور دشمن اس پر بغلیں بجا رہے ہیں ۔

پھر ان حالات میں جن اسلامی ممالک کے اندر کچھ اسلامی فقہ و شریعت کے نقطۂ نظر سے ایجابی حرکت ہوئی ہے مثلاً مصر، سوڈان اور پاکستان میں ، وہاں بھی یہ برگ و بار نہیں لا سکی اس کی

ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ علماء جو کہ شریعت سے واقف ہیں صدیوں سے ایک خول میں بند ہیں ، انہیں قصداً جہاں بانی سے دور رکھا گیا ہے اور اب انہیں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مُلّا ، مولوی لوگ اسرارِ حکومت کیا جانیں (۲۰) ۔

دوسری طرف مغربی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں جنہیں دنیاوی علوم کی کچھ ٹوٹی پھوٹی خبر تو ہے لیکن دین کے علم اور تربیت سے وہ بالکل بے بہرہ ہیں، جب وہ اسمبلیوں میں مسند اقتدار پر بیٹھتے ہیں اور جب شریعت ان کے ذریعے نافذ کروائی جاتی ہے تو عقل سر پیٹ کر رہ جاتی ہے اور شریعت کی گاڑی ان دونوں انتہاؤں کے درمیان پھنس کر رہ جاتی ہے ۔ اس کا حل بڑا سادہ ہے اور وہ یہ کہ ایسا درمیانی طبقہ پیدا کیا جائے جو دین سے باخبر ہو تو دنیا سے بھی بے خبر نہ ہو ، شریعت کو جانتا ہو تو عصری قانونی تقاضوں پر بھی اس کی نظر ہو، ایسے آدمی اب بھی موجود ہیں لیکن کم ہیں اور کونوں کھدروں میں ہیں ، ان کو آگے لایا جائے اور ایسا درمیانی طبقہ پیدا کرنے کا ایک کریش پروگرام تیار کیا جائے تو ایک معقول مدت کے اندر ایسا گروہ تیار کیا جا سکتا ہے جو اسلام کے عدالتی اور قانونی نظام کو اسلامی اور عصری بنیادوں پر چلا سکے لیکن سوال تو یہی ہے کہ یہ کام کون کرے؟ یہ کام صرف ایک ایسی حکومت ہی کر سکتی ہے جو اسلام کے لئے مخلص ہو، مسلم عوام کو بہلانے کے لئے اسلامی نظام کے خالی نعرے ہی نہ لگاتی ہو بلکہ اس کے لیے دل و جان سے کام کرے اگر خلوص اور محنت دونوں صفات جمع ہو جائیں تو یہ کام کچھ ایسا ناممکن بھی نہیں ۔

حواشی

۱۔ محمد رضا۔ علیؓ بن ابی طالب
۲۔ مسند احمد حنبل ج ۴ ص ۲۵۵
۳۔ مثلاً جب آپؐ نے عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھی تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اس فعل کی تائید نہیں فرمائی چنانچہ فرمایا ﴿ ولا تصلّ علی احد منھم مات ابدا ، ولا تقم علی قبرہ ، انھم کفروا باللہ ورسولہ وماتوا وھم فاسقون ﴾ التوبہ ۔ ۸۴
۴۔ چنانچہ فرمایا ﴿ وما کان لنبی ان یکون لہ اسری حتی یثخن فی الارض ، تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الآخرہ واللہ عزیز حکیم ۔۔ لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذ تم عذاب عظیم ﴾ (الانفال ۶۸۔۶۷)
۵۔ القسطلانی، ارشاد الساری شرح صحیح البخاری ج ۸ ص ۳۸۴ طبع بغداد
۶۔ ابو یوسف ، کتاب الخراج ص ۲۷ طبع القاہرہ
۷۔ چنانچہ ارض سواد کے قضیہ میں جب معاملے نے طول پکڑا تو یہ رجحان ہوا کہ انصار مدینہ کے شیوخ و علماء پر بات چھوڑ دی جائے چنانچہ انہیں بلا کر حضرت عمرؓ نے کہا "فانی واحد کاحد کم انتم الیوم تقرون الحق" "یعنی میں تم میں سے ایک عام آدمی کی طرح ہوں ۔ فیصلہ تمہی لوگوں کو کرنا ہے" مطلب یہ کہ ضروری نہیں کہ تم میری رائے ہی کو اختیار کرو بلکہ تم اپنی آزاد مرضی سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو ۔
۸۔ ملاحظہ ہو تفصیلات کے لئے کتاب الخراج لابی یوسف
۹۔ حاشیہ الحموی علی الاشباہ والنظائر ج ۱ ص ۱۳۹
۱۰۔ المدخل فی التعریف بالفقہ الاسلامی ، محمد مصطفیٰ شلبی ، ص ۱۲۵ طبع بیروت
۱۱۔ تاریخ التشریع الاسلامی ، د/ محمد یوسف موسیٰ ص ۱۴۲
۱۲۔ رواہ الحاکم والبیہقی عن الشافعی
۱۴۔ احمد امین ، فجر الاسلام ص ۲۹۷
۱۵۔ علی علی منصور ، المدخل للعلوم القانونیہ والفقہ الاسلامی ص ۱۲۷ طبع بیروت
۱۶ صبحی محمصانی، اوضاع الشریعہ فی البلاد العربیہ، ص ۱۱۹
۱۷۔ المائدہ ۔ ۴۷
۱۸۔ المائدہ ۔ ۴۵
۱۹۔ المائدہ ۔ ۴۴
۲۰۔ محمود شلتوت ، الاسلام عقیدہ و شریعہ ص ۴۴۴ طبع دار الشروق

حصہ دوم

عصری مباحث

باب چہارم

اسلام اور قانون سازی

عوام اور ان کا حق قانون سازی

پچھلے ابواب میں ہم نے اسلام میں قانون اور قانون سازی کے مفہوم اور دائرۂ کار ، نیز اس کے ماخذ اور اس کی تاریخ پر جو مختصر بحث کی ہے اس سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ قانون کے دائرے میں اسلام کا مزاج اور مفہوم کیا ہے ۔ مختصر لفظوں میں یہ کہ جس چیز کو ہم عصرِ حاضر میں "قانون سازی" کہتے ہیں اسلامی فقہ کی اصطلاح میں وہ اجتہاد کے سوا کچھ نہیں لہٰذا جن اوصاف اور قیود و شرائط کا اصولیوں نے اجتہاد کے سلسلے میں ذکر کیا ہے ان سب کا انطباق قانون سازی پر بھی ہونا چاہئے لیکن مشکل یہ ہے کہ جو سیاسی اور قانونی نظام (اور یاد رہے کہ سیاسی اور قانونی نظاموں کا ایک دوسرے سے چولی دامن کا ساتھ ہے) انگریز نے ہمارے لئے ورثہ میں چھوڑا اور جسے ہماری حکومتوں نے اسلامی عناصر کی مزاحمت کے باوجود بڑی حد تک جوں کا توں برقرار رکھا وہ چونکہ سیاست اور قانون کے مغربی تصوّرات پر مبنی ہے اس لئے وہاں نہ اجتہاد کا تصور بار پا سکتا ہے اور نہ اس کی شرائط و قیود سننے کا کوئی روادار ہے ۔ نظریاتی نقطۂ نظر کے علاوہ یہ ذاتی اور گروہی مفاد کا مسئلہ بھی ہے کیونکہ قانون سازی کو اجتہاد تسلیم کرنے کے بعد علماء کا تفوق اس میں ماننا پڑتا ہے کیونکہ موجودہ ماہرینِ قانون کی ایک بہت بڑی تعداد اسلام کے قانونی نظام سے ناواقف ہے اور اسلامی قانون کے ڈھانچے میں آسانی سے کھپ نہیں سکتی ۔ ان امور پر ہم تفصیل سے بعد میں روشنی ڈالیں گے ، اس وقت جو چیز اس تمہید کا موجب بنی وہ مغرب کے سیاسی اور قانونی نظام کا یہ تصور ہے کہ حاکمیت (Sovereignty) دراصل عوام کا حق ہے ، معاشرے اور ریاست میں عوام ہی بالاتر قوت ہیں ، حکومت انہیں کی رائے سے بنتی ہے ، انہیں کی رائے سے ٹوٹتی ہے اپنے لئے قانون بنانے کے مجاز بھی وہ خود ہی ہیں ، جس چیز کو وہ چاہیں وہ جائز اور حلال ہو گی اور جس کو نہ چاہیں وہ اسے ناجائز اور حرام قرار دے سکتے ہیں ۔ مغرب کی سیاست اور قانون کی دنیا میں یہ تصوّرات اتنے معروف اور بنیادی اہمیت کے حامل ہیں کہ اس کے لئے دلیل اور حوالے کی ضرورت نہیں اور یہی تصورات برطانیہ کے جانے کے

بعد پاکستان میں بھی منتقل ہو گئے چنانچہ قانون آزادیٔ ہند کے ذریعے جس اسمبلی کو سیاسی اقتدار منتقل کیا گیا اسے قانونی اختیارات بھی منتقل کئے گئے اور حکومت پاکستان نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں بعض ترامیم کے بعد اسے نئی اسلامی مملکت کا عارضی دستور قرار دے لیا ۔

مغرب میں چونکہ اقتدار و اختیار کا منبع عوام ہیں اس لئے وہاں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سیاسی اور قانونی اقتدار انہیں کی (یا ان کے منتخب کردہ نمائندوں کی) ملکیت ہونا چاہئے لیکن چونکہ اسلام میں یہ صورتحال نہیں اس لئے ان چیزوں کا اطلاق ایک مسلم معاشرے اور حکومت پر نہیں ہو سکتا ۔ اسلام میں قانون سازی کے سلسلے میں عوام کی حیثیت پر ہم ذیل میں روشنی ڈالیں گے ۔

۱ ۔ اسلام میں ہر قسم کے اختیار و اقتدار کی مالک اللہ تعالیٰ کی ہستی ہے وہی کائنات کا پیدا کرنے والا ہے وہی اس کا مالک اور حاکمِ حقیقی ہے اور وہی اس کو قانون دینے والا ہے ۔

﴿الا له الخلق والامر﴾ (۱)

﴿ان الحكم الا لله امر الا تعبدوا الا اياه﴾ (۲)

﴿يقولون هل لنا من الأمر من شى ، قل ان الامر كله لله﴾ (۳)

﴿ولا تقولوا لما تصف السنتكم الكذب هذا حلال و حرام ۰۰۰۰﴾ (۴)

﴿ومن لم يحكم بما انزل الله فاولئك هم الظالمون﴾ (۵)

۲ ۔ اس کائنات میں انسان کی حیثیت مالک اور خود مختار کی نہیں بلکہ خلیفہ (۶) اور عبد (۷) کی ہے ، وہ زمین میں خدا کا خلیفہ اور بندہ ہونے کی حیثیت سے خود مختار نہیں کہ جیسے چاہے زندگی بسر کرے ، جس کو چاہے حلال سمجھے اور جس کو چاہے حرام قرار دے لے ، بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ وہ ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کی بندگی کرے ، ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا مطیع اور فرمانبردار رہے ، اس کے احکام بلا چون و چراں مانے اور اپنے آقا کی خوشنودی کے لئے ہر دم کوشاں رہے ۔

۳ ۔ اللہ تعالیٰ نے بطورِ امتحان انسان کو زمین میں اچھے اور برے تصرف کا اختیار دیا ہے اور اس تصرف کی نوعیت اور حدود واضح کرنے کے لئے خود انسانوں میں سے ہی بعض کو نمونے اور ماڈل کے طور پر پیش کرنے کے لئے چن لیا ہے اور

اپنی نگرانی میں ان کے طرزِ عمل کو معیار بنا کر پیش کیا ہے ۔ انبیاء کا یہ طرزِ عمل اور خود اس کی کتاب یہ وضاحت کرتی ہے ک اس کائنات میں تصرف کے انسانی اختیارات کیا ہیں ۔ چنانچہ جہاں تک سیاسی امور کا تعلق ہے ، قرآن و سنت اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اسلام کے سیاسی مفکروں نے اس سے یہی سمجھا ہے کہ سیاسی اور حکومتی امور میں ، خدا کی بتائی ہوئی حدود کے اندر انسانوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے میں سے جس کو مناسب سمجھیں اپنا امیر چن لیں اور جب وہ ان کی مرضی کے مطابق کام نہ کرے تو اس کو اتار دیں گویا مسلمانوں کا امیر مسلمانوں کا نمائندہ ہوتا ہے ، اسے مسلمان اپنا امیر بناتے ہیں ، وہ مسلمانوں کا نمائندہ ہوتا ہے خدا کا نمائندہ نہیں ہوتا ، اسے خدا امارت کے لئے نامزد نہیں کرتا ، گویا اسلام میں پاپائیت اور مطلق العنان بادشاہی یا سیاسی ڈکٹیٹر شپ کا کوئی تصور نہیں ۔

۴ ۔ اس کے برعکس قانونی معاملات کا رخ دوسرا ہے یہاں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ انسان کو کوئی اختیار نہیں دیا بلکہ صاف صاف وضاحت کر دی ہے کہ بنیادی طور پر اس کام میں اس کا کوئی دخل نہیں (۹) ہاں نبی چونکہ زمین پر خدا کا نمائندہ ہوتا ہے اس لئے اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ خدا کی مرضی کی وضاحت کرے اور جہاں اس کا حکم موجود نہ ہو وہ اس خصوصیت کا حامل ہونے کی بنیاد پر کہ وہ اس کا نمائندہ ہے ، اس کی مرضی کو جانتا ہے ، اس کی طرف سے خصوصی علم و فہم اور نورِ بصیرت اسے میسر ہے وہ خدائی احکام کی روشنی میں قانون بنا سکتا ہے اور وہ دوسرے انسانوں پر اسی طرح واجب العمل ہوں گے جس طرح کہ وہ خدا کے احکام پر عمل کرتے ہیں کیونکہ اس حالت میں وہ اپنی ذات کی اطاعت نہیں کرواتا بلکہ اپنی اس خصوصی حیثیت کے وجہ سے اطاعت کرواتا ہے کہ اس کی اطاعت دراصل خدا کی اطاعت ہے (۱۰) ۔ قانونی امور میں خدا اور رسول کی اس غیر مشروط اطاعت کے بعد کسی انسان کو دوسرے انسان پر کوئی مطلق قانونی اقتدار حاصل نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ اقتدار خدا کی اطاعت میں ہو جیسے حاکم کو رعیت پر ، یا باپ کو اولاد پر (۱۱) اس میدان میں اس کا کام مجرد اطاعت کرنا ہے ، چنانچہ نبی کریمؐ کے اسوہ کو دیکھئے کہ آپ کو "وَ شَاوِرْهُمْ فِی الْأَمْرِ" (۱۲) کا حکم دیا گیا چنانچہ سیاسی اور تنظیمی معاملات میں آپ نے اکثر اپنے اصحاب سے مشورہ کیا اور ان کی رائے قبول

بھی کی ، لیکن کوئی ایک مثال بھی آپ کی زندگی سے ایسی پیش نہیں کی جا سکتی کہ تشریعی معاملات میں بھی آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا ہو مثلاً یہ کہ نمازیں کتنی پڑھنی چاہئیں ، روزے کتنے رکھنے چاہئیں یا وراثت کا طریقہ کیا ہونا چاہئے اور قتل کی سزا کیا ہونی چاہئے وغیرہ وغیرہ ۔

ہاں جہاں وحی موجود نہ ہوتی وہاں آپؐ تصرّف فرماتے ، آپؐ نے خود بھی اجتہاد کیا اور اپنے صحابہ سے اجتہاد کروایا بھی ، تاکہ اپنی زندگی میں ان کی تربیت ہو جائے چنانچہ جیسا کہ ہم نے تیسرے باب میں اس پر کچھ وضاحت سے روشنی ڈالی ہے کہ آپؐ کے صحابہ آپؐ کی تربیت کی وجہ سے ہی اجتہاد کے خوگر ہوئے ۔ اجتہاد کے لئے جن اوصاف و قیود کی ضرورت ہوتی ہے ان کا ذکر ہم دوسرے باب میں کر چکے ہیں اور اسلام کے قانونی مزاج کا عین تقاضا ہے کہ ہم اجتہاد سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کوئی قانون سازی نہ کریں ۔

اسمبلی کا حقِ قانون سازی

چونکہ آبادی کی کثرت کی بناء پر یہ عملاً ممکن نہیں ہے کہ عوام اپنے سیاسی اور قانونی حقوق براہِ راست استعمال کر سکیں اس لئے نیابتی جمہوریت کے تصور نے فروغ پایا ہے یعنی عوام اپنے ووٹوں سے نمائندے چنتے ہیں اور پھر یہ نمائندے پارلیمنٹ کے اندر عوام کی نمائندگی کرتے ہیں ، پارلیمنٹ میں اکثریت رکھنے والی پارٹی حکومت بناتی ہے اور اقلیتی ممبران اپوزیشن تشکیل دیتے ہیں ، عصرِ حاضر کی پارلیمنٹیں ریاست کا مقتدر ترین ادارہ سمجھی جاتیں ہیں اور قانون سازی اور حکومت کے انتظامی اور مالی امور کی نگرانی اس کے اہم فرائض سمجھے جاتے ہیں ۔

جہاں تک اسلام کے سیاسی نظام کا تعلق ہے ہم ابھی واضح کر چکے ہیں کہ اس میں عوام کی صحیح پوزیشن کیا ہے ، اب جہاں تک عوام کے نمائندہ اداروں کا تعلق ہے تو اسلام کے سیاسی نظام میں مجلس شوریٰ کا تصور موجود ہے ; کیوں کہ مسلمانوں کو مشاورت کا حکم دیا گیا ہے اور اس حکم کی تعمیل میں خود آنحضورؐ نے مشاورت کا باقاعدہ اہتمام کیا ہے اور آپ کے بعد خلفاء راشدین خصوصاً حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے زمانے میں اس کے بہترین نمونے ملتے ہیں ۔ اس میں تو ظاہر ہے کوئی کلام نہیں کہ جہاں تک شوریٰ کی ہیئت (Form) کا تعلق ہے وہ اُس زمانے کے خصوصی حالات کے مطابق

تھی یعنی شوریٰ کے ممبروں کا باقاعدہ انتخاب نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ صاحبِ علم صحابہ کرام اور قبیلوں کے شیوخ و سرکردہ افراد پر مشتمل تھی ، خلیفہ بوقت ضرورت ان کو بلاتا تھا ، اور وہی صدارت کرتا تھا لیکن اس ہیئت سے قطع نظر اگر ہم اس جمہوری سپرٹ کو ملحوظ رکھیں جو نمائندہ اداروں کا اصل مقصد ہے تو بلا ادنی تردّد یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مقصد اس وقت کے سیاسی نظام سے بخوبی پورا ہو رہا تھا ۔ قانون سازی یعنی اجتہاد اصحاب علم اور مجتہدین کے ذریعے ہو رہا تھا جس میں ہر رکن اپنی رائے آزادی سے دیتا تھا ، خلیفہ کی رائے کے خلاف بھی لوگ بلا جھجک بولتے تھے جہاں تک انتظامی اور مالی امور میں نگرانی کا تعلق ہے تو یہ کام بھی بدرجہ اتم ہو رہا تھا لوگ خلیفۂ وقت کا کڑا احتساب کرتے تھے اور پبلک طور پر کرتے تھے ، تاہم بد قسمتی سے خلفاء راشدین کے بعد وہ سیاسی نظام جاری نہ رہ سکا اور شوریٰ کا ادارہ بھی ختم ہو گیا ۔ اگر شوری کا ادارہ باقی رہتا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہتا تو آج ہماری تاریخ مختلف ہوتی اور عملی میدان میں ہمیں غیروں کے نظام کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہ ہوتی ۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ عملی نظائر کے لئے ہمیں ۱۴۰۰ سال پیچھے جانا پڑتا ہے اور چونکہ اُس وقت معاشرہ موجودہ معاشرے سے مختلف تھا لہذا وہاں سے ہمیں صرف اصولی رہنمائی ملتی ہے اور شکل و ہیئت اور تفصیلی ضوابط و طریق کار کے لئے ہمیں ہم عصر غیر اسلامی نظاموں کی طرف دیکھنا پڑتا ہے ۔

چونکہ پاکستان میں سیاسی اور قانونی نظام مغربی جمہوریت کی طرز پر وجود میں آیا اور اسی طریقے پر اس کی نشوونما ہوئی لہذا اسلام کے سیاسی اور قانونی نظام کا تصوّر لوگوں کو اجنبی اور نا مانوس لگتا ہے اور جن لوگوں کے ہاتھ میں زمام اقتدار ہے چونکہ وہ مغربی تعلیم و تمدّن کے تربیّت یافتہ ہیں لہذا وہ اس خول کو توڑ کر باہر نہیں نکل سکتے ۔ ہمارے ہاں اس وقت جو بعض اسلامی شقیں دستور میں نظر آتی ہیں وہ حکمران طبقوں کو مجبوراً رکھنی پڑی ہیں اور اسلامی عناصر کی مزاحمت، اور جدوجہد کا نتیجہ ہیں ۔ اسلام کے سیاسی اور قانونی نظام کے حوالے سے دیکھیں تو ہمارے موجودہ نظام میں کوئی بات اسلامی نظر نہیں آتی اور جیسا کہ ہم پچھلے باب میں اشارہ کر چکے ہیں کہ خلفاء راشدین کے زمانے میں (اور یہ زمانہ چونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے بہترین زمانہ ہے جب اسلام کا سیاسی نظام اپنی مطلوبہ شکل میں نافذ تھا لہذا مثال دینے کے لئے ہماری نگاہیں ہمیشہ اس طرف اٹھتی رہیں گی) شوریٰ میں دو حلقہ ہائے کار تھے خالص علمی اور فقہی بحثوں کے

لئے فقہاء صحابہ (جو مجتہدین تھے) اور عمومی امور میں غور و بحث کیلئے وہ صحابہ جو علم میں اتنی گہری دسترس تو نہ رکھتے تھے لیکن ضروری عمومی علم رکھنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے معززین اور قبیلوں کے سربرآوردہ لوگ تھے ، بارسوخ ، تجربہ کار ، جہاں دیدہ ، متقی اور پرہیزگار تھے لہذا اس سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اہل شوریٰ میں تین خوبیاں ہونی چاہئیں

۱۔ علم

۲۔ تقویٰ

۳۔ عوامی اعتماد کا حامل ہونا

لیکن مغرب کا سیاسی نظام پہلی دو شرطوں کو سرے سے مانتا ہی نہیں اور تیسری شق کو وہ مانتا تو ہے لیکن ہمارے سیاسی بزرجمہروں نے اپنے مفادات کی خاطر اس کی بھی مٹی پلید کردی ہے ، نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا سیاسی نظام دین اور دنیا دونوں کے نقطۂ نظر سے بانجھ ہے ۔ تقویٰ کی شرط اگر آپ امیدواران اسمبلی کے لئے رکھنا چاہیں تو لوگ مذاق اڑاتے ہیں کہ کیا ہم نماز اور روزے کے سرٹیفکیٹ پیش کریں بلکہ ہمیں حیرت ہے کہ ملک کی دینی جماعتیں بھی اس کی مخالفت کرتی ہیں آج سے پیشتر تو کسی حکمران نے آج تک اس بارے میں سوچا بھی نہیں تھا صدر ضیاء الحق صاحب نے یہ عندیہ ظاہر ضرور کیا تھا کہ وہ اس بارے میں کچھ کریں گے لیکن عملاً انہوں نے بھی کچھ نہیں کیا اور مغربی جمہوریت کے مطابق یہ بات ووٹروں کی پسند پر چھوڑ دی (۱۳)۔

جہاں تک علم کی شرط کا تعلق ہے یہ ایک بنیادی اور انتہائی اہم شرط ہے اور قرآن و سنت کی رو سے یہ عین مطلوب ہے ۔ (۱۴) چونکہ شوریٰ میں عام سیاسی اور انتظامی امور کے علاوہ فقہی اور دقیق علمی مسائل بھی پیش ہوتے ہیں اس لئے اس امر کا انتظام انتہائی ضروری ہے کہ شوریٰ میں اگر سب نہیں تو ارکان کی کچھ تعداد ایسی ضرور ہونی چاہئے جو اجتہاد کی اہل ہو چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب قریش کے بزرگوں نے اعتراض کیا کہ شوریٰ کی مجالس میں معززین و مدبرین کے ساتھ ایک نو عمر "لڑکا" کیوں شریک ہوتا ہے تو حضرت عمرؓ نے ان بزرگوں کو بھی بلایا اور اس "لڑکے" کو بھی بلایا اور امتحاناً دونوں سے ایک سوال پوچھا "بزرگ" نہ بتا سکے اور لڑکے نے صحیح جواب دے دیا تو آپؓ نے ان بزرگوں کو بتایا کہ میں اس "لڑکے" کو اس کے علم کی وجہ سے بلاتا ہوں چنانچہ وہ خاموش ہو گئے (۱۵) ۔ مغرب کا قانون کہتا ہے کہ عوام کے نمائندوں پر کوئی شرط عائد

نہیں کی جاسکتی یہ لوگوں کا حق ہے کہ وہ جسے چاہیں اپنا نمائندہ مقرر کریں ۔ چنانچہ پاکستان کے جتنے دستور بھی بنے ہیں یا انتخابی قوانین وضع کئے گئے ہیں ان کو اٹھا کر دیکھ لیجئے کسی میں دینی علم یا اخلاقی معیار کی کوئی خاص شرط نہیں ہے سوائے عمر ، قومیت ، سزا یافتہ ہونا وغیرہ جیسی عمومی شرائط کے ۔ چنانچہ ہماری اسمبلیوں کے ممبران کی اکثریت اسلامی معیار کے لحاظ سے شوریٰ کا ممبر بننے کی اہلیت نہیں رکھتی ۔

جہاں تک تیسری شرط کا تعلق ہے مغرب کے سیاسی نظام میں یہ موجود ہے اور مغرب میں جو لوگ پارلیمنٹ میں پہنچتے ہیں وہ عموماً عوام کے صحیح نمائندے ہوتے ہیں لیکن ہمارے ہاں یہ شرط بھی عملاً مفقود ہے کیونکہ ہمارے ہاں انتخاب اور نمائندگی کا ایسا نظام وضع کیا گیا ہے اور اس پر اس طریقے سے عمل درآمد ہوتا ہے کہ صحیح رائے عامہ کبھی اوپر نہیں آسکتی ، مفاد پرست لوگ انتخابی حلقے اپنی مرضی سے بنواتے ہیں ، انتخابی فہرستوں میں گڑبڑ کرتے ہیں ، الیکشن میں جن کی ڈیوٹیاں لگی ہوتی ہیں ان کو خریدا جاتا ہے یا ڈرا دھمکا کر خاموش کروایا جاتا ہے ، پھر سرمائے کے زور پر ووٹ خریدے جاتے ہیں ، بوگس اور جعلی ووٹ بھگتائے جاتے ہیں ، سرمایہ دار مزدوروں پر ، اور جاگیردار مزارعوں پر اثر انداز ہوتے ہیں ، برادریوں ، قبیلوں اور مذہبی فرقوں کے نام پر ووٹ لئے جاتے ہیں اور عوام کی حقیقی رائے عامہ ان مصیبتوں کے نیچے دب جاتی ہے اور عوام کے حقیقی نمائندوں کی بجائے ہماری اسمبلیوں پر ہمیشہ جاگیرداروں ، سرمایہ داروں اور بیوروکریٹس کا قبضہ رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب اسمبلی میں اکثریت ان کی ہوتی ہے تو قانون سازی بھی انہیں کی مرضی سے ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ آج تک اسمبلیوں کے ذریعے کبھی کوئی اسلامی قانون نہیں بنا اور نہ ہی اسلام کے حق میں کبھی کوئی فضا بنی ہے ۔ بلکہ ہماری اسمبلیوں نے ہمیشہ اسلامی قوانین کی مخالفت ہی کی ہے اور اگر کبھی کوئی کام اسلام کے حق میں ہوا بھی ہے تو بدرجۂ مجبوری ، اسلامی عناصر کے دباؤ کے تحت یا ان کے ساتھ کچھ لو اور دو کی صورت میں سیاسی سمجھوتہ کرتے ہوئے یا کبھی مشکل وقت میں عوام کو خوش کرنے کے لئے سیاسی چال کے طور پر ۔

ان حالات میں یہ کہنا کہ ہماری اسمبلیوں کو ان کی موجودہ ہیئت میں حق اجتہاد (یعنی حقِ قانون سازی) ہونا چاہیئے ، انتہائی کمزور اور بے وزن بات ہے ۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اجتہاد (قانون سازی) کر سکیں اگرچہ اصولی طور پر شوریٰ (یا پارلیمنٹ) ہی وہ ادارہ ہے جسے اسلامی ریاست میں اجتماعی حق اجتہاد حاصل ہوتا

ہے ۔ اور اگرچہ یہ ستم ظریفی بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ اپنی نااہلیت کے باوجود اور ہمارے جیسے لوگوں کی مخالفت کے علی الرغم وہ قانون سازی (یعنی اجتہاد) عملاً کر رہے ہیں ۔ یاد رہے کہ ان اسمبلیوں میں جو وکلاء یا ریٹائرڈ جج وغیرہ جاتے ہیں اور جن کو وہاں "ماہر قانون" سمجھا جاتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے درسگاہوں میں انگریز کا کامن لاء تو پڑھا ہوتا ہے اور اسی کی انہوں نے عمر بھر پریکٹس بھی کی ہوتی ہے لیکن اسلامی قانون کی باریکیوں سے وہ عموماً ناواقف ہی ہوتے ہیں ، الّا ماشاء اللہ ، اور اس میں ان کا کوئی دوش بھی نہیں کیونکہ ان کی تربیّت ہی کامن لاء سسٹم کے لئے کی گئی ہوتی ہے ، وہ تیار ہی اس کام کے لئے کئے گئے ہوتے ہیں ۔

سربراہِ مملکت کا حق قانون سازی

معاصر جمہوری نظام کی ایک تعبیر کے مطابق تو سربراہِ مملکت کا رول برائے نام ہوتا ہے اور اصل اقتدار منتخب وزیر اعظم کے پاس ہوتا ہے اور وہی قانون سازی میں اہم رول ادا کرتا ہے (جیسے کہ پارلیمانی نظام میں) لیکن اس کے برعکس صدارتی نظام میں صدر کے پاس وسیع اختیارات ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ہمہ مقتدر نہیں ہوتا اور اس کو مقننہ پر نہ صرف یہ کہ بالادستی حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کی نگرانی کے اور بعض بالمقابل اختیارات بھی مقننہ کے پاس ہوتے ہیں (جیسے مثلاً امریکہ کے صدارتی نظام میں) ۔

اس کے برعکس جہاں تک اسلام کے سیاسی اور قانونی نظام کا تعلق ہے تو قرآن و سنت نے اس موضوع کا تفصیلی احاطہ نہیں کیا کہ ریاست میں تقسیم اختیارات کی تفصیلی صورت کیا ہونی چاہئے اور ایسا شارع نے عمداً انسانوں پر بطور رحمت اس اصول کے تحت کیا ہے کہ لوگ مشقت میں مبتلا نہ ہو جائیں اور صرف بنیادی اصول عطا فرمانے پر اکتفا کیا ہے تاکہ لوگ حسبِ حالات تفصیلات طے کرتے رہیں ، البتہ جہاں تک عملی تعبیر اور تطبیق کا تعلق ہے تو اس کی بہترین مثال خلافتِ راشدہ کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے ۔

خلافت راشدہ میں تقسیمِ اختیارات کی صورت کیا تھی ؟ علماء کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ شریعت کی بالادستی سے قطع نظر خلیفہ ہمہ مقتدر تھا سارے انتظامی ، قانونی اور عدالتی اختیارات اس کی ذات میں جمع تھے (۱۶) علماء کے ایک دوسرے گروہ کا خیال یہ

ہے کہ خلیفہ کے پاس صرف انتظامی اختیارات ہوتے تھے (۱۷) ۔ ہمیں بھی اس دوسرے نقطۂ نظر سے اتفاق ہے ، اس کی حمایت میں تفصیلی دلائل دینے کے بجائے ہم یہ کہنے پر اکتفا کریں گے کہ اگرچہ اس وقت نظامِ سلطنت میں تقسیم اختیارات کا وہ طریقہ مروج نہ تھا جو آج کل موجود ہے (یعنی انتظامیہ ، مقننہ اور عدلیہ) لیکن پھر بھی خلافتِ راشدہ کے واقعات سے یہ استنباط آسانی سے کیا جا سکتا ہے کہ گو خلفاء قاضی مقرر کیا کرتے تھے لیکن قاضی آزادی سے فیصلے کرتے تھے بلکہ بعض اوقات خود خلیفہ کے خلاف فیصلے دے دیتے تھے ۔ اسی طرح جہاں تک قانونی اور فقہی امور کا تعلق ہے تو خلفاء کبھی اپنی آزاد مرضی سے فیصلے نہ کرتے تھے بلکہ ہمیشہ اہلِ علم و فضل (مجتہدین) اور عوامی نمائندوں سے مشورے کرتے تھے اور وہاں بحث و مناقشے کے بعد جو فیصلہ ہوتا اس پر عمل کرتے تھے ، طاعونِ عمواس ، ارضِ سواد اور دوسرے بہت سے امور پر خلافتِ راشدہ کے زمانے کی شوریٰ کے اندر ہونے والی تفصیلی بحثیں ہماری دینی کتابوں میں موجود ہیں ۔ اور جہاں تک انتظامی اختیارات پر محاسبے کا تعلق ہے اگرچہ موجودہ زمانے کی طرح کی اپوزیشن موجود نہ تھی لیکن جو کام یہ اپوزیشن کرتی ہے وہ کام اُس وقت بھی ہوتا تھا بلکہ اس سے بہتر طریقے پر ہوتا تھا ، لوگ خلیفہ کا احتساب کرتے تھے ، اِنفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی اور وہ تنقید سے بالا تر نہ ہوتا تھا اندریں حالات یہ کہنا بہت وزن نہیں رکھتا کہ خلیفہ ہمہ مقتدر ہوتا تھا ۔

جہاں تک خلافتِ راشدہ کے بعد کے زمانے کی بات ہے تو نظامِ شوریٰ کے نہ رہنے کی وجہ سے شورائی اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا اور لوگوں نے اپنے مسائل کے حل کے لئے ان فقہاء و صلحاء کے پاس جانا شروع کر دیا جو اگرچہ حکومت سے باہر تھے لیکن لوگوں کو ان کے تقویٰ اور رسوخِ علم پر بھروسہ تھا ۔ اسی طرح حکمرانوں کے ظلم و جبر کی وجہ سے تنقید و احتساب کے پروسس میں کمی ضرور واقع ہوئی لیکن یہ ختم نہیں ہوا، عدالتی نظام بھی بڑی حد تک حکمرانوں کی انتظامی چیرہ دستیوں سے آزاد شریعت کے مطابق چلتا رہا ۔ پھر خلافتِ راشدہ کے بعد خلافت ملوکیت میں بدل گئی اور ملوکیت اپنے ساتھ استبداد ، عصبیت ، جبر ، بے انصافی اور دوسری قباحتیں بھی ساتھ لے کر آئی ملوکیت کا یہ نظام اسلام کی سیاسی تعلیمات کے مطابق نہ تھا اور نہ ہی علماء نے اسے کبھی سراہا اور قابلِ تقلید گردانا لہٰذا اس عہد کے ارتکازِ اختیارات کی مثال نہیں دی جانی چاہیئے ۔ اسلام کی سیاسی فقہ پر لکھنے والے قدیم علماء نے خلافت کی قانونی اور دستوری

حیثیت ہی کی عموماً تصویب کی ہے اور اصولی طور پر ملوکیت یا ڈکٹیٹر شپ کی حمایت نہیں کی (۱۸)۔

تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ ماضی کے خلفاء اور ملوک کی مثالیں دے کر یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ ایک معاصر اسلامی ریاست میں ہر قسم کے سیاسی اور قانونی اختیارات ایک فرد کے پاس جمع ہونے چاہئیں اور جیسا نظامِ سلطنت وہ چاہے بنائے، یا جو قوانین وہ چاہے قوم کے سر تھوپ دے بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اگر برائے بحث یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ خلفاء راشدین ہر قسم کے اختیارات کے حامل تھے تو اسے موجودہ زمانے کے حکمرانوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ قیاس مع الفارق ہوگا ، آج ہمارے حکمرانوں میں کوئی ابوبکر و عمر اور عثمانؓ و علیؓ جیسا مجتہد ، انصاف پسند اور خدا خوف نہیں اور نہ ہماری معاشرت پہلے کی سی سادہ بدوانہ معاشرت ہے ، لہذا سادہ بات یہ ہے کہ آج کے مسلم حکمرانوں (اولی الامر) کو قانون سازی (یعنی اجتہاد) کے اختیارات دیئے جانے کی کوئی تک نہیں ہے۔ وہ اولی الامر ضرور ہیں لیکن اولی الامر میں تقویٰ اور شریعت کے علم کی جو صفت شارع نے رکھی ہے وہ ان میں مفقود ہے بلکہ آج کے مسلمان حکمرانوں کی صحیح صورت اگر ہم دیکھنا چاہیں تو ہمیں یہ ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ پچھلی چند صدیوں کے انحطاط کے نتیجے میں مغربی اقوام مسلمان حکومتوں پر غالب آگئیں اور جیسا کہ دستور ہے انہوں نے صرف ملک ہی فتح نہیں کئے بلکہ محکوموں کے فکر و نظر اور ان کے تہذیب و تمدن کو بھی بدل ڈالا ، ان کے نظام معیشت و معاشرت کو اپنے رنگ میں رنگا اور نظامِ تعلیم کو بھی اپنے نظریات اور اغراض کے مطابق استوار کیا ۔ مغربی قوموں کے اس تہذیبی غلبے اور نظریاتی استیلاء کے دور رس نتائج نکلے ۔

۱ ۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم ختم ہونے سے علومِ دینیہ سے عمومی طور پر عدم واقفیت پیدا ہو گئی ، جو لوگ نئے نظامِ تعلیم سے فارغ ہو کر نکلے ان کے لئے استعماری طاقتوں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کی کہ وہ جو کچھ چاہیں بنیں لیکن بہر حال اچھے مسلمان بن کر ان درسگاہوں سے نہ نکلیں اور اس سکیم میں وہ کامیاب رہیں ۔

۲ ۔ استعماری طاقتوں کے خلاف ابتداء میں جتنی طاقتیں مزاحم ہوئیں (خواہ وہ برصغیر ہو یا دیگر مسلم ممالک) وہاں ان کی قیادت علماء کے ہاتھ میں تھی لیکن استعماری طاقتوں نے ان کو بزور کچل دیا اور پھر آہستہ آہستہ "جمہوریت" کے نام پر ایک ایسی قیادت کو ابھرنے کا موقع دیا جو ان کے قائم کئے ہوئے تعلیمی اداروں کی فارغ التحصیل تھی ۔ ان کے

تہذیب و تمدن کی رسیا تھی اور ان کے نظام زندگی کو قبول کئے ہوئے تھی ۔ پھر جب حالات کے دباؤ کے تحت بالآخر ان مغربی استحصالی قوتوں کو اپنا بوریا بستر سمیٹنا پڑا تو وہ اقتدار انہی قوتوں کے حوالے کر کے گئیں یعنی پیشہ ور سیاستدان ، سرمایہ دار ، جاگیر دار ، اور بیوروکریٹس وغیرہ ۔ سادہ دل مسلمان عوام جو اپنے عقائد کے زیر اثر ہر صورت میں اسلام کے حامی تھے اور وہ دینی قوتیں جو اسلام کو نافذ و غالب دیکھنا چاہتی تھیں ، جس طرح مغربی استعمار کے زمانے میں مقہور و مغضوب تھیں ، نام نہاد آزادی کے بعد بھی مقہور و مغضوب رہیں بلکہ اکثر حالات میں اپنوں کے ستم غیروں سے بھی بڑھ گئے ۔

من از بیگانگاں ہر گز نہ نالم
کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد

۳ ۔ مغربی قوموں نے مسلمان ملکوں میں جہاں بھی غلبہ پایا اسلامی قوانین ختم کر دیئے تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی کیوں کہ دشمنوں سے تو توقع ہی دشمنی کی ہوتی ہے دوستی کی نہیں لیکن افسوس کہ ہمارے مسلمان حکمرانوں نے اپنے ہاتھوں شرعی قوانین کو ختم کیا ۔ مغربی استیلاء سے پہلے ترکی میں (تنظیمات کے نام پر) اور مصر میں محمد علی کے زمانے میں ، یورپی قوانین کی نقالی اور چربہ سازی ہونے لگی ، پھر ایران میں رضا شاہ پہلوی اور ترکی میں اتاترک نے کھلم کھلا شرعی قوانین کی دھجیاں بکھیر دیں ، پھر جوں جوں مسلمان ملک آزاد (؟) ہوتے گئے اپنے دساتیر اور قوانین میں مغربی آئین و قوانین کی نقالی کرتے چلے گئے اور شریعت اپنے متبعین کا منہ دیکھتی رہ گئی (۱۹) ۔ بعض دیندار حلقوں نے اس صورت حال پر احتجاج ضرور کیا لیکن وقت کی گاڑی ان کے روکے رک نہ سکی ۔

۴ ۔ اوپر ذکر کردہ حالات کے زیر اثر جتنی بھی مسلمان حکومتیں بنیں ان کی اکثریت (خواہ وہ پیشہ ور سیاستدان تھے یا سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے نمائندے) آمریت پر منتج ہوئیں جنہیں مسلمان عوام اور ان کی دینی اقدار کا اتنا ہی پاس تھا جتنا اپنی حکومت کے مفاد کے لئے وہ ضروری سمجھتے تھے ۔ پارلیمنٹ کے نام سے ٹوٹے پھوٹے اور لولے لنگڑے ادارے اگر بنائے بھی گئے تو انہیں چلنے نہیں دیا گیا اور چلنے دیا گیا تو بھی ایسے انتظام کے ساتھ کہ مسلمانوں کی حقیقی رائے عامہ جو صحیح اسلامی نظام چاہتی ہے کبھی منظم ہو کر غالب نہ آ سکے ، انتخابی قوانین ناقص بنائے گئے ، قبیلوں ، برادریوں ،

دھڑے بندیوں کے اثرات اور سرمائے کا ناجائز استعمال کیا گیا ، جھرلو ، دھاندلی ، جعلی ووٹنگ ، غلط انتخابی فہرستیں ، ووٹوں کی خرید و فروخت ، گنتی میں بے ایمانی غرض ہر قابلِ تصور ناجائز ذریعہ استعمال کر کے مفاد یافتہ طبقوں کو کامیاب کروایا گیا اور اسلامی قوتوں نے جہاں بھی ان سے کش مکش کی ان کو ناکام کروایا گیا ۔ ان حالات میں مسلمان ملکوں میں جمہوریت کے نام پر جو کچھ بھی اور جہاں بھی تماشا ہوا اس کا نتیجہ یہی نکلا کہ اقتدار ہمیشہ غیر اسلامی قوتوں کے ہاتھ میں رہا ۔

اب ان حالات کو ذہن میں رکھئے اور تصور کیجئے کہ جو لوگ آج مسلمان ملکوں میں برسرِ اقتدار ہیں (بشمول پاکستان) ان کے اولی الامر ہونے کی شرعی پوزیشن کیا ہے ؟ اور جو "احکام" وہ جاری کر رہے ہیں ان کی شرعی حیثیت کیا ہے ؟

لہٰذا ان حالات میں یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ ایک ہم عصر مسلم مملکت کے صدر مملکت یا وزیر اعظم کو تنہا اسلامی قانون سازی کے اختیارات دئے جانا شرعی لحاظ سے کسی طور مناسب نہیں اور اس سے پہلے ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ نہ عوام اس کے حقدار ہیں اور نہ ہی مغربی طرز کی اسمبلیوں میں منتخب شدہ ارکان اسمبلی بلکہ اس کا واحد حل یہ ہے کہ سرکاری سطح پر حکومت ایک منتخب "مجلس اجتہاد" کا انتظام کرے جسے آئینی حیثیت حاصل ہو اور جس کے فیصلے نافذ ہوں ۔ یہ ادارہ کیسے بنے ، اس کے ممبر کون لوگ ہوں ، کیسے منتخب ہوں اور یہ مجلس کس طریقے سے کام کرے ؟ ان سوالوں کا جواب اگلے صفحات میں آرہا ہے ۔

معاصر مسلم ریاست میں (قانون ساز) اجتہادی ادارے

بہتر ہو گا کہ پہلے ہم ان سوالات کا تعین کر لیں جن کا جواب ہمیں یہاں دینا ہے ، ممکنہ سوالات یہ ہو سکتے ہیں ۔

۱ ۔ یہ کیسے پتہ چلے کہ کون اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہے (یعنی مجتہد کون ہے) ؟

۲ ۔ مجتہدین کو ایک حکومتی اجتہادی ادارے میں لینے کے لئے فیصلہ کیسے کیا جائے ۔ بذریعہ الیکشن یا سلیکشن ! الیکشن ہوں تو کیسے ہوں ؟

۳ ۔ یہ مجلسِ اجتہاد ، اسمبلی سے باہر ہو یا اسمبلی کا ایک جزء ہو ؟

۴ ۔ اس مجلس کے فیصلے محض سفارشات ہوں یا ان پر عمل در آمد لازمی ہو ؟

۵ ۔ یہ مجلس صرف مجتہد فقہاء پر مشتمل ہو یا اس میں دوسرے ماہرین بھی شامل ہوں ؟

۶ ۔ اس مجلس اجتہاد کا کام صرف قانونی امور میں فیصلے کرنا ہو یا اسے کوئی دوسرے اختیارات بھی حاصل ہوں گے ؟

ان مسائل پر مختلف علماء نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ، پہلے ہم انہیں پیش کریں گے ، پھر ان کا ایک تنقیدی جائزہ لیں گے اور اس کے بعد اپنی طرف سے بعض تجاویز پیش کریں گے ۔

فضیلۃ الشیخ ذکریا البری کی رائے

معروف مصری عالم شیخ ذکریا البری نے اپنی کتاب "اصول الفقہ" (۲۰) میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ حکومت کا سربراہ متقی ، اہل علم اور اجتہاد کی اہلیت رکھنے والے لوگوں میں سے بعض کو اس کام کے لئے چنے اور جب ایک دفعہ ایسی جماعت بن جائے تو آئندہ کے لئے اس جماعت کی ممبر شپ اور اس سے متعلق دوسرے کام اس مجلس کے سپرد کر دیئے جائیں لیکن اس مجلس کی پہلی تشکیل کے لئے بہر حال حاکم پر اعتماد کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ۔

ڈاکٹر الطحاوی کی تجویز

ڈاکٹر سلیمان الطحاوی ، پرنسپل لاء کالج عین الشمس یونیورسٹی مصر نے اپنی کتاب "السلطات الثلاث" (۲۱) میں جو تجویز پیش کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مجتہدین کے تعین کے لئے ایک اعلیٰ ڈگری مقرر کی جائے اور یہ ڈگری کسی ایسے شخص کو نہ دی جائے جس میں مجتہد کی شرائط نہ پائی جائیں پھر ان ڈگری یافتہ مجتہدین میں سے ایک مشاورتی کونسل بنائی جائے اور حکومت کوئی بھی قانون بنانے یا آرڈیننس جاری کرنے سے پہلے مسودہ قانون اس مشاورتی کونسل کو دکھا لے کہ اس میں کوئی غیر اسلامی بات تو نہیں ہے ۔

ڈاکٹر محمود حلمی کی رائے (۲۲)

04950

۱ ۔ ایک مشاورتی کونسل ہو جس میں حکومت کے مقرر کردہ مختلف شعبوں (مثلاً دینی ، آئینی ، اقتصادی ، اجتماعی شعبہ جات وغیرہ) کے ماہرین جمع ہوں ۔

۲ ۔ اس کمیٹی کا کام صرف یہ ہو کہ پارلیمنٹ جو مسودہ ہائے قوانین اسے بھیجے ان کی شرعی حیثیت (یعنی اسلامی نقطۂ نظر سے جائز و ناجائز ہونے) کے بارے میں فیصلہ دے ۔

۳ ۔ اس کونسل میں فیصلے کثرتِ رائے سے ہوں ۔

۴ ۔ اس کونسل کے فیصلے لازمی سمجھے جائیں ۔ اگر پارلیمنٹ اس مجلس کے فیصلوں کے خلاف کوئی قانون پاس کرے تو اس کو اعلیٰ عدالت میں چیلنج کیا جا سکے ، اعلیٰ عدالت اس معاملے میں مشاورتی کونسل سے تبادلۂ خیال کے بعد اپنا فیصلہ دے ۔

ڈاکٹر القطب کی رائے (۲۳)

۱ ۔ اگر انتخابات میں ایک معقول تعداد میں فقہاء اور ایسے ماہرینِ قانون منتخب ہو کر نہ آئیں جو فقہ و شریعت دونوں کے ماہر ہوں تو اسی طرح کے بعض مزید افراد کا تعین حکومت کر دے ۔ اس طرح پارلیمنٹ کے اندر یہ اجتہاد کمیٹی شریعت اور قانون کے منتخب و غیر منتخب ماہرین پر مشتمل ہو گی ۔

اگر پارلیمنٹ اس کمیٹی کی رائے کے خلاف فیصلہ کرنا چاہے تو اسے سادہ سے زیادہ اکثریت کا پابند کیا جائے (مثلاً ۳/۲ یا ۴/۳ اکثریت سے مشروط کیا جائے) اسی طرح صدرِ مملکت کو بھی اس کمیٹی کی رائے کے خلاف اعتراض کرنے کا اور نظرثانی کے لئے بل واپس بھیجنے کا حق حاصل ہو گا ۔

پارلیمنٹ اس کمیٹی کی رائے کے برعکس کوئی قانون پاس کر دے تو ایسی صورت میں متذکرہ قانون کو عدالت عالیہ میں چیلنج کیا جا سکے گا اور اگر عدالت اس قانون کو شریعت کے خلاف پائے تو اسے کالعدم قرار دے سکے گی ۔

ڈاکٹر علی حسنین کی رائے (۲۴)

۱ ۔ اسلامی حکومت کے دارالسلطنت میں ایک مجلس شوریٰ ہونی چاہئے جو مجتہدین پر مشتمل ہو ۔

۲ ۔ اس مجلس میں دیگر علوم و فنون کے ماہرین کی کمیٹیاں بھی شامل کی جا سکتی ہیں ۔

۳ ۔ اس مجلس کا اصل کام اجتہاد کرنا ہو لیکن اسے انتظامیہ کی نگرانی کا حق بھی حاصل ہو گا ۔

۴ ۔ صدرِ مملکت کے انتخابات کے وقت اس مجلس میں دیگر لوگوں کو بھی شامل کر لیا جائے مثلاً صوبوں کے گورنر ، افواج کے جرنیل اور پیشہ ورانہ تنظیموں کے سربراہ وغیرہ ۔

۵ ۔ صوبوں میں مجالس شوریٰ قائم کی جا سکتی ہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اجتہادی امور سے متعلق مسائل میں وہ مرکزی شوریٰ کے فیصلوں کے خلاف کوئی حکم پاس نہیں کر سکیں گے ۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی اور ڈاکٹر حسن صبحی احمد کی رائے (۲۵)

ان دونوں حضرات کی رائے یہ ہے کہ اسلامی ممالک کی پارلیمنٹوں میں ایسے فقہاء پر مشتمل ایک کمیٹی موجود ہونی چاہئے جو استنباط و اجتہاد پر قدرت رکھتی ہو اور اس کمیٹی کے فیصلوں پر عمل درآمد لازمی ہو، اس کے فیصلے محض سفارشات نہ ہوں۔

ان مسائل پر اپنی رائے پیش کرنے سے پہلے ہم ان آراء پر ایک عمومی تبصرہ کرنا چاہیں گے۔

مجتہدین کی پہچان اور تعیّن

مجتہدین کی پہچان جن وجوہ کی بناء پر ایک مسئلہ بن گئی ہے ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ اسلامی قانون ہمارے ہاں عملاً مروّج نہیں، نہ ہی یہ کالجوں، یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے (۲۶) کہ اس کے فاضل وہاں سے تیار ہو کر نکلیں اور نہ عدالتوں میں اس پر فیصلے ہوتے ہیں کہ جج اور وکلاء تربیت پائیں، نہ یہ عملاً بحیثیت قانون ملکی رائج ہے کہ منتظمین اس کے ماہر ہوں، پھر اس نعرے نے کہ اب اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے بھی خواص و عوام پر اپنا اثر چھوڑا ہے اور بعض علماء نے فقہاء کو جو مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے (یعنی مجتہدِ مطلق، مجتہد فی المذہب، مجتہد فی المسائل، اصحاب التخریج اور اصحاب الترجیح وغیرہ) اس کے منفی اثرات بھی موجود ہیں۔ چنانچہ یہ تاثر عام ہو گیا ہے کہ مجتہد کا منصب اتنا اونچا منصب ہے کہ اس تک پہنچا ہی نہیں جا سکتا، کوئی مجتہد ہو ہی نہیں سکتا۔ عوام اور عام علماء میں اس خیال کے راسخ ہو جانے کے بعد اب کوئی عالم اگر مجتہد ہو بھی تب بھی وہ "انکسارِ علمی" کی بنا پر اپنے آپ کو مجتہد نہیں کہتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اس پر ہر چہار طرف سے انگلیاں اٹھیں گی اور بجائے فائدے کے الٹا نقصان ہو گا، اس مفت کی تو تکار میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ لیکن اگر ہم ٹھنڈے دل و دماغ اور غیر جانبداری سے سوچیں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ کسی عالم و فقیہ کے مرتبہ اجتہاد پر نہ پہنچ سکنے کی کوئی معتبر عقلی اور نقلی دلیل موجود نہیں ہے؟ بلکہ اس کے برعکس اس کے حق میں دلائل موجود ہیں مثلاً علمِ دین جس کا متوفر ہونا اجتہاد کی ایک بڑی شرط ہے آج ماضی کے مقابلے میں بہت سہل الحصول ہے قرآن کریم اور اس کی تفسیریں، حدیث اور اس کی شرحیں، عربی ادب اور فقہ و اصول فقہ پر جتنا مطبوعہ لٹریچر آج موجود ہے اس سے پہلے کب تھا؟ بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں دین کی تعلیم کا انتظام ہے، عظیم الشان لائبریریوں میں مطالعہ و تحقیق کی سہولت موجود ہے اور اب اس شعبے میں کمپیوٹر کے استعمال نے معاملات کو انتہائی

آسان کر دیا ہے ۔ لیکن اگر ہم مسلسل اس چوٹی کو خود ہی ناقابلِ تسخیر سمجھتے رہیں تو اس کو سر کرنے کی ہمت اور دعویٰ کون کرے گا ۔

خدا نخواستہ ہماری اس بات سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم اجتہاد کی اہمیت کو نہیں سمجھتے یا مجتہد کی اہمیت و وقعت کو کم کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس کام کی عظیم الشان اہمیت اور جلالت و عظمت کا ہمیں بخوبی احساس ہے لیکن ایک طرف حالت یہ ہے کہ عملاً سارے اسلامی ممالک میں قانون سازی (یعنی اجتہاد) کا کام وہ لوگ کر رہے ہیں جو اسلامی قانون کی ابجد سے بھی ناواقف ہیں اور خدا کی شریعت ان لوگوں کے ہاتھوں بازیچۂ اطفال بنی ہوئی ہے ۔ دوسری طرف اجتہاد کو ہم نے اتنا اونچا منصب دے دیا ہے کہ اس تک کوئی پہنچ نہیں سکتا ، تو کیا ان دونوں انتہاؤں کے درمیان یہ طریقہ وسطی نہیں کہ ہم ملک کے جید علماء و سکالرز کو اس کام کے لئے مختص کریں خواہ ان میں مجتہدِ مطلق کی صفات بدرجہ اتم موجود نہ بھی ہوں ، آخر ہم اپنی وسعت کی حد تک ہی تو مکلف ہیں نہ کہ ایک امرِ مثالی کے ، یہ تو کوئی حل نہ ہوا کہ چونکہ اعلیٰ ترین مجتہدانہ صفات کے حامل علماء موجود نہیں لہذا یہ کام مغربی قانون کے ماہروں کے سپرد کر دینا چاہئے جو شریعت کی ابجد سے بھی بے بہرہ ہیں ۔

مجلس اجتہاد مشاورتی ہو یا با اختیار

مجلسِ اجتہاد کے محض مشاورتی ادارہ ہونے کا تصور بالکل غلط ہے یہ نہ نقلاً درست ہے نہ عقلاً اس لئے کہ :

۱ ۔ سربراہ حکومت ، خواہ وہ صدر ہو یا وزیر اعظم اس کی قانونی پوزیشن یہی ہے کہ وہ مسلم عوام کا نمائندہ اور وکیل ہوتا ہے اور یہ وکالت مقیدہ ہوتی ہے مطلقہ نہیں اور اسے مقید کسی بشر نے نہیں بلکہ خود شارع حقیقی نے کیا ہے (۲۷) اور جب حکمران پر مشورے کی یہ قید شارع کی ہے تو امت اگر چاہے بھی تو اسے ختم نہیں کر سکتی جیسے اسلام میں انسان کو خودکشی کی اجازت نہیں حالانکہ بظاہر انسان اپنے جسم اور ارادے کا مالک ہوتا ہے ۔ پھر آیتِ شوریٰ میں صیغۂ امر استعمال کیا گیا ہے جو وجوب پر دلالت کرتا ہے الآیہ کہ قرینہ اس کے خلاف ہو اور جب صیغۂ امر نبی کریمؐ جیسی ہستی کے لئے استعمال کیا گیا ہے تو عام سربراہانِ مملکت کے لئے تو یہ اس سے بڑھ کر واجب اور فرض ہونا چاہئے اور ہماری اس بات کی تائید علماء کے اقوال سے بھی ہوتی ہے ۔

ا)۔ تفسیر طبری میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ کو جو مشورے کا حکم دیا ہے تو اس سے امت کو یہ تعلیم دینا مقصود ہے کہ وہ بھی بوقت ضرورت آپس میں مشورہ کریں (۲۸)۔ تفسیر قرطبی میں بھی یہی بات کہی گئی ہے (۲۹)

ب)۔ امام رازی کی تفسیر میں ہے کہ سفیان بن عیینہ اور حسن سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ کو مشورے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ اس میں آپؐ کی پیروی کی جائے اور امت کے لئے یہ ایک طریقہ اور مثال بن جائے (۳۰)۔

ج)۔ امام ابن تیمیہ کا کہنا ہے کہ ولی الامر مشورے سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو مشورے کا حکم دیا ہے (۳۱)۔

د)۔ بلکہ امام قرطبی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "شوریٰ" شریعت کے بنیادی احکام و ضوابط میں سے ہے (۳۲)

ہم عصر علماء میں سے جناب ابوبکر الجزائری نے اپنی کتاب "اسلامی دستور" میں کہا ہے "کہ سارے وہ مسائل جن میں نص موجود نہ ہو لازماً اس مجلس تشریعی کے حوالے کئے جائیں اور حکومت اور سربراہ کے لئے جائز نہیں کہ اس سے انحراف کرے" (۳۳) ڈاکٹر عبدالکریم زیدان بھی سربراہ حکومت کے لئے مشورے کو لازمی سمجھتے ہیں اور ان کا یہ کہنا ہے کہ اسے سربراہ مملکت کی مرضی پر نہیں چھوڑا جاسکتا (۳۴)

اور جہاں تک عقلی دلائل کا تعلق ہے تو ہمارا تجربہ اس کا سب سے بڑا شاہد ہے کہ کس طرح اس نوعیت کی مشاورتی کونسل کو اسلام پسند رائے عامہ کا منہ بند کرنے کے لئے ایوب خان اور بھٹو نے استعمال کیا اور اس کو عملاً عضو معطل بنا کر رکھا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق چیئرمین ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن نے کونسل کی کارکردگی کا ذکر کرتے ہوئے ایک دفعہ بتایا کہ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء تک اس کونسل کے صرف ۳۰ اجلاس ہوئے اور اس میں صرف ۶۹ دن کام ہوا۔ حالت یہ ہے کہ اس کونسل کو اپنی سفارشات شائع تک کرنے کا اختیار نہیں۔ اس کونسل اور اس کے تحقیقاتی ادارے کو خود مختار ادارہ تک قرار نہیں دیا گیا اور اسے کبھی وزارت قانون کے ماتحت رکھا جاتا ہے اور کبھی وزارت تعلیم کے، اور مقصود ایک ہی ہے کہ اسے کھل کر، آزادی سے کام کرنے کا موقع نہ دیا جائے اور اس کی رپورٹوں کو وزارت کی درازوں میں دبا کر رکھا جاسکے۔

ان دلائل کی روشنی میں یہ بآسانی کہا جاسکتا ہے کہ مجلس اجتہاد کا ڈھانچہ ایسا ہونا چاہئے جو نرا مشاورتی نہ ہو بلکہ یہ ایک بااختیار اور خود مختار ادارہ ہونا چاہئے۔

اس دلیل میں بھی کوئی وزن نہیں کہ پارلیمنٹ کے اندر ایک ایسے مشاورتی علماء بورڈ کے تشکیل کا مشورہ علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں دیا تھا (۳۵) ظاہر ہے علامہ نے یہ لیکچر آج سے نصف صدی پیشتر دئے تھے اور موجودہ حالات اس وقت کے حالات سے بالکل مختلف ہیں ۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر علامہ آج زندہ ہوتے اور مسلمان حکومتوں کے اندر ایسے مشاورتی اداروں کا حشر دیکھتے تو اپنے نقطۂ نظر پر نظرثانی فرمالیتے ۔

مجتہدین کی پہچان اور تعین کا طریقہ

جہاں تک اس تجویز کا تعلق ہے کہ حکومت ایک مجلس تاسیسی قائم کرے جو مجتہدین کی پہچان اور تعین کا انتظام کرے تو یہ بھی خدشات سے بھرپور ہے مثلاً :

۱ ۔ جماعتِ تاسیسی کو حکمران کا نامزد کرنا یا حکمران کے کسی پسندیدہ عالم سے نامزد کروانا فتنے کے دروازے کھول سکتا ہے اور اس امر کا امکان موجود ہے کہ اس طرح کے کسی انتخاب میں حاکم کی سیاسی ضرورتوں اور مصلحتوں کا زیادہ عمل دخل ہو چہ جائیکہ اہل تر افراد کو ڈھونڈا جائے ۔

۲ ۔ اگر ذمہ دار علماء اس کمیٹی کے سامنے پیش نہ ہوں یا پیش ہونا اور اہلیت کا سرٹیفکیٹ لینا اپنے وقار کے منافی سمجھتے ہوں تو پھر اس کا حل کیا ہوگا ؟

۳ ۔ اور اگر وہ یہ ڈگری لے بھی لیں تو کئی علماء ایسے ہوں گے جو انتخابی بکھیڑوں میں پڑنا پسند نہیں کریں گے ان علماء کی مجلس تشریعی میں نمائندگی کیسے ہو سکے گی ؟

۴ ۔ بعض ممالک خصوصاً پاکستان میں علماء کی جماعت بندی اور فرقہ پرستی زوروں پر ہے وہ ویسے ہی آپس میں سر پھٹول کرتے رہتے ہیں کجا یہ کہ انہیں انتخابی حلقوں میں ایک دوسرے کے مقابلے پہ لا کھڑا کیا جائے ۔ اس طرح تو ایک ایسی آگ بھڑک سکتی ہے جس میں مجلس تشریعی بناتے ہوئے سب کچھ بھسم ہو کر رہ سکتا ہے اور اس سے ایک ایسے فتنے کا دروازہ کھل سکتا ہے جس کا بند کرنا محال ہوگا ۔

مجلس اجتہاد پارلیمنٹ کے اندر ہو یا باہر

مجلس اجتہاد کا پارلیمنٹ (شوریٰ) سے باہر ہونا دو لحاظ سے غیر معقول ہے :

۱ ۔ پارلیمنٹ کے اندر مجتہدین کا بنیادی کام اجتہاد کرنا ہے ۔ اب یہ کتنا متناقض اور غیر

منطقی محسوس ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ کے ارکان تو غیر مجتہد ہوں اور اجتہاد کے نااہل ہوں اور وہ جو اجتہاد کے اہل ہوں وہ پارلیمنٹ کے باہر ہوں ، وہ باہر بیٹھ کر مختلف امور کے بارے میں رائے دیں کہ فلاں چیز شریعت کے مطابق ہے اور فلاں خلاف ۔ آخر کان کو الٹی سمت سے پکڑنے کی ضرورت کیا ہے ؟ سیدھی بات یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے ارکان میں اپنے کام کی (یعنی اجتہاد کی) اہلیت ہونی چاہئیے ۔ گویا مجتہدین کی صحیح جگہ پارلیمنٹ کے اندر ہے باہر نہیں ۔

پارلیمنٹ سے باہر مجلس اجتہاد کے فیصلے اگر محض سفارشات ہوں تو عملی لحاظ سے ان کی کوئی افادیت نہیں جیساکہ ابھی ذکر ہوا اور اگر اس کے فیصلے لازمی ہوں ، تو بھی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی کیونکہ :۔

اس صورت میں شوریٰ اور شوریٰ کے باہر مجلس اجتہاد دونوں ایک ہی کام کریں گے جس سے مشکلات پیدا ہوں گی آخر اس ثنویت کی ضرورت کیا ہے ؟

اس صورت میں شوریٰ کے منتخب نمائندوں کو یہ اعتراض کرنے کا موقع ملے گا کہ وہ تو عوام کے منتخب نمائندے ہیں اور علماء کو جو غیر منتخب اور حکومت کے متعین کردہ ہیں ، ان پر نمبردار بنا کر بٹھا دیا گیا ہے ۔

لہٰذا بہتر یہ ہے کہ مجلس اجتہاد پارلیمنٹ کا ایک جزو ہو اس سے الگ کوئی ادارہ نہ ہو ۔

کیا مجلس اجتہاد صرف مجتہدین پر مشتمل ہونی چاہئیے

ان تجاویز میں بعض محققین نے یہ رائے دی ہے کہ مجلس اجتہاد میں فقہاء کے علاوہ دوسرے شعبوں کے ماہرین بحیثیت ارکان شامل ہونے چاہئیں ۔ اس سلسلے میں ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ پہلے ہمیں یہ فیصلہ کر لینا چاہئیے کہ ہمارا مشکل کیا ہے یعنی کون سا مسئلہ ہے جسے ہم حل کرنا چاہتے ہیں ۔ مسئلہ یہ نہیں کہ قانون سازی کا جو طریقہ اس وقت مروّج ہے اس میں مختلف شعبوں کے ماہرین کی آرا شامل نہیں ہو پاتیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جو قانون سازی ہو رہی ہے وہ شریعت کے مطابق نہیں ہو رہی ، لہٰذا اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ اسلامی قانون کے ماہرین کی موجودگی کو یقینی بنایا جائے اور ان کے فیصلوں کو تسلیم کیا جائے ۔ جہاں تک قانون سازی میں دوسرے شعبوں کے ماہرین کی مشاورتی خدمات کے حصول کا تعلق ہے تو اس سے کسی کو انکار نہیں ہے اور نہ ہی اسلامی نقطۂ نظر سے اس پر کوئی اعتراض کیا جا سکتا ہے خواہ اس کا

انتظام مجلس اجتہاد کے اندر ہو یا باہر بشرطیکہ ان کی آراء کی حیثیت "مشاورتی" ہو ، فیصلہ کن نہ ہو ۔

یہاں ہم یہ ضرور کہیں گے کہ مجتہد ہونا کسی طبقے ، گروہ ، نسل اور قبیلے سے تعلق رکھنے پر منحصر نہیں ہے بلکہ اجتہاد تو ایک وصف کا نام ہے ، ہر وہ شخص جو علومِ قرآن و سنت اور عربی زبان کا ماہر ہو اور فقہ اسلامی میں ریسرچ کی مہارت و قابلیت رکھتا ہو وہ مجتہد ہے ، یہ گویا ایک خاص شعبۂ علم کی تخصیص ہے ، جو بھی اس شعبے کی تخصیص رکھے وہ اس کا اہل ہے قطع نظر اس سے کہ وہ کسی دینی مدرسے کا مدرس و مفتی ہو یا کسی اسلامی یونیورسٹی کا پروفیسر ، اسلامی تحقیقی ادارے کا محقق ہو یا پیشہ ور وکیل یا پھر کسی عدالت کا جج ۔ اگر تعصب سے بالاتر ہو کر سوچا جائے تو ہماری یہ بات عقل و منطق کے عین مطابق ہے ، اگر کوئی صحیح الدماغ انسان علاج کروانے کے لئے درزی کے پاس اور کپڑے سلوانے کے لئے طبیب کے پاس نہیں جاتا تو آخر اس بات میں کیا وزن ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے حلت و حرمت کے فیصلے کے لئے ہم کسی اقتصادیات یا مغربی قانون کے ماہر کے پاس جائیں اور جو اس شعبے کا ماہر ہے اسے نظر انداز کر دیں ۔

پھر آج کے سارے علماء و فقہاء کو حجروں اور خانقاہوں کے ملا مولویوں اور صوفیوں پر قیاس کرنا بھی غلط ہے ، بعض اہلِ علم کافی عرصے سے سیاسی اور اجتماعی تحریکوں میں حصہ لے رہے ہیں اور دیگر اجتماعی اداروں میں کام کر رہے ہیں وہ حالات حاضرہ سے باخبر ہیں ، یہ الگ بات ہے کہ جس طرح دوسرے شعبوں کے سارے ماہرین ایک جیسے نہیں ہوتے اسی طرح اس شعبے میں بھی اہلیت کے لحاظ سے ان کے درجات متفاوت ہیں ۔

معاصر مسلم ریاست میں اجتہادی ادارے کے لئے ہماری تجویز

اس عمومی تجزیئے کے بعد اور متذکرہ تجاویز میں جو خامیاں ہیں ان کو دور کرنے کی خاطر ہم ایک ایسی مجلسِ اجتہاد کا خاکہ پیش کرتے ہیں جو ، ہماری رائے میں ، ان خامیوں سے مبرا بھی ہے اور پاکستان کے حالات میں قابلِ عمل بھی ۔

۱ ۔ مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کے انتخابات متناسب نمائندگی کے طریقے سے بالغ رائے دہی کے ذریعے ہوں ۔

۲ ۔ الیکشن کمیشن (جو خود ثقہ ترین آدمیوں پر مشتمل ہو) کی ذمہ داری ہو کہ کوئی ایسا فرد شوریٰ کی نمائندگی کے لئے اہل نہ گردانا جائے جو دینی فرائض کو پورا نہ کرتا ہو اور منکرات

سے مجتنب نہ ہو ، ایک خاص حد تک تعلیم یافتہ ہو (حکومتی یونیورسٹی یا دینی جامعہ کا فارغ التحصیل ہو) اور اخلاق و کردار کی بلندی کے لحاظ سے معروف ہو ۔

۳ ۔ قانون سازی کے اختیارات سارے ہاؤس کی بجائے ایک مجلس اجتہاد کے پاس ہوں ۔

۴ ۔ سیاسی جماعتوں کو پہلے سے متنبہ کر دیا جائے کہ ان کی لسٹوں میں سرفہرست ایک تعداد اسلامی سکالرز اور جید علماء کی ہونی چاہئے ۔ جو اس اجتہاد کمیٹی کے ممبر بن سکیں ۔

۵ ۔ اس اجتہاد کمیٹی میں ہر پارٹی کو اس کی جیتی ہوئی نشستوں کے تناسب سے حصہ ملے ۔

۶ ۔ ان علماء اور سکالرز میں پائی جانے والی مطلوبہ صفات کا ذکر آئین میں کر دیا جائے اور یہ وہ صفات ہوں جو اصولیوں کے نزدیک متفقہ طور پر کسی مجتہد میں کم از کم پائی جانی چاہئیں اور جن کا مجمل ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں یعنی قرآن و حدیث کے علوم میں رسوخ ، عربی زبان پر عبور ، فقہ و اصول فقہ میں درک اور استنباط کا ملکہ ، حسنِ سیرت اور تقویٰ کے لحاظ سے معروف ہونا ، عوامی مسائل کو جاننا اور عوام کے نزدیک ثقہ ہونا وغیرہ ۔

۷ ۔ یہ کمیٹی ایک خود مختار اور با اختیار ادارہ ہوگی اگر وہ کثرتِ رائے سے محسوس کرے کہ اس کمیٹی کے لئے نامزد کردہ کسی ممبر میں وہ کم از کم صفات نہیں ہیں جو دستور میں مذکور ہیں تو وہ اس کی رکنیت کو قبول کرنے سے انکار کر سکتی ہے تا آنکہ متعلقہ سیاسی جماعت اس ممبر کی جگہ کوئی دوسرا قابل قبول ممبر دے یا اس سیٹ کے خالی ہونے کا نقصان اٹھائے ۔

۸ ۔ یہ کمیٹی اپنا صدر خود چنے گی اور اپنا طریقِ کار خود وضع کرے گی ۔

۹ ۔ یہ کمیٹی ممبرانِ اسمبلی ، دوسرے علماء اور سکالرز ، ماہرین قانون اور زندگی کے دوسرے شعبوں کے ماہرین کو حسب ضرورت مشورے اور تعاون کے لئے طلب کر سکے گی بلکہ احسن ہو گا کہ اسلامی تحقیقات کا ایک ادارہ اور مختلف شعبوں کے ماہرین کی ایک بڑی کونسل اس مجلس کے ساتھ مستقل کام کرے اور اس کی معاونت کرے ۔

۱۰ ۔ اس کمیٹی کے پاس کردہ بلوں کے قانونی صورت اختیار کرنے سے پہلے قومی اسمبلی یا صدر مملکت اگر چاہیں تو نظر ثانی کے لئے (مطلوبہ تبدیلیوں کے ذکر کے ساتھ) مسودۂ قانون کمیٹی کو واپس بھجوا سکتے ہیں لیکن اس کو رد نہیں کر سکتے اور نظر ثانی کے بعد اس کمیٹی کا فیصلہ آخری ہو گا ۔

۱۱ ۔ حکومتی یا پرائیوٹ بل نہ ہونے کی صورت میں بھی یہ کمیٹی اپنی مجموعی رائے سے یا اپنے کسی ممبر کے توجہ دلانے سے کوئی قانون بنا کر حکومت اور اسمبلی کو بھجوا سکتی ہے اور کسی غیر اسلامی قانون کی جگہ اسلام کے مطابق دوسرا قانون بنا کر نفاذ کے لئے بھجوا سکتی

ہے اور جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا عام ممبران اسمبلی اس پر بحث تو کر سکتے ہیں لیکن اسے نامنظور نہیں کر سکتے ۔

۱۲ ۔ دستور میں کسی ترمیم کے لئے بھی اس کمیٹی کی رضامندی ضروری ہوگی ۔

۱۳ ۔ پارلیمنٹ کا کوئی ممبر، حکومت ، یا پبلک کا کوئی فرد اگر سمجھے کہ اس مجلس کا پاس کردہ کوئی قانون شریعت کے خلاف ہے تو وہ اسے سپریم کورٹ میں چیلنج کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کورٹ کے جج مجتہدین پر مشتمل ہوں ۔

۱۴ ۔ یہ مجلس اگر چاہے تو مستقبل کی مجلس کے لئے (یعنی مجتہدین کی پہچان اور تعین کے لئے) کوئی دوسرا مناسب لائحہ عمل متفقہ رائے سے تجویز کر سکتی ہے ۔

بعض متبادل تجاویز

ہمارے نزدیک یہ ایک بہترین تجویز ہے تاہم اس کے بعض متبادل بھی سوچے جا سکتے ہیں کیوں کہ عملی زندگی میں ضروری نہیں کہ کسی آئیڈیل صورتحال پر عمل بھی ہو سکے ۔

۱ ۔ اگر متناسب نمائندگی کے نظام کو نہ اپنایا جائے اور مروّجہ طریقے سے جماعتی یا غیر جماعتی انتخابات ہوں تو یہ صورت اختیار کی جا سکتی ہے کہ جتنے بھی علماء اور اسلامی سکالرز اسمبلی میں پہنچیں ان پر مشتمل مذکورہ کمیٹی بنا دی جائے ۔

۲ ۔ اگر اس طرح کے الیکشنوں میں کم تعداد میں علماء اور سکالرز اسمبلیوں میں پہنچیں تو مجتہدین کی پہچان و تعین کے دوسرے ذرائع آزمائے جا سکتے ہیں مثلاً الیکشن کمشن دستور میں مذکور صفات کے حامل علماء و سکالرز کی ایک لسٹ پارلیمنٹ میں پیش کرے اور پھر ارکانِ شوریٰ اس لسٹ میں سے مطلوبہ تعداد میں اہلِ علم کو چن لیں ۔ اس طرح یہ اہلِ علم بھی گویا منتخب قرار پائیں گے ۔

۳ ۔ اسی طرح اگر پارلیمنٹ کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اس مجلس کے فیصلوں کے خلاف بھی قانون سازی کر سکتی ہے تو اس قسم کے فیصلوں کو سادہ اکثریت کی بجائے ۳/۴ اکثریت سے مشروط کر دیا جائے ۔ یا پھر اس مجلس کے ارکان کو یہ حق دے دیا جائے کہ وہ ایسے قانون کو سپریم کورٹ میں اس بناء پر چیلنج کر سکیں کہ وہ شریعت کے خلاف ہے ۔

اس تجویز کے ممیزات اور اس پر ممکنہ اعتراضات

۱ ۔ پارلیمنٹ سے الگ ایک مشاورتی ادارے کے نقائص ہم بیان کر چکے ہیں ایسے کسی ادارے

کو (جس کا خاکہ ہم نے اوپر دیا ہے) اگر پارلیمنٹ سے الگ خود مختار اور بااختیار ادارہ بنایا جائے اور قانون سازی کے اختیارات اسے دیئے جائیں اور ممبران پارلیمنٹ کو اس حق سے محروم کر دیا جائے تو کوئی بھی بااختیار پارلیمنٹ اس صورت حال کو قبول نہیں کرے گی اور حکمران جماعت اپنی حکومت کے اندر "مولویوں کی ایک اور حکومت" برداشت نہ کر سکے گی جیسا کہ خلافت راشد بعد آنے والے "خلفاء" (؟) نے اسے قبول نہیں کیا۔ لہذا اس کا حل یہی مناسب ہے کہ ایسے لوگ عوام کے منتخب شدہ نمائندے ہوں اور پارلیمنٹ (یا مجلس شوریٰ) کا ایک حصہ ہوں۔ پھر ان علماء اور سکالرز کا پارلیمنٹ میں موجود ہونا قانون سازی سے قطع نظر دوسرے امورِ حکومت میں بھی اسلامی نقطہ نظر سے صحیح اور مناسب مشورے دینے کا سبب بن سکے گا۔ جس سے بہت سے اجتماعی فوائد حاصل ہو سکیں گے نیز یہ کہ اس میں خلفاء راشدین کی اس مجلس شوریٰ کی متابعت بھی ہے جس میں ایک ہی شوریٰ تھی۔

۲۔ شرعی نقطہ نظر سے بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ مجتہدین کی صفات پارلیمنٹ کے سارے ارکان میں موجود ہوں اور جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اہل شوریٰ کی صفات لازماً وہ نہیں ہیں جو مجتہدین کی ہیں لہذا یہ مطالبہ نہ ضروری ہے اور نہ عملاً ممکن کہ سربراہ حکومت یا شوریٰ کے سارے ممبران میں مجتہدین کی صفات پائی جائیں۔ البتہ مجلس شوریٰ کے چیدہ چیدہ لوگ جن کا کام قانون سازی ہو ان میں مجتہدین کی صفات کا پایا جانا ضروری قرار دیا جاسکتا ہے اور اسی کی تجویز ہم نے پیش کی ہے۔

یہاں اس امر کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ مجتہدین کی درجہ بندی جو بعض علماء نے کی ہے اور اصولیوں نے جن صفات کے مجتہدین میں پائے جانے کا ذکر کیا ہے اس سے کچھ ایسا تصور قائم ہو گیا ہے کہ گویا مجتہد وہی ہے جو مجتہد مطلق ہو اور پھر مجتہد مطلق کی تلاش اور انتظار میں لوگ اس اعلیٰ ترین معیار پر نظریں جمائے ہوئے ہیں کہ یہ صفات تو کسی ایک آدمی میں موجود نہیں ہیں اس لئے کوئی مجتہد نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ یہ تصور کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے اس سخت معیار پر جانچا جائے تو شاید آئمہ اربعہ بھی پورے نہ اتر سکیں جیسا کہ امام شاطبی نے اس کا ذکر کیا ہے (۴۶) (اور الموافقات کے شارح شیخ عبداللہ دراز کے بقول اس معیار پر تو سارے صحابہ بھی پورے نہ اتر سکیں گے) (۴۷)۔ لہذا اصولیوں نے جو کم از کم شرائط رکھی ہیں ان کو پیش نظر رکھا جانا چاہئے نیز تجزء الاجتہاد کے نظریئے کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے یعنی جس مسئلے اور جزء میں اجتہاد مطلوب ہو اس میں مجتہدانہ بصیرت کافی ہے خواہ دوسرے شعبوں میں وہ شخص مجتہد نہ بھی ہو۔ ان حالات میں اگر علوم اسلامیہ کے چوٹی کے ماہرین کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے جن میں سے کچھ پر

جزئی مجتہد کا اطلاق ہو سکتا ہو اور کچھ میں کم از کم مطلوبہ صفات موجود ہوں تو وہ مقصد پورا ہو جائے گا جو شریعت کے پیش نظر ہے اور اس طرح یہ گمان غالب ہو جائے گا کہ ملک میں کوئی قانون اسلام کی تعلیمات کے خلاف نہ بن سکے گا ۔

خصوصاً موجودہ حالات میں کہ مغربی نظاموں کے تتبع میں اسمبلی کو ہر قسم کے اختیارات دے دیئے جاتے ہیں اور ایک اسلامی ملک میں مسلمان عوام کے لئے وہ لوگ قانون سازی کرتے ہیں جو دین کی بنیادی تعلیم سے بے بہرہ اور ناواقف ہوتے ہیں ایسے حالات میں اگر ہم ممکن حد تک اپنے پاس موجود اسلامی ٹیلنٹ کو حرکت میں نہیں لاتے تو زمانہ ہمارا انتظار نہیں کرے گا ۔ وقت اتنی تیزی سے گزر رہا ہے اور نظام حکومت اتنا پیچیدہ ہو گیا ہے کہ قانون سازی کی ہر وقت ضرورت ہے ایسے میں اگر علماء اسلام ، ہر قسم کے اختلاف کو پس پشت ڈال کر میدان میں نہیں آتے تو وہی ہو گا جو ہو رہا ہے کہ اسلام کے خلاف قانون سازی ہر اسلامی ملک میں ہو رہی ہے اور اس طرح پوری امت ایک ایسے اجتماعی گناہ اور عذاب میں مبتلا ہے جس سے چھٹکارہ مشکل ہو گیا ہے اور مغربی قانون پڑھے ہوئے مسلمان قانون دان یہ سمجھتے ہیں کہ ان ملاؤں کو قانون سازی کا کیا پتہ ہے یہ تو ہمارا حق ہے لہذا یہ ایک چیلنج ہے جو دینی اداروں اور تحریکوں کو فوراً قبول کرنا چاہئے بلکہ اس کے لئے بھرپور جدوجہد کرنی چاہئے کہ اس کے بغیر ملک کا صحیح راہ پر چلنا دشوار ہے ۔

پھر یہ تصور کرنے کی بھی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ علماء دین اور مغربی ماہرین قانون کو متحارب گروپ سمجھا جائے بلکہ اس کمیٹی اور اسمبلی کے اندر اور باہر ان دونوں عناصر کا تعاون حاصل کیا جانا چاہئے ۔ پھر قانون کی تعلیم کو جب تک اسلامی خطوط پر استوار نہیں کیا جاتا اور اس نئے نظام کے تحت ایسے لوگ تیار ہو کر نہیں نکلتے جو مغربی قانون سے واقفیت کے علاوہ اسلامی قانون کے بھی ماہر ہوں اس وقت تک اگر ہماری تجویز کردہ کمیٹی بن بھی جائے تو عملاً جو صورت حال ہو گی وہ یہی تو ہو گی کہ حکومتی او رپرائیویٹ بل بنانے والے یعنی ان کا مسودہ تیار کرنے والے مغربی قانون کے ماہرین ہی تو ہوں گے اور ہماری مجوزہ بااختیار کمیٹی کا فائدہ یہ ہو گا کہ کوئی غیر اسلامی قانون نہ بن سکے گا اور یہی ہر مسلمان کی خواہش بلکہ حسرت ہے کیوں کہ قرآن نے صاف اور واضح الفاظ میں کہا ہے کہ جو لوگ اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ ظالم ، فاسق اور کافر ہیں ۔ (۳۸) ۔

۳ ۔ اس تجویز میں ایک خوبی یہ ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو ان مفاسد سے بچایا جا سکے گا جن کا

ہم نے دوسری تجاویز کا جائزہ لیتے ہوئے ذکر کیا ہے یعنی حکمرانوں کی طرف سے تعیناتی یا ڈگریوں کا حصول اور علماء کا آپس میں انتخابی مقابلہ وغیرہ ۔ دوسری طرف علماء کو امیدوار کے طور پر اپنے آپ کو پیش کرنے کی غیر اسلامی حرکت نہیں کرنا پڑے گی ۔ پھر اس طرح وہ باوقار علماء بھی اوپر آسکیں گے جو براہِ راست انتخابی جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہتے ۔ متناسب نمائندگی کو اپنانے سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ ادارے مضبوط ہونگے اور افراد پر انحصار گھٹے گا ۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کی ہمیں آج ضرورت ہے کہ ملک میں مضبوط ادارے موجود ہوں تاکہ افراد آتے جاتے رہیں لیکن اداروں کے قائم ہونے کی وجہ سے ملک میں استحکام باقی رہے ۔

جہاں تک بعض لوگوں کی اس رائے کا تعلق ہے کہ اسلامی قانون سازی کے لئے مجلس قانون ساز صرف مجتہدین پر ہی مشتمل نہیں ہونی چاہئے بلکہ اس میں غیر مجتہد فنی ماہرین کی بھی گنجائش ہونی چاہیے کیونکہ یہ بھی ایک ناگزیر ضرورت ہے اور اصولیوں نے بھی اس کا اقرار کیا ہے کیونکہ کسی شرعی نتیجے پر پہنچنے کے لئے تنقیح مناط کی ضرورت ہوتی ہے اور تنقیح مناط کے لئے فنی مسائل کی حد تک علم دین میں رسوخ اصلاً شرط نہیں مثلاً اس تعین کے لئے کہ ایک سیّال مُسکر ہے یا نہیں اسے عالم دین کی بجائے کیمیائی تجزیے کے لیے لیبارٹری میں بھیجا جانا چاہئے اور اس شعبے کے فنی ماہر کا فیصلہ عالم دین اور مجتہد کے لئے بھی حجت ہوگا بلکہ اسی پر وہ اپنے فیصلے کی بنیاد رکھے گا ۔

ہمیں اس گنجائش اور ضرورت سے انکار نہیں ہے بلکہ ہم نے اپنی تجویز میں اس کا لحاظ رکھا ہے اول تو رائے عامہ کے نمائندے اور اکثر شعبوں کے متخصصین اسمبلی میں موجود ہوں گے ۔ (خصوصاً اس صورت میں جب کہ پارلیمان کے دو ایوان ہوں اور دوسرے ایوان کی ہیئت ترکیبی ایسی رکھی جا سکتی ہے کہ اس میں فنی ماہرین موجود ہوں) اور ہماری تجویز کے مطابق ہر مسودہ قانون پر ابتدائی بحث میں وہ ماہرین حصہ لے کر اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں بلکہ آخری مرحلے پر بھی مداخلت کر کے اور ترمیمات تجویز کر کے اجتہاد کمیٹی کو واپس بھجوا سکتے ہیں ۔ دوسرے یہ کہ ہماری تجویز میں خود اس اجتہاد کمیٹی کے لئے یہ گنجائش موجود ہے کہ وہ جب بھی ضرورت سمجھے کسی مسئلے میں فنی ماہرین سے رجوع کر سکتی ہے اور کسی فیصلے تک پہنچنے کے لئے ان سے مدد لے سکتی ہے ۔ ان حالات میں یہ ضروری نہیں ہے کہ اس قانون ساز کمیٹی کے اندر ان غیر مجتہد فنی ماہرین کو ضرور ہی لیا جائے کیونکہ اصل چیز تو اس ضرورت کا پورا کئے جانا ہے نہ کہ کسی خاص شکل میں ان کی کمیٹی میں موجودگی ۔

۴۔ یہاں ایک اعتراض بعض علماء کی طرف سے آسکتا ہے اور وہ یہ کہ مجلس اجتہاد بنانے کا کام "سرکاری سطح" پر کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ یہ نقصان دہ بھی ثابت ہوسکتا ہے اور یہ کہ اجتماعی اجتہاد کی وہ صورت جو ماضی میں اختیار کی گئی اسی پر اب بھی عمل ہونا چاہئے ۔ ماضی میں فقہ کی ترقی و نمو عوامی سطح پر ایسے علماء کے ذریعے ہوئی جو متقی اور صالح تھے لیکن حکومت سے باہر تھے اور وہی صورت اب بھی اختیار کی جانی چاہئے ۔

اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ فقہِ اسلامی کی تاریخی نمو جس طرح ہوئی کیا وہ ایک طے شدہ اور مثالی طریق کار تھا یا وہ حوادث زمانہ کے پیش نظر ، ان مخصوص حالات کے اندر ایک ناگزیر طریق کار (Best in the situation) تھا ؟ اور کیا اُن سیاسی اور اجتماعی حالات کے بدل جانے کے بعد معاملے پر از سر نو غور کیا جاسکتا ہے یا نہیں ؟ ہمارے نزدیک دوسرا نقطۂ نظر صحیح ہے اور اس کے دلائل یہ ہیں :

خلافت راشدہ میں اور خصوصاً حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کے زمانے میں جتنے بھی اجتہادی فیصلے ہوئے وہ "سرکاری" سطح پر ہوئے اور ان کی حیثیت "شورائی اجتہاد" کی تھی ۔ اگرچہ ان میں آزادانہ بحث و مناظرہ ہوا ، بعض حضرات نے کھلم کھلا خلیفۂ وقت (جو خود بھی مجتہد ہوتا تھا) کی رائے سے باصرار اختلاف کیا ، لیکن فیصلہ بہر حال خلیفہ کی صدارت میں اور شوریٰ کی رائے سے ہوا ۔ اب یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ خلافتِ راشدہ کا نظام جاری نہ رہ سکا اور اس نظام کو جاری رکھنے کی جدوجہد میں مصلحینِ امت اور سیاسی حکمرانوں کے درمیان جو تصادم ہوا وہ بظاہر پہلے فریق کی شکست پر منتج ہوا ۔ اس کے ساتھ ہی حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت پر جو صدمہ علماء و صلحاء امت کو پہنچا اور اس سے جو رویے مستحکم ہوئے انہوں نے اصحاب اقتدار اور اہل علم میں ایک مستقل تفریق سی پیدا کردی ۔ علماء نے اقتدار سے قطع تعلق کرلیا اور مسجد و مدرسہ پر اپنی توجہ مرکوز کردی اور سیاسی حکمران آہستہ آہستہ دنیادار ہوتے گئے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنو امیہ کے ابتدائی حکمرانوں میں جو علم اور دینی رسوخ موجود تھا وہ بعد میں معدوم ہوتا چلا گیا اور خلافت میں ملوکیت کی ساری کمزوریاں جمع ہوگئیں ۔

اس تفریق کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ شوریٰ کا ادارہ ختم ہوگیا ، حکمرانوں نے اپنی من مانی شروع کردی اور امور مملکت میں مشورے کے لئے وہ اپنے وزرا اور حکام پر تکیہ کرنے لگے ، لیکن جہاں تک دینی امور کا تعلق تھا چونکہ ایسے حکمران اور ایسی شوریٰ باقی نہ رہی تھی جس پر عوام کو اعتماد ہوتا ۔ (کیونکہ حکمران اپنی سیاسی اغراض کی خاطر ایک ایسی شوریٰ بنانے پر تیار نہ تھے جس

کو کوئی قوت اور رسوخ حاصل ہوتا اور ان کی اپنی مرضی نہ چل سکتی) لہذا عوام نے دینی مسائل میں علماء و صلحاء امت سے رجوع شروع کر دیا اور اجتماعی شورائی پلیٹ فارم کی غیر موجودگی میں معاملات انفرادی فتاویٰ پر چلنے لگے اور یہ سلسلہ اسی وقت سے جاری ہے تا آنکہ پچھلی صدی ہجری میں اتاترک نے قبائے خلافت چاک کر دی ۔ اس کے بعد مسلمان ممالک آہستہ آہستہ مغربی قوموں کی سیاسی غلامی سے آزاد ہونا شروع ہوئے اور اب ان کی کثیر تعداد آزاد ہو چکی ہے ۔ کمزوری اور زیر دستی کے بعد اب جو استقلال اور آزادی کا دور شروع ہوا ہے اور اس میں جو سیاسی ادارے وجود میں آئے اور آ رہے ہیں ان کی اپنی خوبیاں اور کمزوریاں ہیں (جس طرح کہ پرانے وراثتی خلافتی نظام کی بعض خوبیاں اور کمزوریاں تھیں) ۔

موجودہ دور کے مسلمان معاشروں کا المیہ یہ ہے کہ یہاں مغربی فکر اور مغربی تہذیب و تمدن کا غلبہ ہے ۔ ہمارے پڑھے لکھے لوگوں کی ایک بڑی تعداد (خصوصاً وہ لوگ جو قانون و سیاست اور انتظامِ ملکی سے متعلق ہیں) مغرب کے اس تعلیمی اور تہذیبی اثرات کے حصار سے نکلنے پر قادر نہیں ہیں ، بلکہ اس کا ارادہ بھی نہیں رکھتے ۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں انہیں نفسیاتی ، معاشی ، معاشرتی اور پیشہ ورانہ الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور قربانی دینا پڑتی ہے ۔ اس ضمن میں ایک تازہ مثال بے مصرف ثابت نہ ہوگی ۔ فقہ اسلامی کے ایک بڑے مؤید اور مفکر کے فرزند ارجمند نے (جو اتفاق سے عدالت عظمیٰ کے جج بھی ہیں) فرمایا ہے کہ اجتہاد کے لئے عربی جاننے کی شرط ختم کر دی جائے (۳۹) (تاکہ وکلاء اور جج اجتہاد کر سکیں کیونکہ قرآن و سنت کو سمجھنے کا دعویٰ تو ترجموں کی مدد سے بھی کیا جاسکتا ہے) ۔ اب ان محترم جج صاحب سے کون پوچھے کہ کیا وہ تصوّر کر سکتے ہیں کہ کوئی صاحب "انگریزی قانون" میں پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھیں اور انہیں انگریزی زبان نہ آتی ہو یا یہ مطالبہ کیا جائے کہ ڈاکٹروں پر سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کرنے کی شرط ختم کر دی جائے ۔ بہرحال ذکر یہ ہو رہا تھا کہ ہمارے اکثر برسرِ اقتدار لوگوں پر مغربی تہذیب نے یہ جادو کر رکھا ہے کہ وہ اسے معیار سمجھتے ہیں اور اسلام نے جو معیار ہمیں دئے ہیں ان پر غور کرنے کے لئے وہ تیار ہی نہیں ہیں ۔

اجتہاد کے لئے عربی زبان جاننے کی اہمیت

مغربی جمہوری نظام میں چونکہ حاکمیت عوام کی ہوتی ہے ، اس لئے جو لوگ ان کے نمائندے منتخب ہوتے ہیں انہیں قانون سازی کا مطلق حق حاصل ہوتا ہے یہ بات اسلامی معاشرے میں سرے سے موجود ہی نہیں کیونکہ اسلام میں مسلمانوں کے لئے (مطلق) قانون

سازی کا کوئی تصور ہے ہی نہیں ۔ یہاں قانون دینے والے خود سبحانہ تعالیٰ ہیں (گو ہمارے لئے اجتہاد کے دروازے کھلے ہیں) ۔ اب پچھلی صدیوں کے عظیم فقہی سرمائے پر ذرا ایک نظر ڈالئے اور بتائیے کہ کیا اس عرصے میں کوئی ایک بھی ایسا عالم ، فقیہہ یا اصولی گزرا ہے جس نے یہ کہا ہو کہ اجتہاد کے لئے قرآن و سنت اور عربی زبان میں رسوخ شرط نہیں ہے ؟ اس کے برعکس ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ امام غزالی نے فرمایا : "ایک عام آدمی اجتہاد نہیں کر سکتا کیونکہ اہلیت نہ رکھنے کی وجہ سے وہ اس کام کے لئے اسی طرح نااہل ہے جس طرح نابالغ بچہ اور فاترالعقل آدمی" ۔ (۴۰) اور امام شافعی نے فرمایا : اجتہاد کی اہلیت نہ رکھنے والا اگر اجتہاد کرے تو اس کی حیثیت اس اندھے کی سی ہے جو خود بھی رستہ نہیں دیکھ سکتا (دوسرے کو کیا دکھائے گا ؟) اس کے باوجود اگر وہ اجتہاد کرے تو گناہ گار ہو گا ، حکومت کو چاہیئے کہ زبردستی اسے اس کام سے روک دے (۴۱) ۔ اور عربی زبان کے متعلق تو امام شاطبی نے یہاں تک کہا ہے کہ "اجتہاد کرنے والے کو مجتہد فی اللغہ ہونا چاہیئے اگرچہ یہ اجتہاد کے وسائل میں سے ہے" ۔ (۴۲)

اسمبلی اور بورڈ

تو کیا اس قسم کی صفات ہماری قومی اسمبلی یا مجلس شوریٰ کے ممبران میں ہوتی ہیں (جن کا ذکر فقہاء اور اصولیوں نے متفقہ طور پر کیا ہے) یا کیا یہ شرائط رکھ کر قومی اسمبلی کے لئے الیکشن کروائے جا سکتے ہیں ؟ ظاہر ہے یہ ناممکن ہے اور نہ اس پر کوئی تیار ہو گا ۔ اب دوسری طرف دیکھئے کہ اگر علماء و اسلامی سکالرز کی کوئی کونسل یا بورڈ بنایا جائے تو اسے "مشاورتی" کا درجہ دے دیا جائے گا اور بات پھر انہی حکمرانوں اور سول سروس کے بزرجمہروں پر پہنچ کر رک جائے گی کہ وہ مناسب سمجھیں تو اس کونسل یا بورڈ کی سفارشات کو مانیں اور چاہیں تو نہ مانیں ۔ (جیسا کہ نظریاتی کونسل کی سفارشات کا حشر ہمارے سامنے ہے) ۔

موجودہ زمانے میں اس اعتماد اور پہچان کی ایک ہی صورت قابل اعتماد رہ گئی ہے اور وہ انتخابات کی ہے ، لہذا ہمیں کوئی ایسا راستہ سوچنا ہو گا کہ الیکشن کی قباحتوں سے بچ کر اس طرح کے لوگ مجلس شوریٰ یا اسمبلیوں میں پہنچ سکیں تاکہ وہ اجتہاد کر سکیں اور یہ اجتہاد امت کے لئے قابل قبول بھی ہو ۔ ورنہ اگر دین سے ناواقف لوگ اجتہاد کرتے بھی رہیں اور قانون بناتے بھی رہیں تو ان کی یقیناً کوئی پذیرائی نہ ہو گی ۔ وہ غیر اسلامی قانون بناتے رہیں گے اور لوگ ان کی مخالفت کرتے رہیں گے اور اس طرح ہماری صلاحیتیں باہمی انتشار کا شکار ہوتی رہیں گی اور ہم عنداللہ ماخوذ بھی ہوں گے ۔

مسئلے کا حل

یہاں اس کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ شوریٰ یا پارلیمنٹ کے سارے ممبران میں مجتہدین والی صفات و شرائط موجود ہونی چاہئیں بلکہ خلفاء راشدین کے تعامل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شوریٰ میں دو طرح کے لوگ تھے ۔ ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جو قبیلوں کے سربراہ اور علاقوں کے معززین تھے اور اس کے ساتھ ہی کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو قرآن و سنت اور فقہ کا گہرا اور خصوصی علم رکھتے تھے ۔ عمومی مسائل میں ساری شوریٰ سے رائے لی جاتی تھی لیکن پیچیدہ دینی اور فقہی مسائل میں صرف ان متخصص حضرات کو رائے اور بحث کے لئے بلایا جاتا تھا (۴۳) ۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے آج یہ کہا جاسکتا ہے کہ شوریٰ میں اکثریت ان لوگوں کی ہو سکتی ہے جو عوام کے معتمد ہوں ، ان میں بارسوخ ہوں ، اسلامی احکام کو جاننے والے اور ان پر عمل کرنے والے ہوں اور زندگی کے مختلف شعبوں کے مسائل سے واقفیت رکھتے ہوں ، لیکن ان ممبران میں بہرحال کچھ تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہونی چاہیئے جو قرآن و سنت نیز فقہ اور عربی زبان میں خصوصی مہارت رکھتے ہوں ، فقہی اور قانونی معاملات میں ان کی رائے کو باقی لوگوں کی آراء کے مقابلے میں خاص وزن حاصل ہونا چاہیئے ۔

ایک آئینی و دستوری نظام

رہا یہ سوال کہ اس سیدھی سادھی بات کو قانونی اور دستوری شکل کیا دی جائے ؟ تو، جیسا کہ ہم نے کہا، اس کی کئی صورتیں ممکن ہیں ۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ الیکشن میں سیاسی جماعتیں حصہ لے رہی ہوں اور انتخابات متناسب نمائندگی کی بنیاد پر ہوں ۔ سیاسی جماعتوں کو پہلے سے باخبر کر دیا جائے کہ انہیں اپنی فہرست میں علماء اور سکالرز کو رکھنا چاہیئے جو کامیابی کی صورت میں اسمبلی کے اندر ان کی نمائندگی کر سکیں ۔ اسمبلی میں سیاسی جماعتوں کی حاصل کردہ نشستوں کے تناسب سے ہر جماعت کو ایک ایسی کمیٹی میں نمائندگی دی جائے جسے "اجتہاد کمیٹی" کہا جائے ۔ یہ ایک خود مختار کمیٹی ہو جو اپنا چیئرمین خود چنے اور اپنا طریق کار خود وضع کرے ۔ آئین میں یا انتخابی قواعد میں ایک قانون کا اضافہ کیا جائے جس میں اس کمیٹی کے ممبران کی صفات و شرائط بیان کر دی جائیں ، (اور یہ شرائط وہی ہوں جو سارے علماء و فقہا اور اصولیوں کے نزدیک متفقہ ہیں اور جو مجتہدین کی صفات کے طور پر فقہ اور اصول فقہ کی ساری کتابوں میں ملتی ہیں اور کمیٹی کو یہ حق ہو کہ اگر وہ کثرت رائے سے یہ سمجھے کہ اس کے کسی ممبر میں اس طرح کی مطلوبہ صفات نہیں پائی جاتیں ، تو وہ اس کی رکنیت ختم کر دے اور متعلقہ سیاسی جماعت اس کی جگہ اسمبلی میں

منتخب شدہ کسی دوسرے آدمی کا نام دے ۔ سارے مسودہ ہائے قانون مجلس شوریٰ میں ابتدائی اور عمومی بحث کے بعد اس کمیٹی کو بھجوا دئے جائیں ، اس کمیٹی کو یہ اختیار ہو کہ وہ ہر قسم کے ماہرین کی خدمات سے استفادہ کر سکے ۔ اس کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہو ۔ یہ گنجائش بھی رکھی جا سکتی ہے کہ اسمبلی کے باقی ممبران اور صدر مملکت اس کمیٹی کے پاس کردہ بل کو غور کے لئے مع مطلوبہ ترمیمات کے اس کے پاس واپس بھجوا سکیں لیکن انہیں یہ اختیار نہیں ہونا چاہئے کہ وہ اس کمیٹی کے فیصلوں کو رد کر سکیں ۔ پرانے غیر اسلامی قوانین پر نظر ثانی کا کام بھی یہی کمیٹی کر سکتی ہے ۔ اس کمیٹی کے پاس کردہ کسی بھی قانون کو عدالت عظمیٰ میں اس بنیاد پر چیلنج کرنے کی راہ بھی رکھی جا سکتی ہے کہ وہ قرآن و سنت کے خلاف ہے ، لیکن اس کے ساتھ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ عدالت کے جج صاحبان بھی قانون شریعت کے ماہرین پر مشتمل ہوں اور ان صفات کے حامل ہوں جو اس اجتہاد کمیٹی کے ممبران کے لئے قانون نے مقرر کی ہوں ۔

ہماری رائے میں صرف اس طرح کا ایک ادارہ ہی ہماری موجودہ قانونی مشکلات کا حل ثابت ہو سکتا ہے جو منتخب اور با اختیار بھی ہو اور اہل لوگوں پر مشتمل بھی ہو ۔ غیر جماعتی الیکشن کی صورت میں یہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ جو علماء اور سکالرز بھی منتخب ہو کر اسمبلی میں پہنچیں ، ان پر مشتمل یہ کمیٹی بنا دی جائے ۔ باقی تفصیلات ممکنہ حد تک وہی ہوں جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے ۔

حواشی

۱ ۔ الاعراف ۔ ۵۴
۲ ۔ یوسف ۔ ۴۵
۳ ۔ آل عمران ۔ ۱۵۴
۴ ۔ النحل ۔ ۱۱۶
۵ ۔ المائدہ ۔ ۱۴۵
۶ ۔ یونس ۔ ۱۴ اور البقرہ ۳۵
۷ ۔ الذاریات ۔ ۵۶، النحل ۔ ۵۷
۸ ۔ النحل ۔ ۱۱۶
۹ ۔ المائدہ ۔ ۴۵
۱۰ ۔ النساء ۔ ۸۵
۱۱ ۔ الغزالی، المستصفی ج ۱ ص ۸ طبع دار صادر
۱۲ ۔ آل عمران ۔ ۱۵۹
۱۳ ۔ ہفت روزہ ایشیا، لاہور ۔
۱۴ ۔ النساء ۔ ۸۳
۱۵ ۔ عبدالوهاب خلاف، السلطات الثلاث فی الاسلام (مجلہ "القانون والاقتصاد عدد ۴۵۹ طبع مارس ۱۹۳۶)
د/ عبدالحمید متولی، ازمۃ الفکر السیاسی الاسلامی فی العصر الحدیث ص ۳۱۵ طبع منشأۃ المعارف بالاسکندریہ ۔
۱۶ ۔ د/ ضیاء الدین الریس، النظریات السیاسیۃ الاسلامیۃ ص ۳۳۵ الطبعۃ الرابعۃ ۱۹۶۶ء
۔ د/ ثروت بدوی، اصول الفکر السیاسی والنظریات والمذاہب السیاسیۃ الکبریٰ ص ۱۲۸ طبع ۱۲۸
۱۸ ۔ البغدادی، اصول الدین ص ۲۷۹
۱۹ ۔ الماوردی، الاحکام السلطانیہ ص ۷، ۱۰۶، ۱۲۰
۲۰ ۔ شیخ ذکریا البری، اصول الفقہ، ج ۱ ص ۱۲ [illegible]
۲۱ ۔ د/ سلیمان الطحاوی، السلطات الثلاث [illegible]
۲۲ ۔ د/ عبدالحمید [illegible] قاہرہ ۱۹۷۸ء ۔

۲۳ ـ د/القطب محمد القطب ، الاسلام و حقوق الانسان، ص ۶۳۵ طبع دار الفکر العربی بالقاہرہ ۱۹۷۶م
۲۴ ـ د/علی محمد حسنین ، الرقابۃ الشعبیۃ علی اعمال السلطۃ التنفیذیۃ ـ رسالہ دکتوراہ مقدمہ بکلیۃ الشریعۃ والقانون ، جامعہ الازہر عام ۱۹۷۹ء م ، ص ۵۱۰
۲۵ ـ د/الشیخ یوسف القرضاوی، الحلول المستوردہ وکیف جنت علی امتنا ، ص ۷۷ طبع مؤسسۃ الرسالۃ بیروت ۱۹۷۱م
ـــ د/حسن صبحی احمد عبد اللطیف ، الدولۃ الاسلامیۃ وسلطتہا التشریعیۃ ص ۲۹۸، طبع مؤسسۃ شباب الجامعۃ
۲۶ ـ پرائیویٹ دینی مدارس اپنی محدود صلاحیتوں کے مطابق اب تک یہ کام کر رہے تھے ، اسلام آباد کی عالمی اسلامی یونیورسٹی اس میں ایک خوشگوار اضافہ ہے ـ
۲۷ ـ آل عمران ـ ۱۵۹ ـ
۲۸ ـ تفسیر طبری ص ۳۴۰ طبع مصر
۲۹ ـ تفسیر قرطبی ج ۴ ص ۵۰، طبع القاہرہ
۳۰ ـ الرازی ، التفسیر الکبیر ج ۹ ص ۶۶ طبع مکتبہ البہیۃ المصریۃ
۱۳ ـ ابن تیمیہ ، السیاسۃ الشرعیۃ ص ۱۷۵ طبع بیروت
۳۲ ـ تفسیر القرطبی ج ۴ ص ۴۹، طبع دار الکتاب العربی
۳۳ ـ علامہ ابوبکر الجزائری ، الدستور الاسلامی ص ۸۵ طبع المکتب الاسلامی ـ
۳۴ ـ د/عبد الکریم زیدان ، مجموعہ بحوث فقہیہ، ص ۱۰۴ طبع بغداد
۳۵ ـ Dr. Mohammad Iqbal. The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Pub. Institute of Islamic Culture, Lahore,. P-140
۳۶ ـ الشاطبی ، الموافقات ج ۴ ص ۱۰۹ طبع دار الباز للنشر والتوزیع ، مکہ المکرمۃ ـ
۳۷ ـ الشاطبی ، الموافقات ج ۴ ص ۱۰۹
۳۸ ـ المائدہ ـ ۴۴، ۴۵، ۴۷
۳۹ ـ نوائے وقت لاہور ۸۶/۱۰/۲ و ۸۷/۴/۲۲
۴۰ ـ غزالی ، المستصفی ج ۱ ص ۱۸۲ طبع دار الصادر
۴۱ ـ شافعی ، الرسالہ ، ص ۵۰۹ طبع دار التراث بالقاہرہ
۴۲ ـ شاطبی ، الموافقات ج ۴ ص ۱۰۸ طبع المکتبہ التجاریہ
۴۳ ـ معاصرین میں سے جنہوں نے اس رائے کو اختیار کیا ہے ان میں شیخ زکریا البری (مجلہ عالم الفکر الکویت، شمارہ جنوری ـ مارچ ۱۹۷۱ء ، ص ۱۳۱) اور ڈاکٹر محمد یعقوب الملیجی (کتاب مبدأ الشوریٰ فی الاسلام ، ص ۲۳۳ طبع اسکندریہ) قابل ذکر ہیں ـ یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ سیاسہ شرعیہ پر لکھنے والے

مسلمان فقہاء نے ان میں "علماء" اور "اہل الاجتہاد" کو شامل کیا ہے ، مثال کے طور پر ملاحظہ ہو ۔

۱) عبد القاہر البغدادی ، اصول الدین ، صفحہ ۲۷۹ طبع بیروت ۱۴۰۰ھ

۲) قاضی ابو یعلیٰ ، الاحکام السلطانیہ ، طبع مصر ۱۳۸۰ھ

۳) امام نووی ، منہاج الطالبین و عمدۃ المفتیین ، ص ۱۲۰ ، طبع مصر ۱۳۸۰ھ

باب پنجم

اسلامی قانون اور عدالتیں

کیاموجودہ عدالتی ڈھانچہ اسلامی ہے ؟

وفاقی شرعی عدالت کے ایک سابق چیف جسٹس نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہمارا موجودہ عدالتی ڈھانچہ اسلامی ہے کیونکہ ججوں کی بڑی اکثریت مسلمان ہے، اسلامی فقہ کا شخصی قانون انہوں نے باقاعدہ پڑھا ہوا ہے اور انہوں نے عدالت کے بہت سے ججوں کو اسلامی فقہ کی باتیں کرتے سنا ہے (۱) ۔ عدلیہ کے دوسرے ممبران کی رائے بھی تقریباً ایسی ہی ہے (۲) (اگرچہ بعض ایسے حقیقت پسند جج بھی ہیں جو اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں) (۳) عدلیہ کے ان معزز آفیسرز کی رائے ایسی کیوں ہے ، اس کا نفسیاتی تجزیہ ہم بعد میں کریں گے اس وقت ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس رائے سے اتفاق کرنا بہت مشکل ہے ۔

کسی بھی عدالتی نظام کے اسلامی ہونے کا معیار آخر کیا ہے ؟ ہمارے نزدیک کوئی عدالتی نظام بھی اس وقت تک صحیح اسلامی عدالتی نظام نہیں ہو سکتا جب تک اس میں مندرجہ ذیل صفات نہ ہوں :

۱ ۔ وہ بالاتر قانون جس کے مطابق عدالتوں میں فیصلے کئے جائیں وہ صرف شریعت (قرآن و سنت) ہو ۔

۲ ۔ جو لوگ عدالتوں میں فیصلے کریں وہ قانون شریعت کے ماہر ہوں نیز لوگوں کو ان کے اعلیٰ کردار پر اعتماد ہو ۔

۳ ۔ انصاف بلاتاخیر ملے ۔

۴ ۔ انصاف سستا اور عام آدمی کی دسترس ہو ۔

۵ ۔ انصاف سب کے لئے یکساں ہو ۔

یہ وہ بنیادی اور عمومی اصول ہیں جو قرآن و سنت سے مستنبط شدہ ہیں ۔ اب ایک نظر اپنے عدالتی ڈھانچے پر ڈالئے اور اسے ان عمومی اصولوں پر پرکھئے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارا عدالتی ڈھانچہ کتنا اسلامی ہے !

۱۔ ہماری عدالتوں میں شریعت آخری اتھارٹی اور بالاتر قانون نہیں ہے ، پاکستان کے دستور

میں کوئی ایسی شق موجود نہیں ہے ، جس سے عدالتیں اس امر کی پابند ہوں کہ وہ صرف قرآن و سنت کے مطابق ہی فیصلے کریں ۔ اسلامی عناصر نے بڑی ردّوکد کے بعد جو رہنما اصول دستور میں رکھوائے ہیں یا قراردادِ مقاصد پاس کر دائی ہے ان میں سے کسی کی بھی یہ پوزیشن نہیں ہے کہ عدالتوں کو اسلام کے مطابق فیصلے کرنے کا پابند بنایا جا سکے ۔ چنانچہ جسٹس تنزیل الرحمٰن نے سندھ ہائی کورٹ میں جو فیصلے قراردادِ مقاصد کے آئین کا حصہ بن جانے کے بعد اس کی روشنی میں کئے تھے انہیں سپریم کورٹ نے ختم کر دیا ۔ جہاں تک شریعت آرڈیننس ۱۹۸۸ء کا تعلق ہے اس میں یہ سہولت ضرور رکھی گئی ہے کہ اعلیٰ عدالتیں کسی قانون کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کر سکتی ہیں ، لیکن اول تو یہ ایک آرڈیننس ہے ، آئین کے تابع ہے اور اس کا ناسخ نہیں ہے ۔ دوسرے یہ کہ اس میں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ عدالتیں صرف شریعت کے مطابق فیصلے کرنے کی پابند ہوں گی یا یہ کہ شریعت ہی اس ملک کا بالاتر قانون (آئین) ہوگی ۔

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دَور میں جو وفاقی شرعی عدالت بنائی گئی ، صرف اس کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ شرعی نقطۂ نظر سے کسی قانون کا جائزہ لے سکتی ہے اور جو قوانین اس کی رائے میں غیر اسلامی ہوں انہیں کالعدم قرار دے سکتی ہے لیکن اس کا دائرۂ کار کافی محدود رکھا گیا ہے کیونکہ اس میں مندرجہ ذیل چار بنیادی امور سے متعلق قوانین شامل نہیں ہیں :

۱۔ سارے مالی قوانین
۲۔ سارے شخصی قوانین
۳۔ ہر قسم کے پروسیجرل قوانین
۴ ۔ آئینِ پاکستان

اسلامی طاقتیں جمہوری جدوجہد کے ذریعے دفاقی شریعت کے دائرۂ کار پر ان پابندیوں کو ختم کرانے کی کوششیں کرتی رہی ہیں اور حکومت بھی اس میں کسی حد تک لچک دکھاتی رہی ہے لیکن پورے عدالتی نظام پر شریعت کو غالب کرنے کی کوشش آج تک کسی حکومت نے نہیں کی حالانکہ اسلامی نظریاتی کونسل اس سلسلے میں کئی دفعہ سفارشات پیش کر چکی ہے تاہم جو نفاذِ شریعت آرڈیننس جنرل ضیاء الحق نے جون ۱۹۸۸ء میں نافذ کیا ہے اس میں شخصی قوانین اور مالی قوانین کو غیر اسلامی قرار دینے کے اختیارات ہائی کورٹوں کو بھی دے دیئے گئے ہیں ۔

۲ ۔ جہاں تک ہماری عدالتوں کے ججوں کا تعلق ہے تو معمولی ضلعی عدالت سے لے کر سپریم کورٹ تک جتنے بھی جج ہیں ، انہوں نے اسلامی قانون کی تعلیم کہیں نہیں پائی ، نہ ہی اس سلسلے

میں ان کی کوئی تربیت ہوئی ہے ۔ لہذا ہماری عدالتوں میں گنتی کے ان چند ایک ججوں کے علاوہ جنہوں نے اپنی ذاتی کوشش سے اسلامی فقہ کا مطالعہ کیا ہے ، ہمارے ججوں کی عظیم اکثریت اسلامی فقہ میں ماہر نہیں ہے ۔

اس کے برعکس انہوں نے انگریزی قانون کی تعلیم پائی ہے ، اس کی تربیت حاصل کی ہے اور اسے ہی عملاً برت کر اس کا تجربہ حاصل کیا ہے ۔ اب ایسے جج حضرات سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اسلامی فقہ کے مطابق فیصلے کریں گے ایک نہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کیونکہ جَو بو کر گندم کاٹنے کی توقّع کرنے والے کو کوئی بھی عقلمند نہیں کہہ سکتا ۔ اور بعض سمجھ دار جج تو اس حقیقت کے اعتراف میں بھی بخل سے کام نہیں لیتے چنانچہ وفاقی شرعی عدالت کے ایک معزز جج نے ایک دفعہ یہ تسلیم کیا تھا کہ ہم نے تو عمر بھر انگریزی قانون کی پریکٹس کی ہے اور اسی کے مطابق منصفی کی ہے ، جہاں تک اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کرنے کا تعلق ہے ہمیں اس میں علماء کی مدد کی ضرورت ہے (۴) نہ

یہ کہنا کہ چونکہ جج مسلمان ہیں اس لئے وہ شریعت ہی کے مطابق فیصلے کرتے ہیں بالکل کمزور بات ہے، کیا یہ بات قابلِ تصور ہے کہ انگلینڈ میں کسی آدمی کو صرف اس بنیاد پر کہ اسے انگریزی قانون سے عمومی واقفیت ہے ، عدالت عالیہ کا جج بنا دیا جائے ؟ ہر کہیں جج کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ جس قانون کے مطابق اس نے فیصلہ کرنا ہے وہ اس کا ماہر ہو ، اس کی باریکیوں سے واقف ہو ، اس میں اعلیٰ پائے کی تحقیقی صلاحیت رکھتا ہو ، اس کا مزاج شناس ہو، اس کے مطابق فیصلے کرنے کی باقاعدہ تربیّت پائے ہوئے ہو ۔ ہمارے ہاں عدلیہ کے ججوں کی تعلیم و تربیت کا سارا انتظام انگریزی قانون کے مطابق ہے لہذا وہ اس قانون کے مطابق فیصلے کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں ، وہ سمجھدار ، قابل اور ذہین جج ہیں ، اپنا کام ذہانت اور عقلمندی سے کرتے ہیں ، ہم انہیں قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے جب تک کہ اس نظام کے تانے بانے کو نہ توڑا جائے جس کا وہ ایک حصہ ہیں ۔ اور انہیں اسلامی قانون میں تعلیم و تربیت کا موقع نہ دیا جائے ۔

اسلام کے عدالتی نظام کی ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ جج صاحبِ کردار ہوں ، لوگوں کو ان کی ذہانت کے علاوہ ان کی دیانت اور ان کے تقوی پر بھی اعتماد ہو ، جہاں تک ہمارے عدالتی نظام کے نچلے حصے کا تعلق ہے تو اس کی حالت ناگفتہ بہ ہے ، عدلیہ کی اہانت مقصود نہیں اور نہ ہمارے دل میں عدلیہ کے کسی حصے کے خلاف کوئی تعصب ہے لیکن معاشرے کا ایک عام فرد

ہونے کی حیثیت سے جو ہم دیکھتے اور سنتے ہیں وہ یہی ہے کہ نچلی سطح پر عدلیہ میں بدعنوانی کی شکایت لوگ عام طور پر کرتے ہیں ۔ اعلیٰ عدالتوں میں اگرچہ عمومی معیار اچھا سمجھا جاتا ہے لیکن وہاں بھی کمزور کردار کے افراد بعض اوقات اوپر آجانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں جس کی ایک وجہ تو ججوں کے انتخاب میں سیاسی عمل دخل ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ کامن لاء کی روایت کے مطابق جج بار سے لئے جاتے ہیں اور وکلاء کے کردار کے بارے میں جہاں تک ہماری رائے عامہ کا تعلق ہے وہ عمومی طور پر اچھی نہیں ہے ۔

۳۔ ہمارے عدالتی نظام کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں انصاف تاخیر سے ملتا ہے ، یہ موجودہ زمانے ہی کا محاورہ نہیں ہے کہ انصاف میں تاخیر انصاف سے انکار کے مترادف ہے بلکہ خود عین اسلامی نظام کا تقاضا بھی یہی ہے کہ انصاف بروقت ہو اور خلافتِ راشدہ کا زمانہ گواہ ہے کہ وہاں فیصلے فوری ہوتے تھے ۔ یہاں یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت زندگی سادہ تھی اور مسائل کم تھے اس لئے یہ ممکن تھا لیکن ہم عصرِ حاضر کی مثال دیتے ہیں ، سعودی عرب میں جہاں اس وقت تک عدلیہ کا انتظام بڑی حد تک اسلامی اصولوں پر چل رہا ہے ، فیصلے بڑے جلدی ہوتے ہیں ، بڑے سے بڑا قضیہ چند ہفتوں میں نمٹ جاتا ہے حالانکہ وہاں بھی عدالتوں کا دوہرا اور تہرا نظام موجود ہے ۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں دیکھئے کہ دیوانی ہو یا فوجداری ، مقدمہ برسوں چلتا رہتا ہے، انصاف کے طالب اور مدّعی ختم ہوجاتے ہیں لیکن مقدمہ ختم نہیں ہوتا ۔

اس خرابی کے اسباب کئی ایک ہیں لیکن اس کا سب سے بڑا سبب ہمارے عدالتی نظام کا پیچیدہ طریقِ کار ہے ، پولیس کے ذریعے بنیادی تفتیش ، کچی پیشی ، پکی پیشی ، سمن ، دونوں سمتوں سے گواہوں کا ایک ایک کرکے بھگتنا ، پھر ان پر جرح ، جوابی جرح اور پھر فیصلہ اس طریقے سے مقدمہ سالوں گھسٹتا رہتا ہے اور فیصلہ ہونے کو نہیں آتا ۔ انصاف میں تاخیر کا ایک سبب ججوں کی کمی بھی ہے اور اس پر ستم ظریفی یہ کہ نچلی سطح پر حکومت نے انہیں انتظامی کاموں میں بھی پھنسا رکھا ہے اور اگرچہ کئی حکومتوں نے عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کردینے کا وعدہ کیا ہے تاکہ عدالتی افسران یکسوئی سے انصاف مہیا کرنے کا کام کرسکیں لیکن اس پر آج تک عمل درآمد نہیں ہوسکا ، اس سے نہ صرف عدالتی افسران کا وقت ضائع ہوتا ہے بلکہ حکومت کے لئے کام کرنے کی وجہ سے ان کی غیر جانبداری اور نیک نامی پر بھی حرف آتا ہے ۔

۴۔ ہمارے عدالتی نظام کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ یہاں انصاف بکتا ہے اور اتنا مہنگا بکتا ہے کہ لوگوں کے بنیادی اثاثے بک جاتے ہیں لیکن وہ انصاف پھر بھی نہیں خرید سکتے ۔ اسلامی نظریاتی کونسل اور دوسرے کئی ایک ادارے حکومت کی توجہ کئی بار اس طرف مبذول کرواچکے ہیں

کہ کورٹ فیس ختم کردی جائے کیونکہ اسلام میں اس کا کوئی تصور سرے سے موجود ہی نہیں ہے ، بلکہ یہ اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کے لئے انصاف مہیا کرنے کا سامان کرے لیکن آج تک اس پر بھی پوری طرح عمل نہیں ہوا ۔ پھر چونکہ مقدمے برس ہا برس چلتے ہیں لہٰذا آمدنی کے اوقاتِ کار میں کمی ، سفر خوراک اور رہائش کے اخراجات اور وکیلوں کی فیسیں ایک عام آدمی کی کمر توڑ کر رکھ دیتی ہیں ۔

۵ ۔ ہمارے عدالتی نظام کی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ اس میں قانونی لحاظ سے سب کو برابر تسلیم نہیں کیا جاتا جبکہ اسلام کے عدالتی نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عمرؓ و علیؓ بنفسِ نفیس عدالتوں میں حاضر ہوتے رہے ہیں اور انہوں نے اس کو کبھی عار نہیں سمجھا ۔ لیکن انگریزی قانون کی پیروی میں ہمارا قانونی نظام انتظامیہ اور ریاست کے سربراہوں کو عدالت میں حاضری سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے اور یہاں یہ کیفیت ہے کہ نفاذ شریعت آرڈیننس ۱۹۸۸ء کا جو ڈرافٹ شائع ہوا (۵) اس میں یہ شق موجود تھی کہ حکومتی اہل کاروں کے خلاف عدالتیں کاروائی کر سکیں گی لیکن جب اسے چند دن بعد عملاً نافذ کیا گیا تو متعلقہ شق غائب تھی تو ایک ایسا عدالتی نظام جس میں انصاف سب کے لئے برابر نہ ہو ، کیسے عادلانہ اور اسلامی کہا جا سکتا ہے ۔

مندرجہ بالا حوالوں سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارا عدالتی نظام اسلام کے قانونی مزاج اور اس کی سپرٹ کے مطابق ہرگز نہیں ہے تاہم جس چیز نے اس نظام کی کمزوریوں کو بدتر بنا رکھا ہے وہ اس میں وکلاء کا کردار ہے ۔

وکلاء کا کردار

بعض فاضل حضرات نے اس امر پر بحث کی ہے (۶) کہ آیا وکلاء کا موجودہ پیشہ وارانہ کردار اسلامی ہے یا نہیں ؟ وہ بڑی معصومیت سے فقہ اسلامی کے چند حوالے دے کر ثابت کرتے ہیں کہ اسلام میں وکالت کی گنجائش موجود ہے لہٰذا وکلاء کا وجود بھی اسلامی ہے پھر وہ کہتے ہیں کہ جہاں تک وکلاء میں سے بعض کے کمزور کردار کا تعلق ہے تو بے شک اس کا امکان موجود ہے لیکن اس سے مسئلے کی اصل حیثیت یعنی وکالت کے شرعی جواز پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ یہ خلطِ مبحث کی ایک شائستہ اور دلچسپ صورت ہے کیونکہ سوال دراصل یہ نہیں کہ اسلام میں اصولی طور پر وکالت کی گنجائش موجود ہے یا نہیں ، کیونکہ وہ تو ہے ہی ، اصل سوال یہ ہے کہ موجودہ عدالتی نظام میں وکلاء کا جو طبقہ پیدا ہو چکا ہے اور اس کا جو کردار ہے ، کیا وہ اسلامی تقاضوں کے عین

مطابق ہے؟ اور اگر اسلام کے صحیح قانونی مزاج کے مطابق ایک عدالتی ڈھانچہ تشکیل دیا جائے تو کیا اس میں اس طرح کے طبقۂ وکلاء کی گنجائش ہو سکتی ہے؟ لہذا پہلے ہم ان دو سوالوں کا جواب دیں گے اور پھر اس سے متعلق مسائل پر بحث کریں گے۔

جن لوگوں نے انگریزی قانون کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ بڑی اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ نظامِ قانون بنیادی طور پر عدالتی عادات و اعراف کا مجموعہ ہے۔ انگریزی قانون بنیادی طور پر رومن لاء کی طرح مدون قانون نہیں تھا بلکہ اصلاً یہ ایک ایسا قانون ہے جو عدالتی نظیروں کی بنیاد پر پروان چڑھا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ چند صدیاں پیشتر انگلینڈ میں اگر کوئی قانون کی پریکٹس کرنا چاہتا تو اسے کسی کالج یا یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری نہیں لینا ہوتی تھی بلکہ جو لوگ پہلے سے قانون کی پریکٹس کر رہے ہوتے تھے ان کے ساتھ شامل ہو کر اور عملاً ان کے ساتھ کام کر کے اس پیشے کو اپنانا ہوتا تھا (بلکہ آج بھی قانونی پوزیشن یہی ہے) اور یہی وہ فلسفہ ہے جس کی وجہ سے وہاں (Inns) کا وجود ہمیں نظر آتا ہے جہاں تک قانون کی باقاعدہ تعلیم کا تعلق ہے تو یہ انگلینڈ میں بہت بعد میں شروع ہوئی۔ ۱۷۵۸ء میں آکسفورڈ میں قانون کا پہلا کورس شروع ہوا اور ۱۸۰۰ء میں کیمبرج میں دوسرا کورس (۷)۔

پھر کامن لاء کے عدالتی ڈھانچہ کی یہ بھی روایت رہی ہے کہ بنچ کے ممبرز ہمیشہ بار سے لئے جاتے ہیں یعنی ججوں کا انتخاب وکلاء میں سے ہی ہوتا ہے، براہِ راست نہیں ہوتا۔ اس طرح قانونی پریکٹس کے ماہرین یعنی (طبقۂ وکلاء) کا وجود کامن لاء کے عدالتی ڈھانچہ کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور جہاں بھی کامن لاء کی بنیاد پر عدالتی ڈھانچہ بنایا گیا وہاں یہ طبقۂ وکلاء وجود میں آ گیا۔ اگرچہ قانون کے ماہرین اور عدالتی افسران کی مدد کے لئے قانون کی تشریح و تفسیر کرنے والے لوگ تو ہر نظامِ قانون میں ہوتے ہی ہیں۔ آج کل چونکہ ہر کہیں تخصص (Specialization) کا دور دورہ ہے لہذا جس کا کام اسی کو ساجھے، اگر کوئی لاء گریجویٹ بھی ہو یعنی قانون کی ڈگری اس کے پاس ہو لیکن اس نے عدالتوں میں جا کر قانون کی پریکٹس نہ کی ہو اور اسے کوئی ضرورت پڑ جائے تو اسے بھی وکیل کی خدمات حاصل کرنا پڑیں گی۔

اصولی اور علمی لحاظ سے ایک وکیل کا جو کردار بھی ہو، ہمارے معاشرے کا ایک عام فرد خصوصاً دیہات میں رہنے والی ۸۰٪ آبادی ایک وکیل کو نظامِ استحصال کا حصہ سمجھتی ہے۔ راقم کو اپنے بچپن کا یہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ جب وہ اپنے استاد حافظ صاحب کے پاس قرآن مجید پڑھنے گیا تو گاؤں کے "دیندار" نمبردار صاحب نے انہیں (شاگردوں سمیت) "ختم

قرآن" کے لئے بلا بھیجا جس میں راقم بھی شامل تھا ختمِ قرآن کے بعد دعا میں منجملہ دیگر باتوں کے اس نمبردار نے کہا "حافظ صاحب ، دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس گھر کو وکیلوں ، حکیموں اور ڈاکٹروں کے خرچے سے بچائے رکھے" ۔ پھر وکیلوں خصوصاً نچلی عدالتوں کے وکیلوں کے بارے میں یہ بات بھی عام طور بطور الزام کہی جاتی ہے کہ وکیل کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ہر حالت میں اپنے موکل کو سزا سے بچائے خواہ اس کے لئے اسے جھوٹ بولنا پڑے ، جھوٹ کی بنیاد پر سارا مقدمہ تیار کرنا پڑے ، جھوٹے کاغذات تیار کروانے پڑیں ، جھوٹے گواہ تیار کرنے پڑیں اور انہیں جھوٹ کی باقاعدہ مشق کروانی پڑے اور رشوت اور ناجائز سفارش سے کام لینا پڑے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان ساری خدمات کے عوض وکیل صاحب بھاری بھرکم معاوضہ وصول کرتے ہیں خواہ موکل اسے مکان اور زمین بیچ کر دے یا سودی قرض لے کر ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو وکیل ایسا نہیں کرتا اور سچ جھوٹ کی پھٹک میں پڑتا ہے وہ وکلاء برادری میں نکو اور "مُلا" سمجھا جاتا ہے اور عملاً ناکام ہو جاتا ہے ۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ہر وکیل ایسا ہوتا ہے یا ہر کہیں ایسا ہوتا ہے لیکن اپنے وکلاء بھائیوں سے معذرت کے ساتھ ہم یہ عرض کریں گے کہ ان حالات کا عشرِ عشیر بھی اگر صحیح ہو تو وکلاء کے موجودہ کردار کو علی الاطلاق اسلامی کہنا خاصا مشکل ہو گا ۔

اب آیئے دوسرے سوال کی طرف کہ اگر اسلامی نقطۂ نظر سے عدالتی ڈھانچہ تشکیل دیا جائے تو کیا اس میں موجودہ طرز کے وکلاء کے طبقے کی گنجائش نکل سکتی ہے؟

برصغیر میں انگریز کی آمد سے پیشتر جو نظامِ قضا موجود تھا اور اس سے پہلے مسلم ممالک میں عدالتی نظام کا جو ڈھانچہ صدیوں تک قائم رہا ہے اس میں قاضی (یعنی جج) ہوتے تھے ، ان کی مدد کے لئے دیگر عدالتی عملے کے علاوہ مفتی یعنی اسلامی قانون کے ماہر (Juris-consult) ہوتے تھے لیکن تاریخ ہمیں کہیں نہیں بتاتی کہ وہاں وکلاء کا ایک پورا طبقہ بھی ہوتا تھا ۔ اِکا دُکا ایسے واقعات ہو سکتے ہیں جہاں کوئی فرد کسی مجبوری کی وجہ سے کسی مقدمے میں خود شریک نہ ہو سکتا ہو اور اس نے کسی دوسرے کو اپنا وکیل اور قائم مقام کر دیا ہو لیکن چونکہ قانون کا سارا عملی پیچیدگیوں سے مبرّا تھا ، نہ نظیروں کا کوئی سلسلہ تھا ، نہ عدالتی پروسیجر لمبے چوڑے ہوتے تھے ، ایک ہی عدالت میں ہر قسم کے مقدمات پیش ہوتے تھے اور قاضی حضرات اپنے علم اور زہد و تقویٰ کی وجہ سے معروف اور قابلِ اعتماد ہوتے تھے لہٰذا حصولِ انصاف میں مدد کے لئے کسی طبقۂ وکلاء کی ضرورت ہی نہ ہوتی تھی ۔ وکلاء کے کام کو اگر جزوی مشابہت اسلام کے عدالتی ڈھانچے کے کسی رکن سے ہے تو وہ مفتی یعنی (Juris-consult) کے کام سے ہے جس کا کام قانون کی تفسیر و تشریح اور قاضی (یعنی جج) کی کسی معاملے میں علمی تحقیق میں مدد دینا ہوتا

تھا جیساکہ اس وقت وفاقی شرعی عدالت میں یہ کام ہورہا ہے ۔ لیکن موجودہ حالات میں مفتی اور وکیل ایک دوسرے کے نعم البدل نہیں ہیں کیونکہ مفتی شریعت کے علوم کا ماہر ہوا کرتا تھا جبکہ آج کے وکیل عمومی طور پر علومِ شریعت سے بہرۂ وافر نہیں رکھتے اور اس کے مناسبِ حال نہ وہ تعلیم پاتے ہیں نہ تربیت ۔

یہ تو تھی اس معاملے کی نظری (Theoratical) حیثیت اور اس کا جو جواب ہم نے دیا ہے وہ یقیناً طبقۂ وکلاء کے لئے باعثِ عدم اطمینان ہوگا لیکن اس کے ساتھ ہی اس معاملے کا دوسرا پہلو بھی ہے جس سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا اور وہ معاملے کا عملی پہلو ہے ۔ اس عملی پہلو کی چند جہات یہ ہیں:

۱ ۔ طبقۂ وکلاء عام طور پر ہمارے ہاں معاشرے کے نہایت ذہین اور زیرک افراد پر مشتمل ہے بلاشبہ اسے سوسائٹی کی کریم کہا جاسکتا ہے ۔ معاشرے پر (خصوصاً سیاسی لحاظ سے) ان کا دور رس اثر موجود ہے ، اس طبقے کے افراد نے پاکستان بنانے اور پھر اس کی تعمیر میں انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے ، اسی طرح جمہوریت ، بنیادی حقوق اور عدالتی اختیارات کی بحالی میں وکلاء کا کردار بحیثیت مجموعی انتہائی درخشاں رہا ہے ۔

۲ ۔ وکلاء عملاً اس وقت ایک طبقہ ہیں اور وکالت باقاعدہ ایک ہنر (Profession) اور کسبِ معاش کا ذریعہ ہے ۔ لہٰذا اگر موجودہ عدالتی ڈھانچے کو جو کہ اس وقت یقیناً اسلامی بنیادوں پر استوار نہیں ہے اگر کوئی خدا کا بندہ کبھی اسلامی بنیادوں پر نئے سرے سے تعمیر کرنا چاہے تو بھی اس کا یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کہ طبقۂ وکلاء کو فوراً ختم کر دیا جائے ، اس سے نہ صرف یہ کہ روزگار کے مسائل پیدا ہوں گے بلکہ ملک انتہائی ذہین لوگوں کی خدمات سے بھی محروم ہو جائے گا لہٰذا اس کا حل ایسا ہونا چاہئے کہ جو مسئلے کے دونوں پہلوؤں کو حل کرے ۔ موجودہ غیر اسلامی عدالتی نظام کو اسلامی عدالتی نظام میں کیسے تبدیل کیا جاسکتا ہے اس پر ہم ذیل میں گفتگو کریں گے ۔

موجودہ عدالتی نظام کی اسلامی عدالتی نظام میں تبدیلی

جب ہم اسلام کے عدالتی نظام کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد عدالتی ڈھانچے کی کوئی خاص شکل وہیئت (Form) نہیں ہوتی ۔ یہ ایک نہایت سطحی بات ہے کہ اگر جج کو قاضی اور چیف جسٹس کو قاضی القضاۃ کہا جائے ، ضلعی عدالتوں کو قاضی کورٹس یا عدلیہ کو قضاء کہہ دیا جائے تو عدالتی ڈھانچہ اسلامی ہو جائے گا یا اسلام کے عدالتی نظام کا یہ تصور ذہن میں بٹھالیا

جائے جس میں ایک مولوی صاحب مسجد میں بیٹھے ہوں گے ، پاس ایک خادم درّہ لئے کھڑا ہو گا اور وہیں ایک نشست میں فیصلہ ہو جائے گا جس کی کوئی اپیل ہو گی نہ ریکارڈ اور نظم ۔ دراصل ہر نظام دو چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے ایک اس کی شکل (Form) اور دوسرے اس کی روح (Spirit) یا اصول (Principles) ۔ جب ہم اسلام کا عدالتی ڈھانچہ یا عدالتی نظام کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد کوئی خاص شکل نہیں ہوتی کیونکہ جہاں تک شکل کا تعلق ہے تو یہ مرور زمانہ کے ساتھ یقیناً بدل جائے گی ، تمدنی ترقی کا اثر اس پر پڑے گا ۔ دراصل جو چیز شکل و ہیئت سے اہم ہے وہ اس کی سپرٹ یا اس کے بنیادی اصول ہیں جن کے مطابق وہ شکل وجود پذیر ہوتی ہے ۔ لہٰذا شکل و ہیئت کے لحاظ سے غالباً ہم موجودہ عدالتی ڈھانچے کو غیر اسلامی نہیں کہہ سکتے جس میں ضلعی عدالتیں ہیں ، صوبائی صدر مقاموں میں ہائی کورٹ ہیں اور ملکی سطح پر ایک سپریم کورٹ ہے اور پھر ان عدالت ہائے عالیہ کے سرکٹ بنچ ایک سے زیادہ مقامات پر موجود ہیں یقیناً اس تنظیمی ڈھانچے کو بوقت ضرورت بدلا بھی جا سکتا ہے اور مزید مفید بھی بنایا جا سکتا ہے لیکن اس تنظیمی ڈھانچے پر اسلامی یا غیر اسلامی کا لیبل لگانا زیادہ وزن نہیں رکھتا ۔

اصل میں جو چیز اہم تر ہے وہ وہ اصول ہیں جن پر عدالتی ڈھانچہ کی بنیاد رکھی جاتی ہے ، وہ اصول مندرجہ ذیل ہیں :

۱ ۔ یہ بات دستور میں واضح طور پر لکھی جانی چاہئے کہ شریعت یعنی قرآن و سنت پاکستان کا بالاتر قانون ہیں ، ملک میں کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہ بنایا جا سکے گا نیز اعلیٰ عدالتوں کو یہ اختیار حاصل ہو گا کہ وہ ہر اس قانون (بشمول آئین) کو کالعدم قرار دے سکیں جو ان کی رائے میں ، قرآن و سنت کے خلاف ہو نیز عدالتوں کے لئے یہ لازمی ہو گا کہ وہ اپنے فیصلے صرف قرآن و سنت ، کے مطابق کریں ۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کو جج بنایا جائے جو اسلامی قانون کے ماہر ہوں ، اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ موجودہ ججوں کو اسلامی قانون میں تعلیم و تربیت دینے کا انتظام کیا جائے بلکہ اس کو لازمی کر دیا جائے اور جو جج اس کمی کو پورا نہ کر سکیں انہیں کسی دوسرے شعبے میں منتقل کر دیا جائے ، اسی طرح وکلاء کی اسلامی قانون میں تربیت اور تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے (اس کی کچھ تفصیلات اگلے باب میں دی جا رہی ہیں) اور جو لوگ ایک کم از کم معیار پر پورے نہ اتریں ان کو دوسرے شعبوں میں منتقل کر دیا جائے ، ابتداء میں اس طرح کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے کہ ہر عدالت میں ایک ماہر قانون جج کے ساتھ ایک اسلامی قانون کا ماہر جج

بھی ہو (۸) لیکن اس دوئی کی ہم مخالفت کریں گے کہ بعض عدالتوں میں اسلامی فقہ کے ماہرین جج ہوں اور بعض میں مغربی قانون کے ماہر، یا بعض عدالتوں میں فیصلوں کا مدار قرآن و سنّت پر ہو (گو کسی حد تک جیسا کہ موجودہ وفاقی شرعی عدالت ہے) اور دوسری عدالتوں میں کامن لاء کے اصول ہی بر ترہیں، اس کی بجائے عدالتی ڈھانچے میں یکسانیت ہونی چاہیئے اور ساری عدالتوں پر صرف قرآن و سنّت کے مطابق فیصلے کرنے کی ہی پابندی ہونی چاہیئے۔

۲۔ ججوں کی سلیکشن اور تعیناتی میں صرف ان کی ذہانت اور تعلیمی قابلیت کا ہی لحاظ نہیں رکھا جانا چاہیئے بلکہ ان کے اخلاق و کردار کا بھی لحاظ ضروری ہے۔ ایک جج جتنا دیانتدار، صاحبِ کردار اور با اصول ہو گا اتنا ہی اس کی عدالت کا وقار اور دبدبہ ہو گا اور لوگوں کو اس کی اصابتِ رائے کا پاس ہو گا لہٰذا ججوں کی تربیت میں ان کے اخلاق کی اصلاح اور ان کے ذہنی اور دینی رویّوں کی تربیت انتہائی ضروری ہے تاکہ لوگوں کو ججوں کے تقویٰ اور اخلاق پر انگشت نمائی کا موقع نہ مل سکے۔ تقویٰ کے لفظ سے لمبی ریش، ہاتھ میں تسبیح، سر پر عمامہ، گلے میں رومال اور طویل عباء کا تصوّر ہمارے ذہن میں خواہ مخواہ ہی آ جاتا ہے ورنہ تقویٰ درحقیقت خدا خوفی اور اسلام کے اخلاقی اصولوں پر بہترین طریقے سے عمل کرنے کا نام ہے جس کی کوئی خاص شکل نہیں سوائے ان امور کے جن کا حکم خدا اور اس کے رسولؐ نے دیا ہے۔

۳۔ ایسے اقدامات کئے جائیں جن سے انصاف میں تاخیر کے جتنے پہلو ہیں وہ ختم ہو جائیں۔ اس وقت ہزاروں مقدمات عدالتوں میں جمع ہیں جن کے فیصلے کئے جانے کا انتظام ضروری ہے لہٰذا ایک بڑی ضرورت ججوں کی تعداد بڑھانے کی ہے، ججوں کی تعداد بڑھے گی تو ان کے لئے عمارتوں کی ضرورت ہو گی نیز ججوں کی (خواہ وہ نئے ہوں یا پرانے) اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم و تربیت کی ضرورت بھی ہے اس سلسلے میں جو کام اسلام آباد کی اسلامی یونیورسٹی میں ہو رہا ہے وہ ابتدائی نوعیت کا ہے، اس کام کو انتہائی وسیع اور اعلیٰ پیمانے پر سنجیدگی اور گہرائی سے کرنے کی ضرورت ہے، ملک میں ایک سنٹرل جوڈیشل اکیڈمی ہونی چاہیئے پھر اس کے زیرِ انتظام ہر صوبائی صدرِ مقام پر اور دیگر بڑے شہروں میں جوڈیشل اکیڈمیاں قائم کی جائیں بلکہ ایسے تعلیمی اور تربیتی مراکز ہر ضلعی صدر مقام پر قائم کئے جانے چاہئیں تاکہ ججوں اور وکلاء کی اسلامی قانون میں تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جا سکے۔

اس طرح کے کاموں میں یقیناً بجٹ کی ضرورت ہوگی اور اخراجات اٹھیں گے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ظلم کا مداوا کرنا اور عوام کو عدل مہیا کرنے کا انتظام کرنا ایک اسلامی حکومت کے

بنیادی فرائض میں سے ہے لہٰذا اگر عدالتی ڈھانچے کی اصلاح کے لئے مزید اخراجات کرنے پڑیں تو بھی کسی مسلمان حکومت کو اس سے ہچکچانا نہیں چاہیئے ۔

موجودہ عدالتی چارہ جوئی کو مختصر اور آسان بنانے کے لئے حکومت نے کئی دفعہ کوششیں کی ہیں اور کمشن بٹھائے ہیں جن کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا، کامن لاء کی عدالتوں میں کاروائیوں کو مختصر کرنا اور سہل بنانا آسان نہیں ہے ، اس کے مقابلے میں اسلامی عدالتوں کا طریقِ کار ماضی میں انتہائی سادہ اور سہل تھا، نئے عدالتی ڈھانچے کے پروسیجرز کو مختصر اور سہل بنانا انتہائی ضروری ہے ورنہ اگر جج اسلامی قانون کے ماہر بھی ہوں اور فیصلے شریعت کے مطابق بھی ہوں لیکن اگر بروقت نہ ہوں تو یہ بات غیر اسلامی ہوگی بلکہ خود اسلامی عدالتی ڈھانچے کو بھی برباد کر کے رکھ دے گی لہٰذا اس امر کا اہتمام انتہائی ضروری ہے کہ لوگوں کو انصاف ملنے میں غیر ضروری تاخیر نہ ہو اور انصاف ہوتا نظر بھی آئے ۔

۴ ۔ اس سلسلے کا ایک اور نکتہ یہ ہے کہ انصاف کا حصول ایک عام آدمی کے بس میں ہونا چاہیئے ، موجودہ عدالتی ڈھانچے میں جس چیز نے انصاف کو مہنگا اور عام آدمی کی پہنچ سے باہر بنا دیا ہے ، وہ مقدمات کا طویل مدت تک چلتے رہنا ہے، اس کی وجہ کورٹ فیس بھی ہے، وکیلوں کی بھاری فیسیں اور عدالتی اہل کاروں کی رشوتیں بھی ہیں ، ان سب بیماریوں سے مسلم عوام کی جان چھڑانا انتہائی ضروری ہے ، کورٹ فیس بالکل ختم کی جانی چاہیئے ، مقدمات کا فیصلہ جلد ہونا چاہیئے اور جس مجوزہ ڈھانچے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اگر اس پر عمل کیا جائے تو وکیلوں کی خدمات کی نوعیت بھی بدل جائے گی اور مقدمات بھی لمبے نہیں کھنچیں گے، اسی طرح اگر اصلاح صرف عدالتی نظام ہی میں نہ کی جائے بلکہ سارے معاشرتی ڈھانچے میں کی جائے تو رشوت بھی کم ہوگی اور ان سب چیزوں کو ملا کر ایک ایسا ماحول پیدا ہو جائے گا جو انصاف کو ایک عام آدمی کی پہنچ میں لے آئے گا ۔

۵ ۔ موجودہ عدالتی ڈھانچے کی بنیاد اس نظام پر ہے جس کا اصول یہ ہے کہ "بادشاہ" کبھی غلطی نہیں کرتا گویا وہ معصوم عن الخطاء ہے ۔ اسی طرح انگریز نے جو قانونی ڈھانچہ ہمیں دے رکھا ہے اس میں نہ صرف صدرِ مملکت بلکہ انتظامی نمائندوں کو ان کی کارکردگی کے سلسلے میں عدالت میں نہیں لایا جا سکتا جبکہ اسلام میں انتظامی اہل کاروں کو سیدھا رکھنے کے لئے ایک پورا عدالتی شعبہ "قضاء مظالم" کے نام سے موجود تھا لہٰذا انتظامیہ کو عدالتی کاروائی سے بالاتر رکھنا بالکل غلط ہے کیونکہ اس طرح ان کے احتساب کا پہلو کمزور ہو جاتا ہے ۔ عدالتوں کو یہ حق ہونا چاہیئے کہ بڑے سے بڑا انتظامی سربراہ بھی ان کی پہنچ سے باہر نہ ہو ۔

٦ - اسی طرح موجودہ نظام میں ایک اصول یہ رکھا گیا ہے کہ صدرِ مملکت اور گورنر سزاؤں کو معاف کر سکتے اور ان میں تخفیف کر سکتے ہیں - کیا یہ انصاف ہے کہ ایک مجرم عدالتی نظام کے سارے مرحلوں سے گزرتا ہے اور عدالتیں اسے مجرم قرار دیتی ہیں لیکن صدرِ مملکت (یا گورنر) اس کی سزا میں تخفیف کر دیتے ہیں یا اسے ختم کر دیتے ہیں - اس کی تائید میں یہ دلیل نہیں دی جا سکتی کہ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ اپنے عمال کو لکھا تھا کہ اگر کسی کو سزائے موت دو تو نفاذ سے پہلے معاملہ مجھے بھیجو کیونکہ اس وقت حضرت عمرؓ کا اس معاملے میں نظرِ ثانی کرنے کا کام ایک طرح سے اپیل کورٹ (Appeal Court) جیسا کام تھا اور چونکہ امیر المومنینؓ خود مجتہد تھے اور خدا خوفی اور تقویٰ میں دوسروں سے بڑھ کر تھے اور اپیل کورٹس الگ سے موجود نہ تھیں اس لئے وہاں تو اس طرح کی صورت کی مناسبت نظر آتی ہے لیکن موجودہ ماحول میں جبکہ عدالت ہائے مرافعہ ایک نہیں کئی موجود ہیں، صدرِ مملکت یا گورنر کو یہ حق دینا قرین انصاف نہیں - اس کے برعکس بالاترین عدالت مرافعہ کا فیصلہ ہی حتمی سمجھا جانا چاہیئے -

حواشی

۱ ۔ ماہنامہ (فکر و نظر) شمارہ مارچ اپریل ۱۹۸۳ء صفحہ ۲۳۴ و مابعد

۲ ۔ نوائے وقت ۸۷/۴/۲۳، ۸۶/۱۰/۲ اور ۸۷/۱۲/۲۷

۳ ۔ جنگ لاہور مورخہ ۲۳ جون ۱۹۸۸ء

۴ ۔ Dr. Tanzil ur Rehman, Enforcement of Islamic Law - A New Approach, P-7

۵ ۔ ملاحظہ ہو روزنامہ جنگ لاہور مو . ۸ جون ۱۹۸۸ء

۶ ۔ Rene David and John E.C Brierley. Maj[illegible] Legal Systems in the World Today, 1987 P-313

۸ ۔ مفتی نہیں جیسا کہ نفاذِ شریعت آرڈیننس ۱۹۸۸ء میں ہے کیونکہ مفتی کا کردار مشاورتی ہو گا ۔

باب ششم

اسلامی قانون کی تعلیم

پاکستان اگرچہ مسلم لیگ کے ہاتھوں ۱۹۴۷ء میں معرض وجود میں آیا لیکن جس تحریک نے یہ کارنامہ سرانجام دیا اس کی آبیاری مسلمانانِ ہند اپنے خون پسینے سے بڑی دیر سے کر رہے تھے ۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اگر اس کا ایک مرحلہ تھی تو شاہ ولی اللہ کی تحریک اور سید احمد شہید کا جذبۂ جہاد بھی اسی کا ایک پرتو تھا ، پاکستان درحقیقت مسلمانان ہند کی ان امنگوں کا ایک کامیاب اظہار تھا کہ وہ بتکدۂ ہند میں اسلام کا علم سربلند رکھنا چاہتے تھے ، وہ غلام بن کر نہیں بلکہ ایک زندہ اور پرعزم قوم کی طرح مسلمان کی حیثیت سے جینا اور مرنا چاہتے تھے ، وہ انفرادی زندگی کے علاوہ اپنے اجتماعی ادارے بھی اسلامی اصولوں کی بنیاد پر استوار کرنا چاہتے تھے ۔

جیسا کہ شروع سے ہوتا آیا ہے کہ فاتح صرف ملک ہی فتح نہیں کرتے بلکہ قلوب و اذہان کو بھی فتح کرتے ہیں ، تہذیب و تمدن پر بھی اثرانداز ہوتے ہیں چنانچہ انگریز نے بھی ہندوستان پر اپنا قبضہ مستحکم کرنے کے لئے جو اقدامات کئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اس نے ملک کا نظامِ تعلیم بدل دیا ، مدارس بند کر دیئے ، ان کے ساتھ منسلک مالی نظام ختم کر دیا ۔ اسی طرح اس نے ملک کا قانونی اور عدالتی نظام بھی بدل دیا ، شرعی عدالتیں ختم کر دیں ، شخصی قوانین کے علاوہ دیگر شرعی قوانین منسوخ کر کے انگریزی قانون کی بنیاد پر نئے قوانین بنائے ، ان قوانین کے نفاذ کے لئے نیا عدالتی ڈھانچہ تشکیل دیا اور اس قانون کی تدریس و تعارف کے لئے اس کی تعلیم کا انتظام کیا ۔

پاکستان جب بن گیا تو انگریز کا تیار کردہ یہی تعلیمی ، قانونی اور عدالتی ڈھانچہ ہمیں ورثے میں ملا ، قانون کے شعبے سے جو مسلمان وابستہ تھے خواہ وہ جج تھے یا وکیل ، وہ اسی غیر اسلامی قانون کے ماہر اور تربیت یافتہ تھے ، لاء کالجوں میں وہی قانون پڑھایا جاتا تھا اور اسی قانون کی پریکٹس کی تربیت دی جاتی تھے ۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ پاکستان بننے کے بعد یہ سب کچھ بتدریج بدل جاتا ، عدالتی ڈھانچے پر نظر ثانی کی جاتی ، ججوں اور وکیلوں کو اسلامی قانون پڑھانے اور اس میں تربیت دینے کا کام قومی سطح پر اور ہنگامی بنیادوں پر کیا جاتا اور لاء کالجوں کے نصاب کو فوری طور

پر بدل دیا جاتا تاکہ وہ نئی اسلامی مملکت کے نئے عدالتی ڈھانچے کی ضروریات پوری کر سکتا ، لیکن بد قسمتی سے یہ سب کچھ نہ ہو سکا چنانچہ اس وقت ملک کے لاء کالجوں میں جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہم ملک کی دو مشہور یونیورسٹیوں (پنجاب یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی) کے لاء کالجوں کے نصاب کا ایک سرسری سا جائزہ لیتے ہیں :

پنجاب یونیورسٹی

گریجوایشن کے بعد دو سالہ قانونی تعلیم کے پہلے سال (ایف ای ایل) میں سات پرچے ہوتے ہیں جن میں سے صرف ایک اسلامی فقہ و اصول فقہ سے متعلق ہے ، باقی چھ پرچے اصول قانون ، آئین سازی اور اس کی تاریخ :معاہدوں اور ٹارٹ کا قانون ، قانون بین الاقوام ، قانون فوجداری اور اس کے ضوابط اور قانون اراضی سے متعلق ہیں ۔ دوسرے سال (ایل ایل بی) کے سات پرچوں میں سے بھی صرف ایک پرچہ اسلامی فقہ و اصول قانون سے متعلق ہے جب کہ باقی چھ پرچے تصفت ، قانون تجارت ، قانونِ شہادت ، قانون مدنی اور عدالتی ضوابط و طریق کار وغیرہ سے متعلق ہیں ۔ اسلامی فقہ و اصول فقہ سے متعلق جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ بھی ابتدائی نوعیت کی معلومات اور خصوصاً شخصی احوال سے متعلق مباحث پر مشتمل ہوتا ہے ۔

مندرجہ بالا کورسز لاء گریجوایشن کے تھے ، جہاں تک لاء میں ماسٹر ڈگری (ایل ایل ایم) کا تعلق ہے تو یہاں دو سالوں میں تحقیقی مقالے کے علاوہ ۱۱ کورسوں میں سے کوئی سے پانچ کورس کرنے پڑتے ہیں ۔ ان گیارہ میں سے صرف ایک کورس فقہی احکام کے مصادر ، تاریخ اور اجتہاد سے متعلق ہے جب کہ اصول قانون ، قانون دستوری ، قانون فوجداری اور قانون شہادت وغیرہ میں جزوی طور پر اسلامی فقہ و اصول فقہ سے متعلق بعض مباحث شامل ہیں باقی سارے کورسز مروجہ قوانین سے متعلق ہیں جو کہ انگریزی قانون کی بنیاد پر بنائے گئے ہیں ۔

کراچی یونیورسٹی

کراچی یونیورسٹی میں ایل ایل بی کے پہلے سال میں چھ پرچے ہیں جن میں سے ایک پرچے میں مسلم پرسنل لاء اور ان سے متعلق قرآنی آیات اور عربی زبان کا ابتدائی مطالعہ شامل ہے اور اصولِ قانون کے پرچے میں اصولِ فقہ کا مطالعہ شامل ہے جب کہ دیگر پرچے مروجہ قوانین کے مطالعہ پر مبنی ہیں ۔ ایل ایل بی کے دوسرے سال میں سات پرچے ہیں جو سارے

کے سارے مروجہ قوانین پر مشتمل ہیں کسی پرچے میں اسلامی قانون یا اصولِ فقہ کی کوئی چیز شامل نہیں ۔

کراچی یونیورسٹی کے ماسٹرز ڈگری کے پروگرام ایل ایل ایم کے پہلے سال میں چار پرچے ہیں جن میں سے ایک پرچہ اسلامی فقہ پر ہے اور ایک دوسرے پرچے میں اصولِ فقہ اور اصولِ قانون کا تقابلی مطالعہ ہے جب کہ انسانی حقوق کے پرچے میں بھی اسلامی قوانین کے نقطۂ نظر سے جزوی بحث موجود ہے ۔ ایل ایل ایم کے دوسرے سال میں مقالے کے علاوہ سات مضامین کے پرچوں میں سے دو پرچے کرنے ہوتے ہیں جن میں سے کوئی پرچہ اسلامی قانون سے متعلق نہیں ہے البتہ کمپنی لاء میں مضاربت اور ٹیکسیشن لا میں زکوٰۃ و عشر سے متعلق بعض جزوی مباحث موجود ہیں ۔

مندرجہ بالا تلخیص سے ظاہر ہے کہ ہمارے لاء کالجز میں اسلامی قانون کی تدریس کا انتظام انتہائی غیر تسلی بخش ہے (اگرچہ کراچی یونیورسٹی کا نصاب ، پنجاب یونیورسٹی کے مقابلے میں اسلامی نقطہ نظر سے مقابلتاً بہتر معلوم ہوتا ہے) اصولاً تو ایک اسلامی ملک کا سارا عدالتی اور قانونی ڈھانچہ اسلامی قانون پر ہی مبنی ہونا چاہئے اور جب یہ صورت ہو تو فطری طور پر لاء کالجوں میں تدریس بھی شرعی قانون ہی کی ہونی چاہئے ۔ تاہم ایک عبوری دور میں جب کہ اسلامی قوانین کے ساتھ ساتھ اکثر دوسرے قوانین بھی مروج ہیں عملی لحاظ سے یہی بہتر اور قابل عمل معلوم ہوتا ہے کہ شرعی علوم کے ساتھ ساتھ مروجہ قوانین بھی پڑھائے جائیں بلکہ ان کے تقابلی مطالعے کا اہتمام بھی کیا جائے تاکہ اسلامی شریعت کی برتری مسلمان طلباء کے اذہان میں راسخ ہو سکے ۔

موجودہ حالات میں قانون کی تعلیم کا بنیادی خاکہ ہماری رائے میں مندرجہ ذیل نکات پر مبنی ہونا چاہئے :

۱ ۔ لاء کالجوں میں عربی زبان کی تدریس لازمی ہو ۔ اولاً تو ایسے طلباء کو داخلہ دیا جائے جنہیں پہلے سے عربی زبان آتی ہو (جو لوگ قانون پڑھنے کا پروگرام رکھتے ہوں انہیں شروع ہی سے عربی پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہئے) اور جب تک یہ صورت نہ ہو اس وقت تک قانون کے طلبہ کو عربی زبان پڑھانے پر خصوصی توجہ دی جائے تاکہ وہ اسلامی قانون کے مصادر سے براہِ راست استفادہ کرنے کے قابل ہو سکیں ۔

۲ ۔ جب تک مروج قوانین کی اسلامائیزیشن کا کام مکمل نہیں ہو جاتا یا نئے اسلامی قوانین نہیں

بن جاتے اس وقت تک مروج قوانین کے کیف وکم کے برابر ہی اسلامی قوانین پڑھائے جائیں یعنی ایسا نہ ہو کہ چھ پرچے مروج قوانین کے ہوں تو ایک پرچہ اسلامی قانون کا ہو بلکہ چھ کے چھ پرچوں میں سے ہر پرچے کا آدھا مواد اسلامی قانون پر اور آدھا مواد انگریزی یا مروجہ قانون پر مشتمل ہونا چاہئے یا تین پرچے اسلامی قوانین کے اور تین پرچے انگریزی قوانین کے ہونے چاہئں۔

۱۔ اس کی ایک بہتر صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تقابلی مطالعے کا اہتمام کیا جائے مثلاً جہاں مروج ضابطہ فوجداری پڑھایا جائے وہاں اسلام کا قانون جرم و سزا بھی پڑھایا جائے ۔ جہاں مروج قوانین مدنی (سول لاء) پڑھائے جائیں وہاں اسلامی قوانین مدنی بھی پڑھائے جائیں ، پھر اعلیٰ کلاسوں میں ایسے اساتذہ کے ذریعے جو دونوں قسم کے علوم میں دسترس رکھتے ہوں تقابلی مطالعہ کی صورت اختیار کی جائے تاکہ علمی میدان میں استحقاق کی بنیاد پر شریعت کی بالادستی اذہان میں راسخ ہو سکے

۴۔ قانون کی تعلیم کے بعد جو لوگ قضاء (Judiciary) میں جانا چاہیں ان کے لئے اضافی تدریس کا انتظام ہو تاکہ وہ اس کام کی اہمیت اور تقاضوں کو سمجھ سکیں اور ان کی اضافی اخلاقی تربیت کا اہتمام بھی ہو سکے ۔

۵۔ لاء کالجوں میں صرف قانون اور اسلامی قانون کی تدریس ہی کا انتظام نہیں ہونا چاہئے بلکہ قانون پڑھنے والے طلبہ کی اخلاقی تربیت کا بھی خصوصی اہتمام ہونا چاہئے کیونکہ اسلامی معاشرے میں ایک قاضی اور مفتی کا بہت اونچا مقام ہوتا ہے اور ماضی میں عموماً ایسے ہی لوگ اس منصب پر کام کرتے رہے ہیں جو کردار و اخلاق میں عام لوگوں سے بڑھ کر تھے ۔

٦۔ جب تک حکومت کی سمجھ میں مندرجہ بالا باتیں نہ آئیں ، پرائیویٹ سیکٹر میں ایسے لوگوں کو حرکت میں آنا چاہیے جو شعبہ قانون سے متعلق ہوں اور شریعت کا درد بھی رکھتے ہوں اور ایسے لاء کالج کھولنے کی کوشش کی جانی چاہئے جن میں قانون اور شریعت دونوں پڑھائے جائیں ۔

۷۔ ایسے لاء کالج جہاں پوسٹ گریجوایٹ تعلیم کا انتظام ہو وہاں اسلامی قانون میں اعلیٰ پائے کی ریسرچ کا اہتمام بھی ہونا چاہئے ۔ خصوصاً مروج قوانین اور شرعی قوانین میں تقابلی

مطالعے کی اہمیت اور ضرورت تو دوچند ہے اور اس سلسلے میں بہت بڑا خلاء محسوس ہوتا ہے اس خلاء کو پر کرنے کی جد وجہد فی الفور شروع کی جانی چاہئے ۔

۸ ۔ اس کے ساتھ ہی عبوری دور کی ضرورت کے پیش نظر بنیادی فقہی کتب کے عربی سے اردو میں ترجمے کی کوششیں بھی ہونی چاہئیں تاکہ جو لوگ ملک کے عدالتی ڈھانچے میں پہلے سے کام کر رہے ہیں وہ اسلامی قانون سے معقول حد تک واقف ہو سکیں ۔

۹ ۔ اگرچہ تدریس کا براہ راست تعلق ان طلبہ ہی سے ہے جو قانون پڑھنا چاہتے ہیں اور اس میدان میں مستقبل بنانا چاہتے ہیں لیکن ان لوگوں کی تدریس و تربیت کا بھی بہر حال انتظام ہونا چاہئے جو اس وقت ملک کے قانونی ڈھانچے کو عملاً چلا رہے ہیں اس غرض کے لئے عدالتی افسروں کی اسلامی قانون میں تربیت ناگزیر ہے ۔ جس میں نچلے درجے کی عدالتوں اور بڑی عدالتوں میں کسی امتیاز کی ضرورت نہیں کیونکہ ان سب کو اسلامی قانون کی تعلیم اور تربیت کی ضرورت ہے تاہم ان میں تدریس و تربیت کے مختلف انداز ان کی علمی سطح کی مناسبت سے رکھے جا سکتے ہیں جن میں سیمینار ، ورکشاپ ، گروپ ڈسکشن ، مباحثے اور مطالعاتی دورے شامل ہیں ۔

باب ہفتم

عصرِ حاضر کے مسلم معاشرے میں اسلامی قانون کی تنفیذ

نفاذ شریعت کی اہمیت

اسلامی قانون کی تنفیذ یعنی ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں شریعت کا عملاً نفاذ صرف ایک علمی اور نظری مسئلہ نہیں بلکہ بنیادی اہمیت کا حامل ایک عملی مسئلہ بھی ہے ۔ اور ایک مسلمان توحید اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرکے قانونی طور پر مسلمان تو ہو سکتا ہے لیکن جب تک وہ اسلام کے احکام پر عمل نہ کرے، عملی زندگی میں خدا اور رسولؐ کے احکام کی تابعداری نہ کرے (۱) وہ اس وقت تک حقیقی معنوں میں مومن ہو ہی نہیں سکتا (۲) اور نہ ہی اپنے مقصدِ حقیقی یعنی رضائے الٰہی اور نجاتِ اخروی کو پا سکتا ہے ۔

جہاں شریعت کے بہت سے احکام ایسے ہیں جن پر انفرادی طور پر عمل کیا جا سکتا ہے وہاں بہت سے ایسے احکام بھی ہیں جن کی تنفیذ انفرادی طور پر ممکن نہیں بلکہ اس کے لئے اجتماعی قوت کا مہیا ہونا ضروری ہے مثلاً جہاد یا اقامتِ حدود و قصاص وغیرہ ۔

اجتماعی زندگی میں شریعت کا نفاذ مسلمانوں کی ایک ایسی ذمہ داری ہے کہ اس سے اغماض برتنا خود ایمان کی نفی ہے ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صاف فرمایا ہے کہ جو لوگ اس کے احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ ظالم ہیں ، وہ فاسق اور کافر ہیں (۲) ۔

جو لوگ خدا کے قانون کی بجائے یا اس کے مخالف کوئی دوسرا قانون نافذ کریں خدا کے نزدیک وہ "طاغوت" (۴) ہیں ، وہ گویا اپنے آپ کو "خدا" سمجھتے ہیں کیونکہ خدا کی خدائی صرف عبادت ہی میں ظاہر نہیں ہوتی بلکہ خدا تو وہ ہے جو زمین و آسمان کا مالک ہے ، اس زمین میں حکم اسی کا چل سکتا ہے اور چلنا چاہئے ۔ انسان کی حیثیت یہاں عبد اور خلیفہ کی ہے (۵) فرماں روا کی نہیں لہٰذا جو خدا کے قانون کے مقابلے میں اپنا قانون نافذ کرے وہ گویا خدا کے مقابلے میں اپنی خدائی کا دعویٰ کرتا ہے (خواہ بظاہر اس کا اعلان نہ بھی کرے) ۔ اس طرح جو لوگ طاغوت کی پیروی کریں اور خدا کے احکام کی پیروی نہ کریں جو ہمارا حقیقی مالک ہے ، وہ بھی گمراہ ہیں اور ان کی سزا بھی خدا کے نزدیک جہنم ہے (۶) ۔

ان بنیادی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ شریعت کا نفاذ اور ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں مین شریعت کے قانون کی تطبیق کوئی ہلکی بات نہیں ہے یہ ایک انتہائی بنیادی بات ہے جس کا تعلق ہمارے ایمان کی سلامتی سے ہے ، جس کا تعلق ہماری زندگی اور موت سے ہے ، جس کا تعلق اِس دنیا میں اور آنے والی دنیا میں ہماری کامیابی و ناکامی سے ہے لہذا اس بنیادی اہمیت کے مسئلے کو سرسری نظر سے نہیں دیکھنا چاہئیے بلکہ ہر مسلمان کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی انفرادی زندگی میں شریعت پر عمل کرے نیز ایسا اجتماعی ماحول پیدا کرے جس میں شریعت کے ان احکام کی بھی تنفیذ ہو سکے جو صرف ایک اجتماعی نظام ہی کی وجہ سے نافذ ہو سکتے ہیں ۔

شریعت نافذ کیوں نہ رہ سکی ؟

جہاں تک شریعت کے بحیثیتِ مجموعی نفاذ کا تعلق ہے تو اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں تکمیل تک پہنچا دیا تھا اور شریعت کی بنیاد پر عملاً ایک جیتا جاگتا معاشرہ قائم کر دیا تھا، خلفا راشدین ؓ نے آپؐ کی پیروی کی اور معاشرے کو شریعت پر ہر لحاظ سے قائم رکھا لیکن جیسا کہ اس سے پیشتر ہم تیسرے باب میں ذکر کر چکے ہیں ، خلفاءراشدین کے فوراً بعد انحطاط کا دور شروع ہو گیا اور سب سے پہلے اسلام کے سیاسی نظام کو پٹڑی سے اتار دیا گیا، زندگی چونکہ ایک اکائی ہے لہذا اگر اس کا ایک حصہ متاثر ہو تو دوسرے حصے بھی اس سے خود بخود متاثر ہوتے ہیں لہذا حکمران جب اسلام کے صحیح سیاسی نظام سے دستکش ہوئے تو اس کے اثرات صرف سیاست اور نظام ملکی ہی پر نہیں پڑے بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں پر بھی پڑے ۔

قانونی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو مسلمان حکمرانوں نے شریعت کی بالادستی سے کبھی انکار نہیں کیا ، عدالتوں میں بھی بالاتر قانون شریعت ہی تھی اور معاشرے کے دوسرے پہلوؤں پر بھی بحیثیت مجموعی شریعت ہی غالب تھی لیکن صاف ظاہر ہے کہ جب حکمران مطلق العنان ہو گئے اور انہوں نے شریعت کی بالادستی کو زبانی تسلیم کرنے کے باوجود سیاسی میدان میں عملاً اسے حرزِ جان نہیں بنایا تو زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی شریعت کی بالادستی کو زک پہنچی اور مسلمان معاشرہ ابتدائی صدیوں کی رفعت کے بعد جو آہستہ آہستہ تنزل کی طرف بڑھنا شروع ہوا ہے تو اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ مسلمان سچّے مسلمان نہ رہے تھے ، انہوں نے شریعتِ اسلامی کے مطالبات پر کماحقہ عمل کرنا چھوڑ دیا، ان میں کمزوریاں در آئیں ، اخلاقی برتری باقی نہ رہی اور وسائل

کی ریل پیل نے انہیں شیطانی چالوں کے لئے نرم چارہ بنادیا اور فقہاء نے بھی اسلاف کی فقیہانہ عظمتوں کو پیش نظر رکھنے کا مطلب یہ جانا کہ اجتہاد کی بجائے تقلید کی روش کو اپنا لیا ۔

مسلمانوں کے یہ حالات تھے کہ مغربی اقوام نے انگڑائی لی ، بنیادی اخلاقی اقدار پر عمل کیا اور سائنسی ترقی کی بنیاد پر آگے نکل گئیں ۔ پہلی جنگِ عظیم میں مسلمانوں نے اپنے حلیفوں کے ساتھ شکست کھائی اور ان کے قصرِ اقتدار کی دیمک زدہ دیواروں کو وہ آخری دھکا لگا جس نے اسے زمین بوس کر دیا ، ایسے میں مسلمانوں کے کمزور حکمرانوں نے جو ذہنی طور پر مغرب کی مادی ترقی سے مرعوب ہو چکے تھے یہ سمجھا کہ مغرب کی ترقی کا راز ان کے قوانین میں پوشیدہ ہے اور مسلمانوں کی نکبت کا سبب ان کے فرسودہ قوانین ہیں چنانچہ ترکی میں اتاترک نے ، مصر میں محمد علی نے اور ایران میں رضا شاہ پہلوی نے مغربی قوانین کی نقالی شروع کر دی ، اس کے ساتھ ہی جہاں جہاں مغربی استعمار نے اسلامی ملکوں پر قبضہ کیا وہاں اسلامی قوانین منسوخ کر دیئے اور مغربی قوانین رائج کر دیئے ۔

اور جیسا کہ ہوتا آیا ہے استعمار نے صرف ملک ہی فتح نہیں کئے بلکہ دلوں اور دماغوں کو بھی فتح کیا ، نظامِ تعلیم و تربیت بھی بدلا کہ آئندہ نسلیں ایسی پیدا ہوں جو مغربی تہذیب کے گن گانے والی ہوں، اس کے مظاہر کی رسیا ہوں ، خاص طور پر انہوں نے بالادست طبقوں میں اپنے حواری اور ایجنٹ پیدا کئے تاکہ جب انہیں یہ ملک خالی کرنے پڑیں تو حکمران طبقہ ایسا ہو جو ان کے طے کردہ خطوط پر چلنے والا ہو ، انہیں کی پالیسیوں کو جاری رکھنے والا ہو چنانچہ یہی ہوا، دوسری جنگِ عظیم کے بعد ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ مغربی قومیں مسلمانوں کے علاقوں پر اپنا قبضہ جاری نہ رکھ سکیں البتہ وہ ایسے لوگوں کو اپنا جانشین بنانے میں کامیاب ہو گئیں جو نام کے تو مسلمان ہوں لیکن اپنی اور اپنی قوم کی نجات شریعت کی پیروی میں نہیں بلکہ مغربی تہذیب کی پیروی اور اس کے قوانین کی اطاعت میں سمجھتے ہوں ۔

بیسویں صدی عیسوی ہی میں مغربی تہذیب کی کوکھ سے کمیونزم نے جنم لیا اور روس میں پہلی اشتراکی حکومت قائم ہوئی ، مغرب کی (برائے نام) عیسائی حکومتوں نے اسلام کو کمزور کرنے بلکہ مٹانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن پھر بھی جمہوریت اور بنیادی حقوق کے دعویدار ہونے کی وجہ سے ان کے استعماری نظامِ جبر میں ایسے رخنے پیدا کرنا ممکن ہوا جس سے ان کی مزاحمت ممکن ہوئی اور بالآخر مسلمانوں کو مختلف خطوں میں ان سے گلوخلاصی نصیب ہوئی لیکن

اس کے برعکس اشتراکیت ایک ایسے نظامِ جبر کا نام ہے جس کو جمہوریت ، شرافت اور انسانی عزت کی ہوا بھی راس نہیں ، یہ بنیادی طور پر مذہب دشمن نظام ہے اور ہر اس نظریے کا دشمن ہے جو کسی دین یا شریعت کی بنیاد پر احیاء یا اصلاح کا داعیہ رکھتا ہو چنانچہ مسلمان ممالک جہاں ایک طرف مغربی نظام سے مرعوب ہوئے وہیں ان کے گھر میں نظریاتی طور پر سرنگ کمیونزم نے بھی لگائی اور مغرب کی مخالفت کے زعمِ باطل میں اپنے شیطانی افکار کو اس نے مسلمان معاشرہ میں پھیلایا اور ان کی نظریاتی یکسوئی کا خاتمہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا ۔

عصرِ حاضر میں نفاذِ شریعت کی راہ میں رکاوٹیں

ہم یہاں صرف تین اہم عناصر کی طرف مختصر اشارہ کریں گے :۔

۱ ۔ لادین حکمران اور حکومتیں :

جیسا کہ ابھی ذکر ہوا شریعت کے نفاذ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمان حکومتیں اور حکمران ہیں جو اپنی اور مسلمان قوم کی بہتری مغربی تہذیب (اور بعض اشتراکی تہذیب) کی پیروی میں سمجھتے ہیں ۔ مسلمان عوام میں سے جو عناصر اسلام کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں غالب و کارفرما دیکھنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس کے لئے جدوجہد کرتے ہیں ان کے سب سے بڑے مخالف مسلمان حکمران ہی ہیں جو ان کو دبانے اور کچلنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ۔ عصرِ حاضر میں جتنی کوششیں اسلام کو بحیثیت نظامِ زندگی غالب کرنے کے لئے پاکستان ، مصر ، ملائشیا ، انڈونیشیا وغیرہ میں ہوئی ہیں ان کا عمیق مطالعہ نہیں صرف سرسری مطالعہ ہی یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ان قوتوں کو اصل مزاحمت کا سامنا مسلمان حکمرانوں سے کرنا پڑا ہے ۔

۲ ۔ مسلمان عوام کی غفلت اور لاعلمی

دوسرا بڑا سبب جو آج شریعت کی بالادستی اور اس کے عملی نفاذ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے وہ مسلمان عوام کی غفلت اور لاعلمی ہے ۔ مختلف مسلمان ممالک میں مسلم عوام کی ایک بڑی اکثریت تعلیم سے بے بہرہ ہے اور جو چند لوگ تعلیم یافتہ ہیں وہ بھی اس نظامِ تعلیم سے فارغ التحصیل ہیں جو انہیں اور تو شاید بہت کچھ بناتا ہو مگر ایک اچھا مسلمان ہی نہیں بناتا ۔ چنانچہ نتیجہ یہ

ہے کہ آج ایک عام مسلمان کو اس امر کا احساس ہی نہیں ہے کہ مسلمانوں کی ذلت و خواری کا سب سے بڑا سبب نظامِ شریعت پر ان کا عمل درآمد نہ کرنا ہے ، ان کی غالب اکثریت کو اس امر کا شعور ہی نہیں اور اگر کچھ شعور ہے تو اس کے تقاضوں کا احساس نہیں وہ نہیں جانتے کہ (آخرت ہی نہیں بلکہ) دنیا کی اس زندگی میں بھی عزت و عظمت اور کامیابی و فلاح کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ شریعت کی غلامی کا ہے کیوں کہ اپنے نظریۂ حیات سے کٹ کر اور اس سے بے وفائی کر کے کوئی قوم نہ تو زندہ رہ سکتی ہے اور نہ ترقی کر سکتی ہے ، وہ یہ بھول گئے ہیں کہ جو ایک خدا کے سامنے جھک جاتا ہے ، اتنا ہی نہیں ہوتا کہ اسے ہزاروں خداؤں کے سامنے جھکنا نہیں پڑتا بلکہ پھر ساری دنیا اس کے سامنے جھک جاتی ہے ، ہمارے عوام کی ایک بڑی اکثریت کو احساسِ زیاں ہی نہیں تو اس زیاں کا مداوا کیسے ہو؟

۳۔ علماء کا کردار

دراصل جو عناصر معاشرے کی جان ہوتے ہیں وہ علماء اور فضلاء ہیں جو قوم کی فکری رہنمائی کرتے ہیں اور اسلامی شریعت کے بنیادی اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے قوم کی ایسے خطوط پر رہنمائی کرتے ہیں جو انہیں حقیقی کامیابی اور کامرانی کی طرف لے جانے والی ہوں [illegible] ہے مسلم امت اس نعمت سے بھی ایک حد تک محروم ہو گئی ہے ۔ یہ کیوں ہوا اور کیسے ہوا ؟ اس کی تفصیل میں اگر جایا جائے تو یہ خود ایک اہم ، علیحدہ اور طویل موضوع ہے بہرحال مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس المیے کا آغاز خلافتِ راشدہ کے خاتمے کے بعد ہوا ۔ خلافتِ راشدہ کے وقت یہ ہوتا تھا کہ خلیفہ نہ صرف انتظامی سربراہ ہوتا تھا بلکہ تقویٰ اور علم و فضل میں بھی اس کی سیادت مسلّم ہوتی تھی ، بدقسمتی سے یہ صورتِ حال خلافتِ راشدہ کے بعد جاری نہ رہ سکی ۔ خلافت کے ملوکیت میں بدل جانے کے بعد آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ ایسے لوگ "خلیفہ" بننے لگے جو دینی علوم اور مسلم امہ کی قیادت کے لئے درکار اوصاف سے تہی دست تھے ۔ پھر اہلِ علم و تقویٰ کو حریف سمجھ کر نہیں دبایا جانے لگا تو نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اپنے آپ کو سیاست سے دور کر لیں ، دوسری طرف خلفاء و امراء تو چاہتے ہی یہ تھے انہوں نے اپنی دنیا الگ بسائی ۔ رفتہ رفتہ یہ تفریق گہری ہوتی گئی اور علماء ملکی نظم و نسق سے کٹ کر مساجد و مدارس کے ہو کر رہ گئے ۔ یہ غیر مطلوب تفریق جو پہلی صدی ہجری ہی میں پیدا ہو گئی تھی ، پچھلی چودہ صدیوں میں آہستہ آہستہ گہری ہو کر انتہائی مستحکم ہو چکی ہے اور اس کو شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلم

حکام و علماء دونوں نے قبول کیا ہوا ہے ، اگرچہ ماضی میں بھی اس سے استثناء کی چند مثالیں مل جائیں گی اور پچھلی صدی ہجری سے احیاء اسلام کی جو تحریکیں اٹھی ہیں انہوں نے بھی اس تفریق کو پاٹنے کی کافی حد تک کوشش کی ہے کیونکہ عرب دنیا میں اس کے بانی حسن البناء شہید اور برصغیر پاک و ہند میں اس کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ، دونوں علماء کے روایتی طبقے سے تعلق نہ رکھتے تھے اور نہ ہی ان کے متبعین طبقہ علماء تک محدود ہیں ۔ اسی طرح عصرِ حاضر میں بعض مسلم ممالک میں علماء نے سیاسی جماعتیں بھی بنالی ہیں یا وہ دوسری سیاسی جماعتوں میں شامل ہو کر کام کر رہے ہیں لیکن بایں ہمہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ اس تفریق کی جڑیں مسلم معاشرہ میں ابھی تک بہت گہری ہیں اور نتیجہ اس تفریق کا یہ ہے کہ مسلمان حکمران جو عملاً قانون سازی (اجتہاد) کا اختیار رکھتے ہیں دین سے (عموماً) بے بہرہ ہیں اور اس کے مقابلے میں وہ علماء جو دینی احکام کا کچھ شعور رکھتے ہیں وہ حکومت سے باہر ہیں یا جو اکا دُکا پارلیمنٹ یا حکومت میں چلے بھی جاتے ہیں انتہائی اقلیت میں ہونے کی بناء پر کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکتے ۔ ہاں ان کے مسلسل شور و شغب سے یہ ہوتا ہے کہ صریح دین دشمن قوانین بنانا حکومت کے لئے آسان نہیں رہتا ۔

دوسری طرف علماء جو رول مسجدوں اور مدرسوں میں بیٹھ کر ادا کیا کرتے تھے اس کے مؤثر ہونے کی بھی وہ کیفیت نہیں رہی جو کسی زمانے میں تھی کیونکہ توحید اور شرعی عقائد کا رشتہ حقیقی زندگی سے کٹ چکا ہے ۔ عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم نے لاہور کے عوام سے ایک دفعہ کہا تھا ، جب ان کی تقریر کے دوران رات بھیگ رہی تھی "لاہوریو! مجھے پتہ ہے ساری رات تقریر میری سنتے ہو اور واہ واہ کرتے ہو اور ووٹ صبح کسی اور کو جا کر دیتے ہو" اور یہی بات پاکستان میں ہونے والے انتخابات نے ثابت کر دی ہے کہ عوام علماء کی عزت ضرور کرتے ہیں لیکن جہاں تک حکومت اور معاشرے کی سیادت کا تعلق ہے اس کا سہرا وہ علماء کے سر باندھنے کو تیار نہیں وہ انہیں اپنی نمازوں کا امام تو مانتے ہیں لیکن حکومت و اقتدار میں اور دوسرے دنیوی امور میں ان کی امامت کا سکہ ماننے کو تیار نہیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ دوسرے ایسے مؤثرات و عوامل موجود ہیں (مثلاً جاگیرداروں ، سرمایہ داروں کا اثر ، حکومت اور پولیس کا اثر ، برادری کا تعصب وغیرہ) جن کا اثر اتنا قوی اور غالب ہے کہ وہ علماء کے اثر پر غالب آجاتا ہے ۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ وہ علماء کو اس کا اہل نہیں سمجھتے اور علماء نے اس کا استحقاق ثابت بھی نہیں کیا کیونکہ جس طرح زوال نے امت کے باقی اعضاء کو اضمحلال میں مبتلا کیا ہے اس سے

طبقۂ علماء بھی متاثر ہوا ہے ۔ ان کا حقیقی کردار عظمت و رفعت کا تھا جواب باقی نہیں رہا علماء سوء کا وجود تو بہت اچھے ادوار میں بھی رہا ہے عصر حاضر میں بھی ایسے علماء کی کمی نہیں جو اصحاب اقتدار کی خواہش پر خوب کو ناخوب اور ناخوب کو خوب کہنے پر تیار ہو جاتے ہیں ۔ ہم اس کی صرف ایک مثال عرض کرتے ہیں کہ جب مصر میں محمد علی نے فرانسیسی قوانین کو رواج دینا شروع کیا تو بعض قوانین کا مسودہ ازہر کے علماء کو بھیجا جس کمیٹی نے یہ مسودہ دیکھا اس میں چاروں سنّی مذاہب کے سرکردہ علماء موجود تھے لیکن انہوں نے فتویٰ دے دیا کہ یہ تو صرف 'تدوینِ جدید' کی ایک مستحسن کوشش ہے ورنہ اس میں کوئی غیر اسلامی بات نہیں (۷) اور نتیجہ یہ نکلا کہ جلد ہی مغربی قوانین نے شرعی قوانین کی اور مغربی طرز کی عدالتوں نے شرعی عدالتوں کی جگہ لے لی ۔

علماء کے غیر موثر ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں دعوت کا اسلوب از کار رفتہ ہے ، عملی زندگی سے کٹ جانے کی وجہ سے انہیں عصرِ حاضر کے چیلنج کا پوری طرح شعور نہیں ہے اور نہ وہ سائنسی انداز میں پڑھے لکھے لوگوں کو دینی احکام کی اہمیت و عظمت کا قائل کر سکتے ہیں ، ان کے غیر علمی اور غیر لچک دار رویے کا نقصان یہ ہوا ہے کہ پڑھے لکھے لوگ خصوصاً نوجوان طبقہ ان سے باغی ہو چکا ہے اور اس چیز نے اسلام پر ان کے یقین کو بھی متزلزل کر دیا ہے ۔

پھر عصرِ حاضر میں مسلمان امت کی ایک اور بد قسمتی یہ ہے کہ علماء کی اکثریت فرقہ پرستی میں مبتلا ہو گئی ہے اور ہر ایک نے اسلام کو اپنے فرقے تک محدود سمجھ لیا ہے جو ان کے مذہب کو نہیں مانتا وہ اول تو ان کے نزدیک کافر ہے ورنہ ضال و مُضِل (یعنی خود گمراہ اور دوسروں کو گمراہ کرنے والا) تو ضرور ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ طبقہ علماء کے اندر ایک دوسرے کے خلاف نفرت پھیلتی جا رہی ہے ، وہ اسلام کے نفاذ اور شریعت کی تطبیق کے لئے بھی اکٹھے ہو کر جدوجہد کرنے کو تیار نہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ متحد و متفق ہو کر اس کے لئے جدوجہد کریں اور تحریک چلائیں تو مسلم معاشرے میں ، خصوصاً پاکستان کے اندر ، اسلامی شریعت کا نفاذ بہت دور کی بات نہیں خلاصہ یہ کہ دوسروں کے علاوہ علماء بھی ہمارے معاشرے میں شریعت کی عدم تطبیق کے کافی حد تک ذمہ دار ہیں ۔

پس چہ باید کرد

اسلامی شریعت کے نفاذ کی راہ میں جن تین بڑی رکاوٹوں کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے ان کو دور کیسے کیا جا سکتا ہے؟

اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ اصلاح کی کوششیں ان تینوں طبقوں یعنی عوام، علماء اور حکومت کے اندر بیک وقت کی جائیں اور جب اس اصلاح کی طالب تحریک اتنی طاقتور ہو کہ وہ موثر ثابت ہو تو پھر شریعت نافذ ہونے کا رستہ کھل جائے گا، اس کام کے لئے ضروری ہے کہ اصلاحی کوششیں ہمہ جہت ہوں۔ فرض کیجئے اگر عوام یا علماء شریعت کا نفاذ چاہتے ہوں اور حکومت ایسا نہ چاہے تو اس کا نتیجہ کشمکش اور جدال ہی ہوگا، اسی طرح صرف حکومتی طاقت کے بل پر بھی شریعت نافذ نہیں کی جا سکتی کیونکہ جب تک وہ لوگ جن پر اسلامی قانون کو نافذ کیا جانا ہے اگر وہی اسے خوشدلی سے قبول نہ کریں اور اس پر عمل درآمد کی خواہش نہ رکھتے ہوں تو وہاں شریعت صحیح طریقے سے نافذ ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس پر عمل درآمد کے مؤثر نتائج نکل سکتے ہیں لہٰذا شریعت کے حقیقی نفاذ کے لئے نیچے اور اوپر سے بیک وقت کوشش کر کے ہی کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔

حواشی

۱ ۔ طٰہٰ ۔ ۲۰ ، الفرقان ۔ ۷۰ ، الروم ۲۴ ، القصص ۔ ۶۷

۲ ۔ الاحزاب ۔ ۳۶ ، النساء ۔ ۶۵ ، الانعام ۱۲۱

۳ ۔ المائدہ ۴۴ ، ۴۵ ، ۴۷

۴ ۔ ﴿یریدون ان یتحاکموا إلی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا به ۰۰۰﴾ (لنساء ۔ ۶۰)

۔ ﴿اذھب إلی فرعون انه طغی ۰۰﴾ طه ۔ ۲۴

۵ ۔ ﴿وما خلقت الجن والانس الّا لیعبدون ۰۰۰﴾ الذاریات ۔ ۵۶

﴿— و اذ قال ربک للملائکة انی جاعل فی الارض خلیفه﴾ البقره ۔ ۳۰

۶ ۔ ﴿ان جھنم کانت مرصادا للطاغین مآبا ۰۰۰﴾ النبأ ۔ ۲۲

﴿قال قرینه ربنا ما اطغیته ولکن کان فی ضلال بعید﴾ ق ۔ ۲۷

﴿ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئک ھم الظالمون﴾ المائده ۔ ۴۵

﴿ومن یظلم منکم نذقه عذاباً کبیراً ۰۰۰﴾ (الفرقان ۔ ۱۹)

۷ ۔ علی علی منصور ۔ المدخل للعلوم القانونیه والفقه الاسلامی ص ۱۲۶ (اس رپورٹ کا مسودہ مخطوطہ کی صورت میں قاہرہ میں ابھی تک موجود ہے ۔)

باب ہشتم

پاکستان میں قانون کی اسلامائیزیشن اور تطبیق

(ایک جائزہ)

طوالت کے پیش نظر اس باب کو ہم نے کئی حصوں میں تقسیم کیا ہے :

فصل اوّل: قیام پاکستان سے بھٹو کے دور تک (۱۹۴۷ — ۱۹۷۷ء)

فصل دوم: جنرل ضیاء کا دور (۱۹۷۷ — ۱۹۸۸ء)

جزء اوّل: جنرل ضیاء کا مارشل لاء کا دور (جولائی ۱۹۷۷ء ۔ مارچ ۱۹۸۵ء)

مبحث اوّل: قانون کی اسلامائیزیشن سے متعلق اداروں کی کارکردگی

مبحث دوم: قانون کی اسلامائیزیشن کے کام کا ایک تجزیاتی مطالعہ

جزء دوم: مسلم لیگی وزارت کا عرصہ (مارچ ۱۹۸۵ - مئی ۱۹۸۸ء)

جزء سوم: صدر ضیاء کی نگران حکومت کا عرصہ (مئی ۔ اگست ۱۹۸۸ء)

فصل سوم: پیپلز پارٹی کا دور ثانی (دسمبر ۱۹۸۸ء ـ)

فصل اول:

قیام پاکستان سے بھٹو کے دور تک (۱۹۴۷ — ۱۹۷۷ء)

پس منظر

ہندوستان کو مسلمانوں نے بزورِ بازو فتح کیا اور یہاں طویل عرصے تک حکمرانی کی، مغربی قومیں عروج کے بعد آہستہ آہستہ ہندوستان میں بھی قدم جماتی گئیں، مسلمان حکمران آپس کی نااتفاقیوں سے کمزور ہو چکے تھے، اسلام سے وابستگی بھی مضمحل تھی اس لئے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کی متحدہ سازشوں اور مغربی ٹیکنالوجی کی برتری کا مقابلہ نہ کر سکے اور بالآخر ۱۸۵۷ء میں ایک آخری لو دینے کے بعد مغلوں کے اقتدار کی شمع بجھ گئی، تاہم اس زوال کے جلد ہی بعد صاحب فکر و عمل لوگ اسلام اور مسلمانانِ ہند کی نشأۃ ثانیہ کی فکر میں لگ گئے چنانچہ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈھاکہ میں رکھی گئی، شروع شروع میں مسلمانوں نے آزادی کی جنگ ہندوؤں کے ساتھ مل کر لڑنے کی سکیم بنائی لیکن بتدریج انہیں یہ احساس ہو گیا کہ ہندو متعصب ہے اور اس کے دل میں مسلمان کے لئے کوئی نرم گوشہ موجود نہیں۔ دوسری طرف انہیں یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ اگر ہندوستان کو آزادی مل بھی جائے تو مغربی جمہوریت کے مطابق، جس میں اکثریت کی حکمرانی ہوتی ہے، وہ انگریز کی غلامی سے نکل کر ہندوؤں کی بالادستی کا شکار ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس صورت حال کے تدارک کے لئے ان میں یہ خیال ابھرا کہ جن علاقوں میں ان کی اکثریت ہے وہاں ان کی خود مختار مملکت قائم ہونی چاہئے جہاں وہ اسلامی نظریے کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے قائداعظم کی رہنمائی میں ایک آزاد مملکت "پاکستان" کی قرارداد منظور کی، قائداعظم نے محنت کر کے برصغیر کے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جمع کیا، یہ تحریک مختلف مدوجزر سے گزرتی رہی، آخر ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے مسلم ووٹوں کی اکثریت حاصل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے، چنانچہ وسط ۱۹۴۶ء میں انگریزوں نے ہندوستان کی تقسیم کا اصولی فیصلہ کر لیا اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مملکت خداداد پاکستان وجود میں آئی۔

جیسا کہ ابھی ذکر ہوا، پاکستان ایک نظریے کی بنیاد پر ہی وجود میں آیا تھا وہ نظریہ (یعنی نظریہ پاکستان) یہ تھا کہ مسلمان اپنے ایمان اور عقیدے کی بنیاد پر ہندوؤں سے الگ ایک منفرد قوم ہیں اور اس نظریے کے مطابق ایک اجتماعی زندگی گزارنے کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ ان کا ایک آزاد ملک ہو جہاں وہ بلاشرکت غیرے حکمران ہوں ، اس بات کو تحریک پاکستان کے قائدین نے ، قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں اچھی طرح نمایاں اور واضح کیا چنانچہ اس صورت حال کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ پاکستان میں معاشرے کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالا جاتا اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلام پر عمل کر کے ایک نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا لیکن بد قسمتی سے یہ نہ ہو سکا ۔ یہ کیوں نہ ہو سکا اور جو تھوڑا بہت کام ہوا وہ کیسے ہوا ؟ یہ ایک طویل موضوع ہے ، ہم یہاں اس داستان کے صرف اس حصے کا ایک مختصر جائزہ لیں گے جس کا تعلق قانونی اور دستوری پہلوؤں سے ہے ۔

قانون و دستور کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کی کوششوں کا ایک جائزہ

ہندوستان کی تقسیم برطانوی پارلیمنٹ کے پاس کردہ قانون "قانونِ آزادیٔ ہند مجریہ ۱۹۴۷ء" کے تحت عمل میں آئی تھی اس قانون میں یہ بھی درج تھا کہ دونوں ممالک کی قانون ساز اسمبلیاں جب تک اپنے ملکوں کے لئے آئین نہیں بنالیتیں وہ "انڈین ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء" کے تحت انتظامِ ملک چلا سکتی ہیں چنانچہ پاکستان میں بھی مذکورہ ایکٹ میں برائے نام چند تبدیلیاں کر کے اسے عارضی دستور کی حیثیت دے دی گئی ۔ اب ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مجلس قانون ساز کے افراد مل کر ایک دستور بنا لیتے جیسا کہ ہندوستان میں پونے دو سال کے اندر دستور بن گیا لیکن ہمارے ہاں یہ دستور ہزار مشکلوں کے بعد ۸ سال میں جا کر بنا اور اس پر بھی عمل درآمد کی نوبت نہ آسکی پھر اس دستور کو بناتے وقت اصحاب اقتدار کی پوری کوشش یہ تھی کہ یہ دستور چاہے جو کچھ بھی ہو اسلامی بہر حال نہ ہو چنانچہ دستور کو اسلامی بنیادوں پر (کم از کم قابلِ قبول حد تک) لانے کے لئے بھی اسلامی طاقتوں کو جو جانگسل جدوجہد کرنا پڑی وہ پاکستان کی تاریخ کا ایک حصہ ہے اور ہم تاریخ لکھنے نہیں بیٹھے لیکن اس کے باوجود موضوع کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس طرف کم از کم ضروری اشارے کرتے جائیں ۔

اسلامی دستور کی جدوجہد

پاکستان کے قیام کو چھ ماہ گزر جانے کے باوجود دستور ساز اسمبلی کا کوئی اجلاس منعقد

نہیں ہوا، مجلس قانون ساز کے اندر مختلف حضرات کا جو نقطۂ نظر سامنے آیا اس سے یہ خدشہ جھانکنے لگا کہ دستور کو اسلامی بنیادوں پر بنانے کا معاملہ محلِ نظر ہے تو علامہ شبیر احمد عثمانی مرحوم اور ان کے ساتھیوں نے حکومت کے اندرونی حلقوں اور جماعت اسلامی نے حکومت سے باہر یہ مطالبہ پیش کرنا شروع کیا کہ دستور بنایا جائے اور اسلامی بنیادوں پر بنایا جائے، اس کے جواب میں عذرات پیش کئے گئے تو یہ مطالبہ کیا گیا کہ حکومت پاکستان کم از کم ایہ اعلان تو کر دے کہ دستور اسلامی بنیادوں پر ہی بنایا جائے گا ، قائداعظم کی وفات کے بعد حکومت نے اس بات کو بزور دبانے کا فیصلہ کر لیا اور جماعت اسلامی کے رہنماؤں کو جیل بھجوا دیا ۔ جب دباؤ بڑھا تو حکومت نے اس مضمون کی ایک "قرارداد" پاس کرنے کی حامی بھر لی چنانچہ ۱۲ مارچ ۱۹۴۸ء کو "قراردادِ مقاصد" پاس ہوئی ۔ جہاں تک دستوری اور قانونی پہلوؤں کا تعلق ہے اس قرارداد میں صراحتاً یہ نہیں کہا گیا تھا کہ آئندہ دستور سازی اور قانون سازی لازمی طور پر شریعت کے مطابق ہو گی اور یا یہ کہ شریعت کے خلاف کوئی دستور یا قانون نہیں بنایا جاسکے گا تاہم اتنا ضرور ہوا کہ اس قرار داد کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی برتر حاکمیت (Sovereignty) کا اقرار کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ پاکستان کے مسلمانوں کو قرآن و سنت کے مطابق زندگی گزارنے کے مواقع مہیا کئے جائیں گے اور آزادی ، جمہوریت اور عدل اجتماعی کے اسلامی اصولوں پر عمل کیا جائے گا(۲)

بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور بورڈ تعلیمات اسلامیہ

اس کے ساتھ ہی مجلسِ قانون ساز نے دستور بنانے کے لئے ایک کمیٹی بنا دی جسے "بنیادی اصولوں کی کمیٹی" کہا گیا ، دینی نقطۂ نظر سے اس کمیٹی کی رہنمائی کے لئے علماء کا ایک بورڈ بنایا گیا جس کے سربراہ سید سلیمان ندوی تھے اور اس میں مفتی محمد شفیع صاحب ، مولانا ظفر احمد انصاری صاحب اور دیگر معتبر علماء شریک تھے ، بنیادی اصولوں کی اس کمیٹی نے ستمبر ۱۹۵۰ء میں اپنی رپورٹ پیش کی جو سراسر غیر اسلامی اور غیر جمہوری تھی ، علماء ہی نے نہیں بلکہ سیاستدانوں اور ہر شعبہ زندگی سے متعلق لوگوں نے اس کی مخالفت کی حتیٰ کہ حکومت کو یہ رپورٹ واپس لینا پڑی ۔

علما کے متفقہ ۲۲ نکات

اس موقع پر یہ پروپیگنڈا بھی کیا گیا کہ علماء اسلامی حکومت اور اسلامی قانون کا مطالبہ تو کرتے رہتے ہیں لیکن خود اسلامی قانون اور اسلامی حکومت کی تفصیلات پر ایک دوسرے کے

خلاف ہیں اور جب کسی چیز پر یہ خود ہی متفق نہیں ہیں تو عمل درآمد کس چیز پر کروایا جائے چنانچہ اس چیلنج کا جواب دینے کے لئے سب مکتبہ ہائے فکر کے علماء جنوری ۱۹۵۱ء میں کراچی میں جمع ہوتے اور متفقہ طور پر ایک ۲۲ نکاتی چارٹر حکومت کے اسلامی کردار کے بارے میں پاس کیا۔ اس چارٹر کی ۴ شقوں کا تعلق دستور و قانون سے تھا جن کا ذکر کر دینا بے فائدہ نہ ہوگا (۳)

شق نمبر ۱: اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العزت ہے۔

شق نمبر ۲: ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہوگا اور کوئی ایسا قانون بنایا جائے گا نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جائے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

شق نمبر ۳: مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہو گا کہ ان ہی کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

شق نمبر ۲۲: دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

لیکن ظاہر ہے کہ علماء پر یہ اعتراض تو برہنائے بہانہ تھا اصل بات یہ تھی کہ حکمران قوم کو اسلامی دستور دینے کے بارے میں مخلص ہی نہ تھے چنانچہ دوبارہ جو رپورٹ بنیادی اصولوں کی دوسری کمیٹی نے بنائی، اور شائع کرنے سے پہلے علماء کو دکھائی وہ بھی غیر اسلامی تھی چنانچہ علماء کے اصرار پر اس میں تبدیلیاں کی گئیں حتّٰی کہ وہ ان کے نزدیک بدرجۂ آخر قابلِ قبول ہوگئی لیکن اس وقت کے گورنر جنرل غلام محمد کو اسلامی ہونے کی وجہ سے ناپسند تھی اس لئے انہوں نے بہانہ بنا کر خواجہ ناظم الدین کی گورنمنٹ کو جو ایسی رپورٹ بنانے کی "مجرم" تھی برطرف کر دیا اور محمد علی بوگرہ کو آگے لا کر یہ تجویز پیش کروائی کہ فی الحال ۱۹۳۵ء کے ایکٹ ہی سے کام چلایا جائے، دستور بعد میں بن جائے گا لیکن ظاہر ہے قوم اس بات کو قبول نہ کر سکتی تھی چنانچہ دستور سازی کا کام دوبارہ شروع کر دیا گیا لیکن ۱۹۵۴ء میں جب دستور سازی کا کام آخری مراحل میں تھا گورنر جنرل نے سہروردی اور ایوب خاں سے مل کر اسمبلی برخواست کرا دی کیوں کہ اگر دستور بنتا، تو گورنر جنرل اور ان کے ٹولے کو انتخابات لڑنا پڑتے جس کے لئے وہ ذہنی طور پر تیار نہ تھے۔ مولوی تمیز الدین مرحوم (سپیکر) نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن وہاں بھی وہ جسٹس منیر جیسے کمزور آدمی کی وجہ سے ہار گئے اور اس طرح دستور کی سات سالہ کوششوں پر پانی پھر گیا۔ بہرحال عدالتی فیصلے کے مطابق نئی قانون ساز اسمبلی وجود میں آئی اور ۷ جولائی ۱۹۵۵ء سے اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔

۱۹۵۲ء کی دستوری رپورٹ کا ایک اہم پہلو

آگے بڑھنے سے پیشتر ہم قارئین کی توجہ ایک ایسے امر کی طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں جس پر عام طور پر توجہ نہیں دی جاتی ، ۱۹۵۲ء کی دستوری رپورٹ کی بنیاد پر چونکہ دستور نہ بنا اس لئے وہ تاریخ کا ایک حصہ بن چکی ہے لیکن اس میں بہر حال ایک نکتہ یہ تھا کہ اس میں قانون سازی کی اسلامی بنیادوں کی ضمانت کے لئے ایک طریق کار رکھا گیا تھا اور وہ مختصراً یہ تھا کہ علماء کا ایک بورڈ اسمبلی کی طرف سے پاس کردہ مسودہ قانون کا صدر کی منظوری سے پہلے جائزہ لے گا ، اور اگر وہ متفقہ طور پر اس قانون کی کسی شق کو غیر اسلامی قرار دے دے تو صدر اس قانون کو واپس اسمبلی میں بھیج دے گا جو یا تو اس کو منظور کر لے گی یا پھر دونوں ہاؤسوں کے مشترکہ اجلاس میں اس کے مسلمان ممبران کی اکثریتی رائے ہی سے اس کو پاس کیا جائے گا ، یہ انتظام مرکز اور صوبوں دونوں جگہ کے لئے تجویز کیا گیا تھا (۴) علماء کی اکثریت نے اس سفارش کو رد کر دیا (۵) (ماسوائے تین علماء کے) علماء کا خیال یہ تھا کہ جس طرح اسمبلی نے بورڈ تعلیمات اسلامیہ کی تجاویز کو نظرانداز کر دیا تھا ویسا ہی حشر اس علماء بورڈ کا بھی ہوگا ، چنانچہ اس کی بجائے انہوں نے یہ تجویز کیا کہ عدالت عالیہ کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ غیر اسلامی قوانین کو کالعدم قرار دے سکے اور یہ کہ عدالت میں علماء بھی ہوں ۔ لیکن ہمارے نزدیک دونوں باتوں میں فرق واضح ہے اور وہ یہ کہ پہلی صورت میں اس چیز کا انتظام کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ قانون سازی کا کام پارلیمنٹ میں ہی اسلام کے مطابق ہو اور دوسری صورت کا بالواسطہ مطلب یہ تھا کہ قانون ساز ادارہ قوانین جیسے چاہے بنا لے بعد میں عدالت کے ذریعے یہ طے کروایا جائے کہ کون سا قانون غیر اسلامی ہے ، علماء کے دوسری صورت کو اختیار کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوانین کی اسلامائیزیشن کے لئے اسلامی نظریاتی کونسل تشکیل دی گئی لیکن علماء اور مفکرین پھر کبھی اس بات پر بھرپور توجہ نہ دے سکے کہ کوئی ایسا انتظام کیا جائے کہ غیر اسلامی قوانین پارلیمنٹ میں بنیں ہی نہیں ۔

تو بہر حال چودھری محمد علی کی فراست اور حکمت سے دستور بن گیا اور ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو نافذ بھی ہو گیا ، اس دستور میں کئی باتیں اسلامی بھی تھیں ، قانون و دستور کے سلسلے میں اس میں یہ کہا گیا تھا کہ کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا اور موجودہ قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق بدل دیا جائے گا ۔ اس غرض کے لئے دستور بننے کے ایک سال کے اندر صدر مملکت کو ایک کمشن تشکیل دینا تھا جس نے پانچ سال کے اندر اس کام کو کرنا تھا بظاہر یہ بات بڑی خوشنما لگتی ہے لیکن اس حقیقت صرف اتنی ہے کہ مندرجہ بالا نکات یا تو دستور میں بطور

پالیسی بیان کر دیئے گئے جن پر عدالتی چارہ جوئی نہیں کی جا سکتی تھی یا ان کو ایسے کمزور اور مبہم الفاظ میں بیان کیا گیا کہ اسے عدالت میں لے جانے کا فائدہ نہ ہوتا (۹) ۔ چودھری محمد علی کو بھی دستور بنانے کے بعد رخصت ہونے پر مجبور کر دیا گیا چنانچہ بعد میں آنے والوں کے اخلاص نیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ایک سال گزر گیا لیکن اسلامی قوانین سے متعلق کمشن تشکیل نہیں دیا گیا جب آخری دن آگیا تو دستوری الجھن سے بچنے کے لئے کمشن کے صدر کے نام کا اعلان کر دیا گیا ، عملاً کوئی کاروائی بعد میں بھی نہیں کی گئی ۔ حتیٰ کہ ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے کہ ۱۹۵۶ کا آئین ہی ختم کر دیا گیا ۔

۱۹۶۲ء کا دستور

صدر اسکندر مرزا نے ۱۹۵۶ء کا دستور مارشل لاء لگوا کر ختم کروایا لیکن ایوب خان نے انہیں چند دنوں کے اندر چلتا کر دیا ۔ ۱۹۶۲ء کا دستور ایوب خان نے اپنی مرضی کا بنوا کر قوم پر مسلط کیا اگرچہ رسمی طور پر انہوں نے ایک آئینی کمیشن بھی تشکیل دیا تھا اور بنیادی جمہوریتوں کے نمائندوں سے آئین بنانے کا اختیار بھی لیا تھا ۔ اس آئین میں اتنی اسلامی دفعات بھی نہیں تھیں جتنی کہ ۱۹۵۶ء کے دستور میں تھیں ، ملک کے نام میں سے لفظ "اسلامی" حذف کر دیا گیا (۱۰) بنیادی حقوق صدر کے رحم کرم پر تھے ، اسلامی دفعات کو کمزور اور مبہم بنا دیا گیا ۔ "ہوں گے" کے صیغے کو "ہونے چاہئیں" کے الفاظ میں بدل دیا گیا اور اسلامی دفعات کو "پالیسی کے اصولوں" اور "قانون سازی کے اصولوں" کے عناوین کے تحت مدون کیا گیا تاکہ عدالتی چارہ جوئی کے ذریعے انہیں حاصل نہ کیا جا سکے ۔ تاہم اپوزیشن نے پہلے اجلاس ہی میں ایک پرائیویٹ بل ان ترامیم کے لئے پیش کر دیا ۔ "پاکستان میں چونکہ کسی حکومت کے لئے ممکن نہیں کہ وہ کھلم کھلا کسی اسلامی قانون کو رد کر دے" (۱۱) اس لئے حکومت نے اپنی طرف سے ایک بل پیش کر کے اسلامی دفعات کو کافی حد تک بحال کر دیا ، ملک کے نام کے ساتھ لفظ "اسلامی" بحال کر دیا گیا اور اسلامی نظریاتی کونسل کو یہ اختیار دیا گیا کہ قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق بدلنے کا کام کرے ۔ ایوب حکومت نے قانونی نظام میں اصلاح کے لئے ایک کمشن بھی تشکیل دیا جس کی سفارشات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھالنے اور پورے قانونی ڈھانچے کو اسلام کے مطابق بدلنے کے لئے ایک اسلامی قانون کمشن قائم کیا جائے لیکن اس پر حسبِ معمول توجہ نہ دی گئی ۔

ایوب حکومت کے دور میں نہ صرف یہ کہ اسلام کے حق میں کوئی کام نہ ہوا بلکہ الٹا اس کے خلاف کام ہوا اس نے اپنے متعین کردہ ایک کمیشن کی سفارشات کے مطابق (۱۲) بدنام زمانہ عائلی قوانین بنائے جنہیں علماء نے متفقہ طور پر غیر اسلامی قرار دیا ، اس نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا سربراہ بنایا جس نے اسلام کا ایک ایسا جدید ایڈیشن تیار کرنا شروع کیا جو عوام و خاص کسی کے حلق سے بھی نہیں اتر سکا ۔

جہاں تک اسلامی نظریاتی کونسل کا تعلق ہے ، اس کے دائرہ کار میں موجودہ قوانین کو اسلامی بنانے کے لئے سفارشات پیش کرنا اور اسلامی موضوعات پر حکومت کے ریفرنس کا جواب دینا وغیرہ شامل تھا ۔ ریٹائرڈ جسٹس ابو صالح محمد اکرم کی سربراہی میں اس نے تقریباً ڈیڑھ سال کام کرنے کے بعد استعفیٰ دے دیا ، پھر علامہ علاء الدین صدیقی صاحب کی سربراہی میں اس کونسل نے ۱۹۷۳ء تک کام کیا اور بعض قوانین کو اسلامی بنانے کے متعلق رائے دی ، اس نے حکومت کے ۱۹ ریفرنسوں کا جواب دیا اور پاکستانی معاشرے کو اسلامی بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے چوبیس سفارشات پیش کیں جن میں عائلی قوانین میں ترمیم ، سود کا خاتمہ ، شراب پر بندش ، احترام رمضان وغیرہ کے امور شامل تھے (۱۳) ۔ حکومت نے اکثر سفارشات پر عمل درآمد نہیں کیا سوائے چند ایک کے ، مثلاً یونیورسٹیوں میں شعبہ اسلامیات کا اجراء اور مذہبی امور کی وزارت کا قیام وغیرہ ۔

۱۹۷۳ء کا دستور

ایوب خان نے ملک کو جو سیاسی اور انتظامی ڈھانچہ دیا تھا ۔ وہ صحیح معنوں میں نہ اسلامی تھا اور نہ جمہوری ، بالآخر عوام کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور سیاستدان عوام کو ایوب حکومت کے خلاف متحرک کرنے میں کامیاب ہو گئے چنانچہ ایوب خان رخصت ہوئے لیکن اپنے ساتھ اپنا بنایا ہوا آئین بھی لے گئے ۔ جنرل یحییٰ کی رسوائے زمانہ پالیسیوں کی وجہ سے پاکستان اپنے مشرقی بازو سے محروم ہو گیا اور فوج کو بھی ذلت اٹھانا پڑی ، بھٹو صاحب نے اگرچہ ملک توڑنے میں اہم کردار ادا کیا تھا لیکن چونکہ بچے کھچے پاکستان میں انہیں انتخابی فتح کا دعویٰ تھا ، مقتدر جرنیلوں سے ان کے روابط تھے اور ملک انتہائی ہنگامی حالات سے گزر رہا تھا اس لئے حکومت ان کے حصے میں آئی ، انہوں نے پہلے سول مارشل لاء سے کام چلایا ، پھر ایک عارضی دستور بنا کر اس میں سارے اختیارات اپنے پاس رکھے اور پھر مجبوراً اپوزیشن کے دباؤ سے انہیں ۱۹۷۳ء کا آئین بنانا پڑا ۔

اس آئین میں جمہوری اور اسلامی دفعات رکھوانے کے لئے اپوزیشن کو زبردست جدوجہد کرنا پڑی ۔ آئین و قوانین سے متعلق جو شقیں اپوزیشن منظور کروا سکی وہ یہ تھیں کہ ملک کا مذہب اسلام ہو گا (۱۴) کوئی قانون اسلام کے خلاف نہ بنایا جائے گا (۱۵) ، اسلامی نظریاتی کونسل بنائی جائے گی ، حکومت کے علاوہ اسمبلی کے ممبران کی ۲/۵ اکثریت بھی کسی قانون یا اس کے مسودے کو نظریاتی کونسل کے پاس بھجوانے کی سفارش کر سکے گی ، حکومت اس امر کی پابند تھی کہ نظریاتی کونسل کی فائنل رپورٹ آنے کے دو سال بعد (کونسل کو ہر سال ایک عارضی رپورٹ اور سات سال کے اندر فائنل رپورٹ دینا تھی) اس کی سفارشات کے مطابق قانون سازی کرے (۱۶)۔

اس آئین کے تحت کونسل فروری ۱۹۷۴ء میں وجود میں آئی ، اس کے سربراہ جسٹس (ریٹائرڈ) حمود الرحمٰن تھے اور اس نے تین سال کا دورانیہ پورا کیا ۔ اس کونسل نے معاشرے کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے ۳۱ تجاویز پیش کیں جن میں سے چند قانونی پہلوؤں سے متعلق بھی تھیں مثلاً یہ کہ زنا کی حد نافذ کی جائے ، شراب پر پابندی لگائی جائے ، بینکوں سے سود ختم کر دیا جائے ، قحبہ خانوں پر پابندی کے لئے قانون بنایا جائے وغیرہ (۱۷) ۔ بھٹو صاحب نے عموماً نظریاتی کونسل کی رپورٹوں کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی لیکن جب وہ اپنی غیر اسلامی اور غیر جمہوری پالیسیوں کی وجہ سے عوامی تحریک کے غیظ و غضب کا نشانہ بن گئے تو اپنے ڈولتے ہوئے تخت کو سہارا دینے کے لئے انہوں نے آخری دنوں میں نظریاتی کونسل کے مشورے کے ساتھ چند اسلامی قوانین بنائے جن میں جمعہ کے روز چھٹی ، گھوڑ دوڑ پر پابندی ، شراب نوشی اور نائٹ کلبوں پر پابندی شامل تھی (۱۸) لیکن یہ کوشش بھی ان کے تخت کو سہارا نہ دے سکی ۔ قوم نے پاکستان قومی اتحاد کا ساتھ دیا لیکن پھر بھی وہ آسانی سے شکست ماننے کو تیار نہ تھے ۔ بالآخر فوج کو مداخلت کرنا پڑی ، دستور معطل کر دیا گیا اور سیاسی ادارے ختم کر کے ، فوج کے سربراہ جنرل ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لاء لگا دیا ۔

فصل دوم

جنرل ضیاء کا دور (۱۹۷۷-۱۹۸۸ء)

جزء اول : جنرل ضیاء کا مارشل لاء کا دور (۱۹۷۷--۱۹۸۵ء)

نوٹ : اس جزء کے دو مباحث یعنی مارشل لاء دور میں اسلامائزیشن کے ادارے اور ان اداروں کے کام کا ایک تجزیاتی مطالعہ ہمارے ڈاکٹریٹ کے انگریزی تھیسس کے ترجمے اور تلخیص پر مشتمل ہیں جو ۱۹۸۴ء میں لکھا گیا تھا لہٰذا ان میں دیئے گئے اعداد و شمار بھی ۱۹۸۴ء تک ہی ہیں اور اس وقت تک وقوع پذیر ہونے والے واقعات واحوال کا تجزیہ ہی ان میں مہیا کیا گیا ہے ۔

بھٹو حکومت کے خلاف عوام کی تحریک اصلاً انتخابات میں ہیرا پھیری اور ہر قیمت پر عوام کے سر پر مسلط رہنے کی کوشش کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی لیکن چونکہ بھٹو دور میں اسلامی اقدار و احکام کے خلاف فضا قائم کر دی گئی تھی اس لئے یہ تحریک جلد ہی مذہبی رنگ اختیار کر گئی اور اسے نظام مصطفےٰ کی تحریک کہا جانے لگا ۔ نئے فوجی حکمران نے آتے ہی عوام کے ابھرے ہوئے مذہبی جذبات کی حمایت کی اور ۹۰ دن کے اندر الیکشن کروا کر واپس بیرکوں میں جانے کا عزم ظاہر کیا ۔ دو دفعہ انتخابات کروانے کا اعلان کیا گیا لیکن پھر عین وقت پر انتخابات ملتوی کر دیئے گئے ۔ بالآخر فروری ۱۹۸۵ء میں جنرل ضیاء نے غیر جماعتی الیکشن کروا کر مسلم لیگی وزارت قائم کر دی اور اس سے پہلے ایک ریفرنڈم کے ذریعے اپنے آپ کو اسلام کے نام پر پانچ سال کے لئے منتخب کروالیا اور ۳۰ دسمبر ۱۹۸۵ء کو مارشل لاء ختم کرنے کا اعلان بھی کر دیا گیا ۔

اس آٹھ سالہ مارشل لاء کے دور میں اسلام اور اسلامی قانون سازی اور دستور سازی کے سلسلے میں جو کام ہوا اسے ہم دو حصوں میں بیان کریں گے ۔ مبحث اول میں ان اداروں کا ذکر ہوگا جنہوں نے اس سلسلے میں مثبت یا منفی کردار ادا کیا اور مبحث دوم میں اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ یہ کام کیوں نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکا ۔

مبحث اول : مارشل لاء دور میں اسلامائیزیشن کے ادارے ۔

پہلے ہم ان اداروں کا ذکر کریں گے جنہوں نے اس سلسلے میں کسی حد تک مفید کام کیا جیسے نظریاتی کونسل، وفاقی شریعت کورٹ اور کچھ معاون ادارے جیسے ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلامی یونیورسٹی ، وزارت مذہبی امور اور انصاری کمشن وغیرہ ۔

اسلامی نظریاتی کونسل

اگرچہ صدر ضیاء نے مارشل لاء لگانے کے بعد ۱۹۷۳ء کا دستور معطل کر دیا تھا لیکن اسلامی نظریاتی کونسل ۱۹۷۳ء کے دستور کے ان اداروں میں سے ایک ہے جنہیں نہ صرف باقی رکھا گیا بلکہ انہیں ترقی دی گئی ۔ اس کا بجٹ بڑھا دیا گیا اور صدر نے اس کے امور میں ذاتی دلچسپی لی ۔ ستمبر ۱۹۷۷ء میں جسٹس افضل چیمہ کی سربراہی میں اس نے کام شروع کیا ۔ مئی ۱۹۸۱ء میں اس کی تنظیم نو ہوئی ، جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کو اس کا چیئرمین بنایا گیا ۔ اس کے ارکان کی تعداد ۱۵ سے ۲۰ کر دی گئی (۵) پانچ ہمہ وقتی ارکان کا تعین کیا گیا ۔ اس کو کافی حد تک خود مختاری دی گئی تاکہ اس کی کارکردگی بڑھ سکے ۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کی رو سے کونسل کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو ایسے مشورے دے کہ مملکت پاکستان کے مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو قرآن و سنت کی روشنی میں اسلام کے قالب میں ڈھال سکیں ۔ اس کی یہ ذمہ داری بھی تھی کہ وہ قومی اسمبلی ، کسی صوبائی اسمبلی یا صدر اور کسی گورنر کے استفسار پر واضح کرے کہ کوئی مجوزہ قانون اسلامی شریعت کے مطابق ہے یا نہیں ۔ کونسل کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ ایسے اقدامات کے بارے میں حکومت کو مشورے دے جس سے موجودہ قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالا جا سکے نیز یہ کہ مرکزی اور صوبائی قانون ساز اداروں کو شرعی احکام اس صورت میں مدون کر کے پیش کرے کہ انہیں قانونی شکل دی جا سکے ۔

کونسل نے اس سلسلے میں جو کام کیا ہے اسے چار ذیلی عنوانات میں سمیٹا جا سکتا ہے :

۱ ۔ مروج قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھالنا

۲۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ہم آہنگ نئی قانون سازی

۳ ۔ آئین کو اسلامی نقطۂ نظر سے تبدیل کرنا

۴۔ معاشرے کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے لئے قانونی اور دیگر اقدامات

۱ ۔ مروج قانون کی اسلام کے ساتھ مطابقت

کونسل نے ستمبر ۱۹۸۱ء میں یہ طے کیا کہ وہ دستوری تقاضوں کے مطابق مروج قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے بڑی کوشش کرے گی چنانچہ پاکستان کوڈ کی پہلی آٹھ جلدوں پر نظر ثانی کا کام شروع ہوا اور اس طرح ۲۲۷ قوانین پر نظر ثانی کی گئی جس میں کونسل نے مشورہ دیا کہ اس میں سے ۶۷ قوانین کو جزوی طور پر تبدیل کیا جائے ، ۱۱ کو ختم کر دیا جائے اور ۲ کو نئے سرے سے بنایا جائے (۲۰) پھر جب کونسل نے محسوس کیا کہ پاکستان کوڈ کی بقیہ جلدوں پر نظر ثانی کا کام تو وفاقی شرعی عدالت نے انجام دے دیا ہے لیکن اپنے محدود اختیارات کی بنیاد پر وہ شخصی اور مالی قوانین پر نظر ثانی نہیں کر سکتی تو کونسل نے یہ ضرورت پوری کرنے کے لئے سارے شخصی قوانین نیز انشورنس ، بنکنگ ، ٹیکسیشن اور دیگر مالی قوانین پر نظر ثانی کا کام بھی مکمل کیا ۔ کونسل نے اس سارے کام کو ۱۵ مبسوط جلدوں کی صورت میں حکومت کو پیش کر دیا یہاں یہ ذہن میں رہے ان ساری سفارشات پر عمل درآمد کلیتاً حکومت کی ذمہ داری ہے اور کونسل اس سلسلے میں بے اختیار ہے لہذا ان سفارشات پر کوئی عمل درآمد نہیں ہوا ۔

اسلام کے مطابق نئی قانون سازی

اپنی مدت کار کے دوران اس کونسل نے جسٹس تنزیل الرحمٰن کی سربراہی میں ۱۷ نئے مسودہ ہائے قوانین بنا کر پیش کئے جن میں سے صرف چھ کو قانونی شکل دی گئی ۔

دستور کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کی کوششیں

جنرل ضیاء پہلے دن سے کہتے رہے ہیں کہ پاکستان کا نظام حکومت مغربی جمہوری نظام پر مبنی اور غیر اسلامی ہے جون ۱۹۸۱ء میں انہوں نے کونسل سے اس غرض کے لئے دستوری سفارشات پیش کرنے کو کہا تاکہ ان کی روشنی میں نظامِ حکومت میں تبدیلی لائی جا سکے اور الیکشن بھی کروائے جا سکیں ۔ کونسل نے اپنی سفارشات یکم اپریل ۱۹۸۲ء کو پیش کر دیں لیکن صدر صاحب ان سے مطمئن نہ ہوئے اور وہ رپورٹ واپس کر کے مزید تفصیلی رپورٹ طلب کی ۔ کونسل نے بہت سے اجلاس کئے اور بالآخر ۶ جون ۱۹۸۳ء کو نظر ثانی شدہ رپورٹ ارسال کر دی صدر صاحب نے یہ رپورٹ دیگر رپورٹوں کے ساتھ انصاری کمشن کو بھجوا دی جس نے ایک مربوط رپورٹ پیش کی اور صدر صاحب نے ان میں سے صرف چند چیزیں اپنی ضرورت کے مطابق لے لیں (جس کی تفصیل اپنی جگہ پر آئے گی)

متفرق اقدامات

اس کے علاوہ کونسل نے قانونی امور سے متعلق جو سفارشات پیش کیں وہ یہ ہیں (۲۱) ایک مستقل لاء کمشن پاکستان کے چیف جسٹس کی سربراہی میں قائم کیا جائے ، ہر طرح کی کورٹ فیس ختم کر دی جائے ، ججوں اور وکیلوں کی رہنمائی اور تربیت کے لئے ایک جیوڈیشل اکیڈمی قائم کی جائے ، صوبائی ہیڈ کوارٹروں میں اردو میڈیم لاء کالج کھولے جائیں ، اور موجودہ کالجوں میں دینی مدارس سے فارغ التحصیل طلبا کو داخلہ دیا جائے اور ان میں عربی زبان اور اسلامی قوانین کی تدریس لازمی کر دی جائے ۔

اسی طرح کونسل کی سفارش پر حکومت نے پہلے شریعت بنچ اور بعد میں وفاقی شریعت کورٹ قائم کی ، لاء کمشن قائم کرنے کے علاوہ اسلام آباد میں عالمی اسلامی یونیورسٹی قائم کی ۔ عدالتی ڈھانچے اور طریق کار کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے لئے ایک رپورٹ کونسل نے تیار کر کے صدر صاحب کو فروری ۱۹۸۴ء میں پیش کی ۔ دیگر متفرق سفارشات جو کونسل نے پیش کیں ان میں سے اہم تر یہ ہیں :

تعلیمی اداروں ، سرکاری تقریبوں اور پبلک اجتماعات میں نماز باجماعت کا اہتمام کیا جائے ، پاسپورٹوں اور شناختی کارڈوں میں مذہب کی شق رکھی جائے (تاکہ قادیانیوں کو عام مسلمانوں سے ممیز کیا جا سکے) ، سرکاری ملازمین کے لئے یکساں قومی لباس مقرر کیا جائے ، سرکاری دفاتر میں اسلامی تعلیمات پر مبنی کتبے لگائے جائیں ، رشوت ستانی کو ختم کرنے کے لئے مختلف اقدامات کئے جائیں ، مرکزی اور صوبائی سروسوں میں دیانت دار اور مضبوط کیریکٹر کے لوگوں کو بھرتی کیا جائے وغیرہ ۔ اسمبلیوں کی رہنمائی کے لئے کونسل نے جو کام کیا ہے اس کی تدوین و اشاعت کا کام ابھی زیر تکمیل ہے ۔

کونسل کی کارکردگی پر ایک مجموعی تبصرہ

مندرجہ بالا تصریحات سے واضح ہو جاتا ہے کہ موجودہ کونسل نے اس عرصے میں بھرپور کام کیا ہے اس کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے جب کونسل کی اس عرصے میں کارکردگی کا اس کے پچھلے کام سے ایک تقابلی جائزہ لیا جائے جو ذیل کے جدول سے ظاہر ہے ۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی کارکردگی

	۱۹۵۷-۷۷ (۲۰ سال)	۱۹۷۷-۸۴ (۷ سال)
۱- کل سیشن	۴۸	۵۳
۲- جتنے دن کام ہوا	۱۳۶	۳۸۸
۳- قوانین جن پر نظر ثانی ہوئی	۱۱۳	۳۲۹
۴- خصوصی رپورٹیں	—	۸
۵- قوانین کی اسلامائزیشن سے متعلق رپورٹیں	—	۱۵
۶- نئے مسودہ جات جو تیار کئے گئے	—	۱۷
۷- استفسارات جن کے جوابات دیئے گئے	۱۹	۱۳۵
۸- محققین (ارکان) کی تعداد	۸-۱۵	۲۰
۹- کل وقتی محققین	—	۵
۱۰- وہ قوانین جو کونسل نے مرتب کئے اور حکومت نے نافذ کر دیئے۔	۴	۶

کونسل کی سفارشات میں جن پر عمل درآمد کیا گیا ہے وہ یہ ہیں: حدود کا نفاذ، زکوٰۃ اور عشر آرڈی ننس کا نفاذ، وفاقی شریعت کورٹ، اسلامی یونیورسٹی اور لاء کمشن کا قیام، کورٹ فیس کا خاتمہ (جزوی طور پر) ۔ جن سفارشات پر عمل درآمد نہیں کیا وہ یہ ہیں: مروج قوانین تبدیل کرنے کی سفارشات، نئے مسودہ ہائے قوانین میں سے قانون شہادت، قانون قصاص و دیت، قانون قاضی کورٹس، قانون حق شفع وغیرہ موجودہ عدالتی نظام کو تبدیل کرنے کی سفارشات اور وفاقی شرعی عدالت کو وسیع اختیارات دینے کی سفارش ۔

اسلامی نظریاتی کونسل اسلامی نقطہ نظر سے قانون سازی کے سلسلے میں ایک بہتر پلیٹ فارم ہے کیوں کہ اس میں ہر مسلک کے جید علماء شریک ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کے تیار کردہ مسودہ ہائے قوانین کو وفاقی کونسل اور وزارتوں کے کارندوں کے ذریعے تبدیل کر کے دوبارہ غیر اسلامی بنا دیا جاتا ہے، درحقیقت یہ عذر کوئی وزن نہیں رکھتا کہ کونسل دستوری طور پر اس اختیار کی حامل نہیں کہ اس کے مسودہ ہائے قوانین کو تبدیل کئے بغیر لازمی طور پر نافذ کیا جائے کیوں کہ صدر صاحب نے جہاں اور بہت سی تبدیلیاں آئین میں اپنی ضرورتوں اور مصلحتوں کی خاطر کی ہیں وہاں بیک جنبش قلم کونسل کی دستوری حیثیت کو بھی تبدیل کیا جا سکتا تھا بشرطیکہ اس کی نیت موجود ہوتی ۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ اس وقت کونسل انتظامی لحاظ سے وزارت مذہبی امور کا ایک حصہ ہے اور براہ راست صدر یا کابینہ تک اس کی رسائی نہیں ۔ ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن نے کونسل کی طرف سے یہ مطالبہ کئی بار پیش کیا کہ کونسل کو وزارت کا درجہ دے دیا جائے یا اسے براہ راست صدر کے کنٹرول میں دیا جائے لیکن ان درخواستوں پر کبھی عمل درآمد نہیں ہوا ۔

کونسل کی تیار کردہ سفارشات پر عمل درآمد میں عموماً تاخیر کی جاتی ہے مثلاً قصاص و دیت کا مسودہ قانون جولائی ۷۰ میں کونسل نے تیار کیا لیکن ابھی تک نافذ نہیں ہوا اسی طرح قانون حق شفعہ اگست ۸۰ میں کونسل نے پیش کیا لیکن اس پر عمل درآمد نہیں ہوا ۔

کونسل کو اپنی رپورٹیں طبع کرنے کی اجازت نہیں اگرچہ اس سلسلے میں علماء اور پریس کی طرف سے بارہا مطالبہ بھی ہوا ہے بلکہ جنوری ۸۳ میں دوسرے علماء کنونشن میں تو صدر صاحب نے علی الاعلان وعدہ بھی کر لیا کہ کونسل کو رپورٹوں کی طباعت کی اجازت دی جائے گی لیکن بعد میں اس پر عمل درآمد روک دیا گیا (۲۲) (بعد میں مسلم لیگی وزارت کے دوران یہ رپورٹیں طبع ہوئیں اور ان پر اسمبلیوں میں بحث ہوئی)۔

وفاقی شرعی عدالت

نظریاتی کونسل نے مارشل لاء حکومت کو مشورہ دیا کہ عدالت ہائے عالیہ کو یہ اختیار دیا جائے کہ قانون کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کر سکیں اور حکومت نے یہ تجویز منظور کرلی ، دستور میں ترمیم کرنے کے بعد ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ میں شریعت بنچ قائم کر دیئے گئے لیکن یہ بوجوہ زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوئے چنانچہ کونسل کی سفارش پر حکومت نے اس مقصد کے لئے ایک الگ وفاقی شرعی عدالت قائم کردی ۔

عدالت کی ہیئت ترکیبی

شروع میں عدالت میں چار جج ہوتے تھے جو ہائی کورٹوں سے یہاں منتقل ہوئے ، چیف جسٹس (صدر عدالت) سپریم کورٹ کا جج ہوتا تھا جب عدالت نے رجم کے بارے میں یہ فیصلہ دیا کہ وہ "حد" نہیں ہے (۲۳) تو اس فیصلے کے خلاف علماء اور عوام میں ایک عام ناراضگی کی لہر دوڑ گئی کہ یہ عجیب شرعی عدالت ہے جو شریعت کے خلاف فیصلے دے رہی ہے چنانچہ علماء نے اجتماع کے بعد ایک نمائندہ وفد صدر مملکت سے ملنے کے لئے بھیجا تاکہ اس صورت حال کا کوئی تدارک ہو سکے ، بحث و مناقشہ کے بعد صدر نے وفاقی شرعی عدالت میں ۳ اور سپریم کورٹ کے شریعت اپیل بنچ میں ۲ علماء ججوں کے تعین کی منظوری دے دی ۔

شرعی عدالت کے اختیارات

شروع میں عدالت کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ صرف ان پٹیشنوں کے بارے میں فیصلہ دے جو کوئی صوبائی یا مرکزی حکومت ، مملکت پاکستان کا کوئی فرد یا ادارہ کسی قانون کی اسلامی حیثیت کے بارے میں دائر کرے ، بعد میں عدالت کے دائرہ کار میں یہ بات شامل کر دی گئی کہ وہ بطور خود (Suo Moto) (بغیر کسی پٹیشن کے) کسی قانون کا جائزہ لے سکتی ہے کہ آیا وہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی ۔ علاوہ ازیں سیشن اور ڈسٹرکٹ عدالتیں حدود آرڈیننس کے تحت جن مقدمات کا فیصلہ کرتی ہیں ان کے سلسلے میں وفاقی شرعی عدالت بطور ایک اپیل کورٹ کے کام کرتی ہے ۔

تاہم یہ ذہن نشین رہے کہ غیر اسلامی قوانین کو کالعدم قرار دینے کا وفاقی شرعی عدالت کا یہ اختیار خاصا محدود ہے کیوں کہ دستور، شخصی قوانین ، کورٹ پروسیجرز اور ہر قسم کے مالی قوانین کو

اس کے دائرہ کار سے باہر رکھا گیا ہے (۲۰) ۔ہاں اگر یہ عدالت کسی قانون کو غیر اسلامی قرار دے دے تو پھر حکومت کو عدالت کی طرف سے دی گئی معینہ مدت کے اندر اس کو ختم کرنا پڑتا ہے یا پھر عدالتی فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ کے شرعی اپیل بنچ میں اس کے خلاف اپیل دائر کرنا پڑتی ہے ۔

عدالتی طریقہ کار

عدالت کی خاص نوعیت کے پیش نظر خود عدالت نے اپنا طریق کار منفرد اور عام عدالتوں سے الگ رکھا ہے ۔ مثلاً یہاں کوئی کورٹ فیس نہیں ، پیشہ ور وکلاء کے علاوہ علماء دین اور مذہبی سکالرز بھی عدالت میں پیش ہو سکتے ہیں بلکہ اگر کوئی فرد چاہے تو اپنا کیس بغیر کسی وکیل اور عالم دین کی مدد کے خود لڑ سکتا ہے (بشرطیکہ وہ ضروری علم رکھتا ہو) ۔ اگر کوئی فرد ایک دفعہ درخواست دے کر اس کی پیروی نہ کرے یا بیمار یا فوت ہو جائے تو بھی عدالت کیس ختم نہیں کرتی بلکہ اسے خود مکمل کرتی ہے ۔ عالم دین یا وکیل اپنے موکل کو کامیاب کروانے کے لئے مقدمہ نہیں لڑتا جیسا کہ دوسری عدالتوں میں ہوتا ہے بلکہ معاملہ زیر بحث کی تشریح قرآن و سنت کی روشنی میں کرتا ہے ۔ عدالت نے اس غرض کے لئے علماء و سکالرز کا ایک پینل مقرر کر رکھا ہے ۔ عدالت کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ اندرون و بیرون ملک سے کسی عالم دین کو اپنی اعانت کے لئے بلوائے ۔

مروج قوانین کو اسلامی بنانے کے سلسلے میں عدالت کا کردار

عدالت کو جب یہ اختیارات مل گئے کہ وہ از خود قوانین کا جائزہ لے سکتی ہے تو اس نے پاکستان کوڈ کی جلد ۹ سے ۲۰ تک قوانین کا جائزہ لینا شروع کیا (کیونکہ نظریاتی کونسل نے پہلی آٹھ جلدوں کا جائزہ اپنے ذمہ لے لیا تھا) ۔ عدالت نے یہ کام ۲۲ مئی ۱۹۸۲ء سے شروع کیا اور دو سال میں ختم کر لیا ، عدالت کے کام اور نتائج کا خلاصہ اگلے صفحہ پر حاضر خدمت ہے ۔

عدالت کا طریقہ اس سلسلے میں یہ تھا کہ وہ اخباروں اور رسالوں میں پبلک نوٹس چھپواتی تھی تاکہ دلچسپی رکھنے والے عناصر اس کام میں شرکت کر سکیں ۔

جہاں تک شریعت پٹیشنز اور اپیلوں کا تعلق ہے تو جولائی ۱۹۸۴ء تک عدالت میں ۲۲۸ پٹیشنز جمع کروائی گئیں جن میں سے ۲۲۰ پر فیصلہ دیا جا چکا تھا ۔ اسی طرح ۸۱۳ کریمنل اپیلیں دائر

وفاقی شرعی عدالت

صوبائی قوانین پر نظر ثانی کی تفاصیل

صوبے کا نام	صوبائی قوانین جن پر نظر ثانی کی گئی	وہ قوانین جو غیر اسلامی نہیں پائے گئے	وہ قوانین جو غیر اسلامی پائے گئے	تبدیل کرنے کے لیے حکومت کو دی گئی آخری تاریخ
پنجاب	۳۱۱	۲۴۳	٦۸	۳۰-۹-۱۹۸۴
سندھ	۲۰۷	۱۵۴	۵۳	۳۰-۱۱-۱۹۸۴
این ۔ ڈبلیو ۔ ایف ۔ پی	۳۰۳	۲۵۱	۵۲	۳۰-۱۱-۱۹۸۴
بلوچستان	۱۷۸	۱۳۹	۳۹	۳۰-۱۱-۱۹۸۴
کل	۹۹۹	۷۸۷	۲۱۲	

وفاقی قوانین پر نظر ثانی کی تفاصیل

قوانین جن پر نظر ثانی کی گئی ________ ۵۰٦

قوانین جن میں کوئی غیر اسلامی شق نہیں پائی گئی ________ ۴۵۷

قوانین جو غیر اسلامی پائے گئے ________ ۴۹

کی گئیں جن میں سے جولائی ۱۹۸۴ء تک ۶۸۳ اپیلوں پر فیصلہ ہو چکا تھا ۔

وفاقی شرعی عدالت ۔ مسائل و مشکلات

وفاقی شرعی عدالت اس وقت تک جن مسائل و مشکلات سے دوچار ہے ان میں چند ایک یہ ہیں ۔

اسلامی قانون کے ماہر ججوں کی کمی

قانون کی تعلیم کا جو نظام اس وقت پاکستان میں موجود ہے وہ عجیب اور بے ڈھنگا ہے عام طور پر گورنمنٹ کے لاء کالجوں میں کامن لاء اور اس کی بنیاد پر مرتب قوانین پڑھائے جاتے ہیں اور اسلامی قانون یا تو پڑھایا نہیں جاتا یا برائے نام پڑھایا جاتا ہے ، اسی طرح پرائیویٹ دینی مدارس میں اسلامی فقہ کی تعلیم تو دی جاتی ہے لیکن وہاں مروجہ قوانین نہیں پڑھائے جاتے نتیجہ یہ ہے کہ ایسے آدمی ہمارے ہاں بہت کم ہیں جو دونوں قسم کے نظام ہائے قانون سے اچھی طرح واقف ہوں ، گنتی کے جو چند لوگ ہیں وہ ایسے ہیں جنہوں نے اپنی ذاتی کوشش و محنت سے یہ منزل سر کی ہے ۔ ان حالات میں ایسے ججوں کا ملنا جو دونوں نظام ہائے قانون کے ماہر ہوں واقعی مشکل ہے اور حکومت نے شروع میں جن ججوں کو ہائی کورٹ سے یہاں منتقل کیا تھا ان کے ماہر شریعت ہونے کے لئے یہی واقعہ کافی ہے کہ انہوں نے رجم کو حدود سے خارج کر دیا تا آنکہ علماء کے احتجاج پر علماء ججوں کا تقرر ہوا اور خود وفاقی شرعی عدالت ہی نے اپنا سابقہ فیصلہ واپس لے لیا ۔ اس وقت وفاقی شرعی عدالت میں پانچ عام ججوں کے ساتھ تین علماء جج اور شریعت اپیل بنچ میں پانچ ججوں کے ساتھ دو علماء جج ہیں ہماری تجویز یہ ہے کہ دونوں قسم کے ججوں کی تعداد مساوی ہونی چاہئے تاکہ ہر مقدمے میں ایک متوازی ٹیم موجود رہے ۔

دینی گروپوں کا عدم تعاون

اگرچہ عدالت نے پبلک نوٹس چھپوائے اور علماء اور دینی اداروں / جماعتوں کو فرداً فرداً بھی اطلاع دی لیکن انہوں نے عدالت کے کام میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی حکومت کا اس کام پر اندازاً ۲۴ لاکھ روپیہ خرچ آیا ۔ دینی اور دینی سیاسی جماعتوں کی اس عدم دلچسپی کے اسباب کئی ایک ہو سکتے ہیں ، یا تو وہ اس کام کی اہلیت نہیں رکھتے اور اس کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو تیار نہیں کیا (نعرے لگانا الگ بات ہے) یا پھر وہ سیاسی مصلحتوں کے تحت حکومت سے تعاون

نہیں کرنا چاہتے اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے جو سبب بھی ہے وہ افسوس ناک ہے ۔ جہاں تک عام قانون دان حضرات کے تعاون کا سوال ہے تو اول تو ان میں سے ہر کوئی اس کام کا اہل نہیں پھر پیشہ ورانہ تعصب یا رقابت بھی اس تعاون میں مانع ہونے کا سبب ہو سکتا ہے ۔

عدالت کا محدود دائرہ کار

اگر عدالت کے دائرہ کار پر پابندیاں نہ ہوتیں تو اس کے کام کے اثرات یقیناً زیادہ وسیع ہوتے ۔ موجودہ حالات نے جن میں وہ دستور ، شخصی قوانین ، عدالتی ضوابط اور مالی قوانین پر نظر ثانی نہیں کر سکتی ، اس کے دائرہ کار کو انتہائی محدود اور اس کی افادیت کو مشکوک کر دیا ہے ۔ (واضح رہے کہ ۱۹۸۸ میں شریعت آرڈیننس کے آنے سے ان حالات میں کچھ تبدیلی آئی ہے جن کا ذکر بعد میں ہوگا) عدالت کے دائرہ کار کے سلسلے میں یہ بھی ذہن میں رہے کہ وہ کسی قانون کو غیر اسلامی قرار دے کر حکومت کو اسے کالعدم قرار دینے کے لئے تو کہہ سکتی ہے لیکن وہ اس کی جگہ اسلامی مسودہ قانون بنا کر پیش نہیں کر سکتی یا اپنے طور پر اس میں ترمیم نہیں کر سکتی ۔ اسی طرح وہ مظلوم فریق کی دادرسی بھی نہیں کر سکتی ۔

شرعی عدالت کے فیصلوں کے خلاف اپیل تاخیر کا سبب بنتی ہے

وفاقی شرعی عدالت اگرچہ خود ایک عدالت اپیل ہے لیکن اس کے فیصلوں کے خلاف سپریم کورٹ کے شرعی اپیل بنچ میں اپیل کی جا سکتی ہے اور بے شمار مواقع پر ایسا ہوا ہے کہ حکومت اس طرح کی اپیل کر کے معاملہ التوا میں ڈلوا دیتی ہے اور پھر برسوں تک اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا اور اس طرح گویا اس عدالت کے فیصلوں کو غتربود کر دیا جاتا ہے اس کا حل یہ ہے کہ یا تو اس عدالت کے فیصلوں کے خلاف اپیل کا حق نہ ہو اور اگر یہ حق دیا جائے تو پھر ایک مدت کا تعین کر دیا جائے کہ اس کے اندر سپریم کورٹ فیصلہ دے خواہ یہ عدلیہ کی عمومی روایات کے خلاف ہی ہو ۔

عالمی اسلامی یونیورسٹی ، اسلام آباد

اگر معاشرے کی تعمیرِ نو اسلامی اصولوں پر کی جانی مقصود ہو تو اس کے لئے کثیر تعداد میں ایسے رجال کار کا وجود ناگزیر ہے جو شرعی علوم و آداب سے واقف ہوں اور جذبے اور اخلاص کے ساتھ معاشرے کے مختلف شعبوں میں اسلام نافذ کرنا چاہتے ہوں ۔ اسی احساس کے پیش نظر ملک میں اسلامی کاز کے لئے کام کی ابتدا کرتے ہی صدر ضیاء الحق نے ۱۹۷۹ء میں قائداعظم یونیورسٹی میں شریعت فیکلٹی قائم کی اور بعد میں یہ اندازہ کر کے کہ اتنے کام سے مقصد حاصل نہ ہو گا فیکلٹی کی بجائے ایک الگ اور مکمل یونیورسٹی کی بنیاد رکھ دی ۔

یونیورسٹی کے اغراض مقاصد

اسلامی یونیورسٹی آرڈیننس (مجریہ ۱۹۸۰) کے مطابق یونیورسٹی کے اہداف یہ ہیں کہ وہ اسلامی علوم و آداب میں تعلیم و تربیت اور اعلیٰ تحقیق کا انتظام کرے تاکہ مسلم امت کے عصری مسائل کا حل اسلامی اصولوں کی روشنی میں دریافت کیا جا سکے ، تاکہ امت کے دانشوروں کو مسائل پر بحث و تحقیق کے لئے اور ایک دوسرے کی آراء و تجربات سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک موزوں پلیٹ فارم میسر آسکے اور پاکستان اور دوسرے اسلامی ممالک کے درمیان اساتذہ اور محققین کے تبادلے اور باہمی ملاقاتوں سے مستفید ہوا جا سکے ۔ یونیورسٹی کے پیش نظر یہ بھی ہے کہ اس کے اساتذہ ، طلبہ اور دیگر ملازمین میں اسلامی ذہنیت کی آبیاری کی جائے تاکہ وہ اسلامی اقدار کا ایک جیتا جاگتا نمونہ بن سکیں نیز یہ کہ جو تحقیقی اور علمی کام یونیورسٹی میں ہو اس کی اشاعت و توزیع کا باقاعدہ نظام قائم کیا جائے ۔

یونیورسٹی کے امتیازی اوصاف

اسلام آباد کی اسلامی یونیورسٹی اسلامی تعلیم کا ایک منفرد عالمی حیثیت اس کے تکنیکی ممبرز سے ہی نمایاں نہیں بلکہ اس کے طلباء اور تدریسی پروگرام سے بھی عیاں ہے ۔ یہاں ذریعہ تعلیم عربی اور انگریزی ہے اور اس کے پیش نظر نظریاتی طور پر یکسو نوجوان اور دانشوروں کی کھیپ تیار کرنا ہے جو مسلم امہ کے مسائل اسلامی اصولوں کی روشنی میں ڈھونڈ سکیں ۔ یونیورسٹی میں خواتین کا شعبہ بھی قائم ہے جہاں اسلامی حدود کے اندر رہ کر مسلمان بچیوں کو اعلیٰ اسلامی تعلیم دی جاتی ہے ۔ اس وقت اگرچہ مدرسین مرد ہیں لیکن یونیورسٹی اس امر کے لئے کوشاں ہے کہ اسے

خواتین اساتذہ میسر آسکیں ۔ یونیورسٹی کے پیش نظر اسلامی علوم میں تحقیق و بحث کا ایک اعلیٰ معیار قائم کرنا اور ایسے محققین تیار کرنا ہے جو اسلامی کردار کے ساتھ ساتھ تحقیق کے جدید اصولوں اور اسالیب سے بھی اچھی طرح آگاہ ہوں تاکہ وہ مسلم امہ کی ابھرتی ہوئی شخصیت کا اظہار ہوں ۔

یونیورسٹی کی سرگرمیاں

یونیورسٹی کی متنوع سرگرمیوں میں سے ہم یہاں چند ایک کا ذکر کریں گے ۔

۱ ۔ تعلیمی پروگرام

جولائی ۱۹۸۴ء تک یونیورسٹی تین شعبوں میں تعلیمی پروگرام منظم کر چکی تھی شریعت و قانون ، دعوۃ و قراءات اور سائینسز (Sciences) (فی الحال صرف اکنامکس) ۔ ان شعبوں میں یونیورسٹی ایل ایل بی (آنرز) اور شریعت و قانون میں ایل ایل ایم کرواتی ہے ۔ اسی طرح دعوت و قراءات میں بی اے اور ایم اے کا انتظام ہے ۔ اسلامی اقتصادیات میں بی اے آنرز عربی زبان میں ایم اے اور قضاء (Judiciary) میں ڈپلومے کا انتظام ہے ۔

۲ ۔ پیشہ ورانہ تربیت

جس طرح کے علمی اشخاص یونیورسٹی پیدا کرنا چاہتی ہے ، وہ چونکہ ایک دو سال کا کام نہیں ہے بلکہ اس میں وقت لگے گا اس لئے یہ ناگزیر تھا کہ یونیورسٹی پہلے سے موجود ٹیلنٹ کے استعمال کے لئے کوئی قلیل المیعاد پروگرام بنائے ۔ اس غرض کے لئے یونیورسٹی نے شریعت اور قانون میں تین ماہ کے ریفریشر کورس کا انتظام کیا ہوا ہے جس میں ضلعی عدالتوں کے جج صاحبان اور پولیس کے افسران شامل ہوتے ہیں ۔ لیکچرز ، سیمیناز ، ورکشاپس اور گروپ مباحثے کے ذریعے ان حضرات کو عربی زبان ، اسلامی فقہ اور اصول فقہ ، نیز اسلام کے سول اور فوجداری قواعد و ضوابط سے متعارف کروایا جاتا ہے جولائی ۸۵ تک اس قسم کے ۹ کورس ہو چکے تھے ۔

۳ ۔ شعبہ اسلامی تحقیق

یونیورسٹی کے اس وقت جو تین سیکشن ہیں ان میں سے ہر ایک کا اپنا الگ تحقیقی پروگرام ہے ۔ اس وقت تک دعوۃ و قراءات کا شعبہ اپنی ضروریات کے لئے تصنیف و تالیف کے کام

میں مشغول ہے البتہ سکول آف اکنامکس کے سکالرز اسلامی اقتصادیات کے مختلف شعبوں میں تحقیقی سرگرمیوں میں مصروف ہیں ۔ اس سکول نے تحقیق کے لئے بہت سے موضوعات کا تعین کر رکھا ہے اور ایک تدریج کے ساتھ مختلف موضوعات پر ریسرچ کا یہ سلسلہ جاری ہے ۔ اس شعبے نے مئی ۱۹۸۳ء میں اسلامی اقتصادیات پر ایک عالمی کانفرنس بھی بلوائی تھی جہاں بہت سے مقالات پڑھے گئے بعد میں سکول نے ان کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا ۔

اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو بھی جو ایک پرانا تحقیقی ادارہ ہے اور ماضی میں دیگر مختلف اداروں سے وابستہ رہا ہے اب اسلامی یونیورسٹی کا ایک حصہ بنا دیا گیا ہے جس کی کارکردگی کی تفاصیل اسی باب میں سامنے آئیں گی ۔

۴ ۔ معاشرے میں دینی بیداری کا پروگرام

ملت کو اسلامی نظام کی ضرورت اور اس کے تقاضوں سے متعارف کروانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کا بھی کچھ انتظام کیا جائے ۔ اسلامی یونیورسٹی نے اس ضرورت کے پیش نظر عالم اسلام کی ممتاز شخصیتوں مثلاً شیخ الازہر کو اپنے ہاں مدعو کیا اور ان کے پروگرام رکھے ۔ اسی طرح ملک میں موجود دینی مدارس اور علماء کے ساتھ رابطے اور استفادے کی خاطر ایک ایڈوائزری کمیٹی قائم کی گئی ہے ۔ جہاں ضرورت ہو وہاں یونیورسٹی خود بھی دوسروں کو مشورے اور اعانت مہیا کرتی ہے چنانچہ اس نے قبرص میں اسلامی بنکنگ انسٹی ٹیوٹ اور انڈونیشیا میں اسلامک انسٹی ٹیوٹ کے قیام میں مدد دی ہے ۔ یونیورسٹی میں موجود پاکستانی اور غیر پاکستانی پروفیسروں کے عالمانہ لیکچروں کے علاوہ جمعہ کے خطبوں کا ایک نیا انداز اپنایا گیا ہے جس میں موضوع اور مقرر کا اعلان پریس میں کر دیا جاتا ہے اور پھر خطبے کے بعد متعلقہ موضوع پر کھلے بندوں بحث کی جاتی ہے ۔

یونیورسٹی کے مسائل و مشکلات

یونیورسٹی کو ایسے اساتذہ کے حصول میں وقت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو اسلامی علوم کے ماہر ہونے کے علاوہ بیک وقت انگریزی اور عربی پر عبور رکھتے ہوں اور تعلیم و تحقیق کے جدید اسالیب سے بھی واقف ہوں اسی طرح ایسی کتب بھی تقریباً ناپید ہیں جو یونیورسٹی کی تدریسی ضروریات کو پورا کر سکیں اور یونیورسٹی کے کئی شعبے خود ایسا مواد تیار کر رہے ہیں ۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ جو لوگ یونیورسٹی سے فارغ ہوں ان کو کہاں کھپایا جائے اور وہ کہاں کام کریں تاکہ وہ

بھی معاشرے کے لئے مفید ثابت ہو سکیں اور معاشرہ بھی ان کے علم و فضل سے کماحقہ استفادہ کر سکے ۔

ان مشکلات کے باوجود یونیورسٹی تیزی سے ترقی کر رہی ہے نئی کلاسیں اور نئے پروگرام ہر سال وضع کئے جاتے ہیں اور تعلیم و تحقیق کے نئے افق دریافت کر کے اہل علم دلجمعی اور جذبے کے ساتھ کام کر رہے ہیں ۔

ادارہ تحقیقات اسلامی

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور جناب ممتاز حسن کی کوششوں سے ادارے کے تصور نے ۱۹۵۴ء میں جڑ پکڑنا شروع کی اور ۱۹۵۶ء کے دستور میں اس کی گنجائش رکھی گئی ۔ بورڈ تعلیمات اسلامیہ کے خاتمے کے بعد ملکی سطح پر اسلامی نقطۂ نظر سے ایک علمی اور تحقیقی ادارے کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی چنانچہ اس انسٹیٹیوٹ کے اغراض و مقاصد میں یہ مذکور ہے کہ (۲۵)
یہ ادارہ اسلامی معاشرے (اور خصوصاً پاکستان کے تناظر میں) ایسی مستقل تحقیقی کاوشوں میں مصروف رہے گا جو ملک کے سماجی ، معاشی ، سیاسی ، قانونی اور تنظیمی ڈھانچے کو مضبوط اسلامی بنیادیں مہیا کرے اور اس سلسلے میں سروے ، سیمینارز اور سمپوزیم کا اہتمام کرے تاکہ مسلمان معاشرے کو درپیش عصری مسائل کا مطالعہ اور اس کے زوال کے اسباب کی نشان دہی ہو سکے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان مسائل کا حل پیش کیا جا سکے ۔ اس ادارے کے ذمے یہ بھی لگایا گیا کہ وہ اسلامی نظریاتی کونسل ، کسی وزارت یا کسی دوسرے حکومتی ادارے کی طرف سے پیش کردہ ریفرنس کا جواب دے یا مطلوبہ معلومات مہیا کرے ۔ تعلیمی اداروں خصوصاً دینی مدارس کے لئے نصاب کے تعین اور تیاری میں مدد دے تاکہ ان سے حقیقی استفادہ کیا جا سکے ۔ اماموں خطیبوں اور اسلامیات کے اساتذہ کی تعلیم و تربیت اور تیاری ، مساجد کے خطیبوں کے لئے راہنما مواد تیار کرنا ، مختلف میدانوں میں مسلمان علماء کے کئے گئے کام کو نمایاں کرنا اور ان کے تراجم کا انتظام کرنا ، تحقیقاتی کاوشوں کی طباعت اور مطبوعہ مواد کی مناسب تقسیم و اشاعت بھی ادارے کے اہداف کا ایک حصہ ہے ۔

انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیاں

ادارے کے اس وقت تین فعال شعبے ہیں: شعبہ تحقیق، شعبہ تعلیم اور شعبۂ نشر و اشاعت ۔

شعبہ تحقیق

اس شعبے کے ذمے مختلف تحقیقی سرگرمیاں ہیں مثلاً مخطوطوں اور غیر مطبوعہ کتب کی تحقیق ، انفرادی اور اجتماعی ریسرچ پروگرام، اسلامی قانون کے انسائیکلوپیڈیا کی تیاری ، کتب کا ترجمہ ، اسلامی فقہ پہ ایک سلسلۂ تصنیف اور مختلف اسلامی علوم مثلاً فقہ، اقتصادیات ، تعلیم و تربیت وغیرہ سے متعلق ارسال کردہ سوالوں اور ریفرنسز کا تحقیقی جواب مہیا کرنا ۔

اس شعبے کے کئی ذیلی شعبے ہیں جن میں قرآن و سنت، سیرت و تاریخ اسلام ، فقہ واصولِ فقہ ، اصول الدین ، اقتصادیات، سماجیات، سیاسیات، اسلام اور مسلم امہ کے مسائل ، تصنیف و ترجمہ، تعلیم ، سائنس ، فلسفہ ، نفسیات اور تصوف کے شعبے شامل ہیں ۔

تعلیمی شعبہ

اس شعبے کے چھ ذیلی شعبے ہیں جن کے ذمے معلمین کی تیاری اور تربیت، سکولوں ، یونیورسٹیوں اور دینی مدارس کے لئے نصابی مواد کی تیاری ، اور جنوب مشرقی ایشیا میں عیسائی مشنری سرگرمیوں پر تحقیق شامل ہے۔ ایک شعبہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام بھی کرتا ہے اس کے ممبران ریڈیو اور ٹیلیویژن پر تقاریر کا اہتمام کرتے ہیں ۔ جمعہ کا خطبہ دیتے ہیں اس کے علاوہ دینی موضوعات پر کیسٹوں کی تیاری اور مبلغین کی تربیت کا اہتمام بھی اسی شعبے کے ذمے ہے ۔ تعلیمی شعبہ مختلف دینی موضوعات پر آسان لٹریچر تیار کر کے تقسیم کرواتا ہے نیز خط وکتابت کے کورس کا انعقاد اور سمعی و بصری آلات پر مشتمل ایک متحرک یونٹ بھی اس شعبے کی تحویل میں ہے ۔

شعبہ نشر واشاعت

طباعت و اشاعت کا کام اور مخطوطوں کی فلم تیار کرنے کا کام اس شعبے کے ذمے ہے ایک عظیم لائبریری کے انتظام کے علاوہ یہ شعبہ تین جرائد کی اشاعت کا انتظام بھی کرتا ہے جن میں ماہنامہ فکر و نظر (اب سہ ماہی) اسلامک سٹڈیز (سہ ماہی انگریزی رسالہ) الدراسات الاسلامیہ (دو ماہی عربی رسالہ) شامل ہیں ۔

موجودہ قانونی ڈھانچے کی اسلامائیزیشن کے سلسلے میں ادارے کا کردار

یا کوئی اور حکومتی ادارہ کسی قانون کی اسلامی حیثیت کے بارے میں ادارے سے رجوع کرے تو ادارہ تحقیق کے بعد اس کا جواب ارسال کرتا ہے ۔ اس کے علاوہ ادارہ متذکرۃ اداروں کو تحقیقی معاونت ، ضروری معلومات اور تحقیقی مواد بھی ، حسب طلب ، مہیا کرتا ہے نیز فقہ و اصول فقہ پر امہات کتب کا عربی سے اردو ترجمہ کر کے وکلاء اور ججوں کے لئے شائع کرتا ہے اس سلسلے میں ادارے نے خاصا کام کیا ہے ، ماضی میں کئے گئے کام کی تفصیلات حاضر خدمت ہیں ۔

ادارہ تحقیقات اسلامی

رپورٹ کارکردگی ۔ مئی ۱۹۷۳ تا مئی ۱۹۸۴

ریفرنس/استفسار تاریخ وصولی	ادارہ جہاں سے ریفرنس وصول ہوا	موضوع	جواب بھجوانے کی تاریخ
۱۹۸۳-۵-۳۱	اسلامی نظریاتی کونسل	سپیسیفک ریلیف ایکٹ ۱۸۷۷ پر اسلامی نقطۂ نظر سے تبصرہ	۱۹۸۳-۸-۲۴
۱۹۸۳-۸-۲۰	اسلامی نظریاتی کونسل	کنٹریکٹ ایکٹ ۱۸۷۲ پر رائے طلبی	۱۹۸۳-۸-۳۰
۱۹۸۳-۸-۲۰	اسلامی نظریاتی کونسل	ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ ۱۸۸۲ پر اسلامی رائے	۱۹۸۳-۹-۱۴
۱۹۸۳-۱۰-۲۹	چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا سیکرٹریٹ	"مجلۃ الاحکام الادبیۃ" نامی کتاب پر ماہرانہ کی رائے	۱۹۸۴-۲-۰۸
۱۹۸۴-۱۱-۱۷	اسلامی نظریاتی کونسل	اسلامی حکومت میں نظام معیشت پر ایک سوالنامہ	۱۹۸۳-۱۲-۱۲
۱۹۸۳-۱۱-۲۲		۱- انسٹی ٹیوٹ کے جرائد میں انشورنس کے موضوع طبع شدہ مضامین کی تجمیع ۲- انشورنس کے موضوع پر مجلس تحقیقات شرعیۃ لکھنو کے استفسار کا مہیا کرنا ۳- انشورنس کے موضوع پر مجمع الفقہ الاسلامی قاہرہ کی سالانہ رپورٹ کا مہیا کرنا	۱۹۸۳-۱۲-۱۲

۱۴-۱۲-۱۹۸۳	مرکزی زکوٰۃ کونسل، اسلام آباد	شیخ الازہر قاہرہ کے عربی فتوے کا اردو ترجمہ	۲-۱-۱۹۸۴
۱۴-۱-۱۹۸۴	وزارت خارجہ اسلام آباد	حدود آرڈی ننس ۱۹۷۹ کے کے متعلق مواد کی فراہمی	۱۶-۲-۱۹۸۴
۱۵-۱-۱۹۸۴	چودہری ایم طفیل حسن، چیئرمین سلیکٹ کمیٹی مجلس شوریٰ	قصاص ودیت کے موضوع پر مصر کی قومی اسمبلی کی رپورٹ کے ۳۰۰ صفحات کا اردو ترجمہ	۱۲-۲-۱۹۸۴
۱۵-۱-۱۹۸۴	وزارت اطلاعات، اسلام آباد	قرآن کے مشہور مفسرین کے اسماء اور سوانح عمریاں	۱۶-۲-۱۹۸۴
۹۲-۱-۱۹۸۴	وزارت مذہبی امور اسلام آباد	"اسباق القرآن کی طباعت پر رائے طلبی	
۲۹-۱-۱۹۸۴	وزارت مذہبی امور اسلام آباد	علامہ اقبال کے مضمون "اسلام اور احمدیت" کی فراہمی	۹-۵-۱۹۸۴
۱۲-۲-۱۹۸۴	وفاقی شرعی عدالت اسلام آباد	پنجاب کے ۴۷ قوانین پر اسلامی نقطۂ نظر سے رائے زنی	۱۲-۲-۱۹۸۴
۱۸-۲-۱۹۸۴	یونیورسٹی گرانٹس کمشن اسلام آباد	ملتان کی ادبی اور ثقافتی زندگی پر صوفیاء کے اثرات	۳-۳-۱۹۸۴ ۳-۳-۱۹۸۴
۲۲-۲-۱۹۸۴	وزارت خارجہ اسلام آباد	حدود آرڈی ننس ۱۹۷۹ پر مواد کی فراہمی	۳-۳-۱۹۸۴
۲۲-۲-۱۹۸۴	مرکزی زکوٰۃ کونسل اسلام آباد	عربی مقالات کا اردو میں ترجمہ	۴-۳-۱۹۸۴
۲۷-۲-۱۹۸۴	وفاقی شرعی عدالت، اسلام آباد	بلوچستان کے ۷۵ قوانین پر اسلامی نقطۂ نظر سے رائے زنی	۲۷-۳-۱۹۸۴
۱۰-۳-۱۹۸۴	وفاقی شرعی عدالت اسلام آباد	سندھ کے ۱۰۰ قوانین پر اسلامی نقطۂ نظر سے رائے زنی	
۱۲-۳-۱۹۸۴	کیبنٹ سیکرٹریٹ (خواتین ڈویژن) اسلام آباد	اسلامی ممالک کے قوانین کا اردو ترجمہ	۲۰-۳-۱۹۸۴

۲-۴-۱۹۸۴	اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد	ٹرانسفر آف پراپرٹی ایکٹ کے سیکشن 53A-49 پر اسلامی نقطۂ نظر سے رائے زنی	۱۲-۱۲-۱۹۸۳
۱۹-۴-۱۹۸۴	وفاقی شرعی عدالت اسلام آباد	۱۴۱ وفاقی قوانین پر رائے طلبی	۳-۵-۱۹۸۴
۱-۵-۱۹۸۴	وفاقی شرعی عدالت اسلام آباد	صوبہ سرحد کے ۸۵ قوانین پر رائے طلبی	۲۴-۵-۱۹۸۴

اس سلسلے میں ادارے کے کراچی یونٹ نے اچھا کام کیا ہے جہاں سے ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب کے مجموعہ قوانین اسلام کی چھ جلدیں اب تک طبع ہو چکی ہیں ۔ ۱۹۸۱ء میں امہات فقہی کتب کے ترجمے کا کام شروع کیا گیا اس سلسلے میں اب تک مندرجہ ذیل کتب شائع ہو چکی ہیں:

— حدود و تعزیرات
— قصاص و دیت
— اصول الکرخی

زیر اشاعت کتب

— رباء اور مضاربہ
— ادب القاضی
— حدود و تعزیرات (فقہ جعفریہ)
— قصاص و دیت (فقہ جعفریہ)

زیر تدوین کتب

— زکوٰۃ و عشر
— حق شفع اور بیع
— حوالہ
— ادب القاضی

تبصرہ

ایک قومی سطح کے بڑے ادارے سے جو توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں اس پر یہ ادارہ پورا نہیں اترتا جس کے کئی اسباب ہیں ، چند ایک اہم اسباب کا ہم ذکر کئے دیتے ہیں:

حکومت نے خود ہی ادارے کو شایان شان اہمیت نہیں دی، اس کا اپنا کیمپس نہیں ، نہ ہی اس کو یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا ہے ۔ یہ مختلف ادوار میں مختلف وزارتوں سے منسلک اور اس چیز نے اس کی کارکردگی کو بہت بری طرح متاثر کیا ہے تفصیل ملاحظہ ہو:

۱۹۶۰-۶۵ء وزارت تعلیم

۱۹۶۵-۷۴ء وزارت قانون و پارلیمانی امور

۱۹۷۴-۷۷ء وزارت مذہبی امور

۱۹۷۷-۷۸ء اسلامی نظریاتی کونسل

۱۹۷۸ء وزارت قانون و پارلیمانی امور

۱۹۷۸-۷۹ء وزارت مذہبی امور (بغیر بورڈ آف گورنر کے)۔

۱۹۷۰-۸۰ بورڈ آف گورنر بحال کر دیا گیا

۱۹۸۰ء تا حال ملحق بہ اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور ان کے ساتھیوں کی تجدد پسندی نے بھی اس ادارے کے وقار اور سنجیدگی کو نقصان پہنچایا ہے ۔ حکومتی ذرائع سے بھی اس کی کارکردگی کو کبھی نمایاں نہیں کیا گیا ۔ اگر ان کمزوریوں کو دور کر دیا جائے تو ادارہ ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے ۔

وزارتِ مذہبی امور

جو ادارے نفاذِ اسلام کے عمل سے براہ راست وابستہ ہیں ان میں ایک وزارتِ مذہبی امور بھی ہے ، اس وزارت کا قیام ۱۹۷۴ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش پر عمل میں آیا دراصل جو چیز اس کے قیام میں پیش نظر تھی وہ یہ تھی کہ حکومتی سطح پر ایک ایسا ادارہ ہونا چاہئے جو مختلف دینی سرگرمیوں کو مربوط کرے تاکہ غیر ضروری تاخیر اور دفتری کاروائیوں سے بچا جا سکے نظریاتی کونسل اس سے پہلے وزارت قانون سے ملحق تھی لیکن اس وزارت کے بننے کے بعد، مارچ ۱۹۷۸ء سے اس وزارت کے ساتھ منسلک ہے ۔

تنظیمی ڈھانچہ

وزارت کے اس وقت پانچ بڑے شعبے ہیں: شعبۂ حج، شعبۂ تحقیق و مراجع، شعبۂ اوقاف، شعبۂ اقلیات اور شعبۂ انتظامیہ

شعبۂ حج

حج سے متعلقہ جملہ امور اس شعبے کی ذمہ داری ہیں، درخواستیں وصول کرنا، ان کی قرعہ اندازی کرنا اور متعلقہ حاجیوں کو اس کی اطلاع کرنا، ان کے لئے سفر کے انتظامات کرنا اور ان کو اس کی اطلاع دینا، مکہ اور مدینہ میں رہائش کے سلسلے میں ان کی مدد کرنا یہ سب امور اس شعبے سے متعلق ہیں، اس غرض کے لئے وزارت نے کراچی میں حج کیمپ اور دیگر انتظامات کے لئے ایک حج ڈائریکٹوریٹ قائم کر رکھا ہے۔ اسی طرح جدہ میں ڈائریکٹر جنرل کا مرکز موجود ہے کمپیوٹر کے استعمال کی وجہ سے دشواریاں قدرے کم ہوگئی ہیں۔ یہ شعبہ سالانہ حج کانفرنس کا بھی اہتمام کرتا ہے اور اس میں طے کردہ پالیسی کے مطابق آئندہ حج کے انتظامات کرتا ہے۔

شعبۂ اوقاف

اوقاف سے متعلق تمام امور اس شعبے کی ذمہ داری ہیں، فنِ تجوید اور قرأت کے سلسلے میں اس شعبہ نے اہم خدمات انجام دی ہیں اور اس کے زیرِ اہتمام ہر سال قومی سطح پر مقابلۂ حسنِ قرأت منعقد ہوتا ہے۔ حفظِ قرآن اور تجوید کے لئے مناسب قراء کو یہ شعبہ بیرون ملک بھجواتا ہے۔ یہ شعبہ اوقاف کی متروکہ املاک کا ذمہ دار بھی ہے جن میں سے ایک لاہور میں دیال سنگھ کالج لائبریری بھی ہے۔ اس لائبریری کے ساتھ ایک ریسرچ سنٹر ہے جو اسلامی فقہ کے لئے شاندار کام کر رہا ہے اس کے جریدہ 'منہاج' نے ایک قلیل مدت میں اہم علمی مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس سنٹر نے اسلامی قانون سے متعلق کئی اچھی کتابیں شائع کی ہیں۔

شعبہ اقلیات

یہ شعبہ ملک میں موجودہ اقلیتوں کے حقوق کی نگہداشت اور ان کی فلاح و بہبود کی خدمات انجام دیتا ہے۔

شعبہ انتظامیہ

اسلامی نظریاتی کونسل جو آئینی لحاظ سے پاکستان کا سب سے وقیع مذہبی اور علمی ادارہ ہے ، انتظامی لحاظ سے اس شعبے کے ساتھ منسلک ہے ۔ یہ شعبہ انتظامی اور مالی امور کا انچارج ہے ۔

شعبہ تحقیق و مراجع

یہ شعبہ نفاذِ اسلام کے لئے ضروری تحقیق کے ساتھ مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے کر تجاویز اور منصوبے مرتب کرتا ہے اور دوسرے اداروں کی تیار کردہ تجاویز کے عملی پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے ۔ اس شعبے کا یہ کام بھی ہے کہ مختلف سرکاری محکموں کی طرف سے آمدہ مذہبی استفسارات کا جواب مہیا کرے ۔ یہ شعبہ کئی سیکشنوں پر مشتمل ہے مثلاً قرآن و سیرت ، فقہ و قانون اور عمومی شعبہ ۔ اب ہر سیکشن کے کام پر ایک سرسری نظر ۔

قرآن سیکشن : یہ سیکشن اغلاط سے مبرا قرآن حکیم کی طباعت کی نگرانی کرتا ہے، ملکی و غیر ملکی زبانوں میں تراجم کرانے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، قرآن بطور ہدیہ تقسیم کرواتا ہے تجوید و قرأت کی حوصلہ افزائی کے لئے اقدامات کرتا ہے اور قرآن حکیم کی تبلیغ و اشاعت اور ترویج و تعلیم کے لئے تجاویز اور منصوبے بناتا ہے ۔

سیرت سیکشن : یہ سیکشن سالانہ قومی سیرت کانفرنس کا انعقاد کرواتا ہے اور پیش کردہ مقالوں کی طباعت کرواتا ہے ۔ عالمی سیرت کانفرنس کی سفارشات پر عمل درآمد کرواتا ہے، سیرت طیبہ پر لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لئے انعامی مقابلوں کا انعقاد کرواتا ہے، سیرت پر کام کے سلسلے میں ایک علمی مرکز کے قیام کے لیے وزارتِ تعلیم کے ساتھ تعاون کرتا ہے ۔

فقہ و قانون سیکشن : اس سیکشن کا ایک بڑا کام اسلامی نظریاتی کونسل کے ساتھ تعاون ہے یہ کونسل کی تجاویز کو متعلقہ وزارتوں / اداروں کو ان کی رائے معلوم کرنے کے لئے بھجواتا ہے اور ان کے موصول ہونے پر خلاصے کی صورت میں کابینہ کے سامنے پیش کرتا ہے ۔ یہ سیکشن وزارت قانون ، لاء کمیشن ، وفاقی عدالت اور نفاذ اسلام کے دوسرے اداروں کے درمیان رابطے کا کام انجام دیتا ہے ۔ اس کے علاوہ یہ صیغہ بعض مذہبی نوعیت کے قوانین بھی مرتب کرواتا

ہے ۔ بیرون ملک سے شخصی قوانین کے بارے میں پیش آمدہ مسائل کے جواب بھی یہی سیکشن تیار کرتا ہے ۔ ذیل کے جدول سے اسلامی قانون سازی میں اس وزارت کے کردار کا پتہ چلتا ہے ۔

اسلامی نقطۂ نظر سے قانون سازی کے سلسلے میں وزارت مذہبی امور کا کردار

نام مسودہ قانون	تاریخ جب وزارت مذہبی امور نے حکومت کو بھیجا	موجودہ کیفیت
قانون انسداد عریانی و فحاشی	۱۹۷۸-۱-۲۵	عمل در آمد نہیں ہوا
حدود آرڈی ننسز (۵ عدد)	۱۹۷۹	۱۰-۲-۱۹۷۹ کو قانون بنادیا گیا
زکوۃ و عشر آرڈی ننس	۱۹۷۹-۲-۱۰	۲۰-۶-۱۹۸۰ کو قانون بنادیا گیا
احترام رمضان آرڈی ننس	۱۹۷۹-۸-۱۰	۲۵-۶-۱۹۸۱ کو قانون بنادیا گیا
قانون حق شفع	۱۹۸۰-۸-۵۲	عمل در آمد نہیں ہوا
قانون شہادت	۱۹۸۲-۸-۲۱	عمل در آمد نہیں ہوا
قانون قصاص و دیت	۱۹۸۰-۷-۶	عمل در آمد نہیں ہوا

جنرل سیکشن : رؤیتِ ہلال کا انتظام کرنا، قمری تقویم اپنانے پر غور ، معاشرتی برائیوں کے انسداد اور اسلامی اقدار کے فروغ کے لئے تجاویز پر غور و خوض ، ذرائع ابلاغ کی اصلاح کے لئے تجاویز مرتب کرنا نیز بیرون ملک اسلامی تعلیم کے لئے طلباء کو بھیجنا اس سیکشن کے فرائض میں شامل ہے ۔

وزارت کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وزارت نے اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے آئی ہوئی سفارشات کو عموماً وزارت کی فائلوں میں دبا کر نہیں رکھا بلکہ انہیں وصول کرنے کے بعد متعلقہ اداروں کے پاس بھجوا دیا ہے ۔ اسی لئے ہم نے یہ تاثر قائم کیا ہے کہ نظریاتی کونسل کی سفارشات کے سلسلے میں اس وزارت کا رویہ منفی نہیں بلکہ عمومی طور پر مثبت ہے ۔

انصاری کمیشن

جنرل ضیاء شروع ہی سے یہ کہتے رہے ہیں کہ پاکستان کا نظامِ حکومت مغربی جمہوریت پر مبنی ہے جو غیر اسلامی ہے اور اس رائے کا اظہار بھی کرتے رہے ہیں کہ وہ اس نظام کی جگہ ایک اسلامی نظام لانا چاہتے ہیں چنانچہ ۱۹۸۱ء کے شروع میں انہوں نے کابینہ کے چند ممبران پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کر دی تاکہ وہ اس سلسلے میں مناسب سفارشات پیش کرے ۔ اسی سال جون میں انہوں نے اسلامی نظریاتی کونسل سے کہا کہ وہ بھی اس معاملے پر غور کرے اور انہیں رپورٹ پیش کرے ۔ کونسل نے اپریل ۱۹۸۲ء میں صدر کو یہ رپورٹ پیش کر دی لیکن غالباً صدر کی اس سے تشفی نہیں ہوئی اور انہوں نے رپورٹ کو مزید مفصل اور جامع بنانے کے لئے اسے کونسل کو واپس بھجوا دیا ، کونسل نے نظر ثانی شدہ رپورٹ جون ۸۲ میں صدر کو بھجوا دی ۔

فروری ۱۹۸۳ء میں مجلس شوریٰ کے پانچویں سیشن کا افتتاح کرتے ہوئے صدر نے شوریٰ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ نظامِ حکومت کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے مسئلے پر غور کرے چنانچہ ایک سپیشل کمیٹی اس غرض کے لئے قائم کر دی گئی جس نے جولائی ۱۹۸۳ء میں اپنی سفارشات پیش کر کے مجلسِ شوریٰ سے اس کی منظوری لے لی ۔

تشکیل انصاری کمیشن

جولائی ۱۹۸۳ء میں صدر کے پاس اس موضوع پر مذکورہ بالا تینوں رپورٹیں موجود تھیں لیکن محسوس ہوتا ہے کہ ان رپورٹوں پر بھی وہ مطمئن نہیں تھے کیوں کہ انہوں نے ۱۰ جولائی

۱۹۸۳ء کو جناب مولانا ظفر احمد انصاری کی سربراہی میں ایک دستوری کمیشن تشکیل دیا کہ ان رپورٹوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک جامع رپورٹ ۳۱ جولائی تک تیار کر کے انہیں پیش کریں ، چونکہ ۱۴ اگست کو انہیں قوم سے خطاب کرتے ہوئے اس سلسلے میں اعتماد میں لینا تھا اور غالباً اس غرض سے آئین ۱۹۷۳ء کو تبدیل بھی کرنا تھا اس لئے انہوں نے کمشن سے کہا کہ وہ وہ زیادہ سے زیادہ ۳۱ جولائی تک اپنی رپورٹ پیش کر دے ۔ اس کمیشن میں ممتاز علماء اور اسلامی سکالرز شامل تھے ۔

عید الاضحیٰ کی چھٹیوں کی وجہ سے کمشن ۱۷ جولائی سے کام شروع کر سکا اور ۱۴ اگست تک ۲۵ سیشنوں میں دن رات کام کر کے اس نے اپنی ۱۲۶ صفحے کی رپورٹ صدر صاحب کو پیش کر دی ۔

کمیشن کی سفارشات کا خلاصہ

کمیشن نے مروجہ صدارتی اور پارلیمانی نظاموں کو مسترد کرتے ہوئے ایک ایسے نظام کا خاکہ پیش کیا جس میں مضبوط صدر کے ساتھ مضبوط پارلیمنٹ بھی ہو ، صدر کا انتخاب قومی اور صوبائی اسمبلیاں مل کر کریں، صدر پارلیمنٹ کے فیصلوں کو ماننے کا پابند ہو اور پارلیمنٹ کو توڑ نہ سکے ۔ پارلیمنٹ دو ایوانوں پر مشتمل ہو جس کو غیر جماعتی بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کیا جائے۔ اسمبلی کے ممبران کی اہلیت میں شریعت کا ضروری علم، نظریۂ پاکستان میں پختہ ایمان ، اچھی شہرت کا مسلمان ہونا اور کسی یونیورسٹی یا دینی درسگاہ سے فارغ ہونا ضروری تھا ۔ کمشن نے ایسے غیر جماعتی انتخابات کی سفارش کی جس میں اپنے آپ کو امیدوار بنا کر پیش کرنا یا اپنے لئے کنویسنگ کرنا ناجائز ہوتا ۔

کمیشن نے ایسی عدلیہ کی سفارش کی جس میں ہر عدالت کو بلا استثنا کسی قانون کو غیر اسلامی قرار دینے کی اجازت ہوتی ، ججوں کے لئے ضروری ہوتا کہ وہ شریعت کا ضروری علم رکھیں نیز علماء کو بھی بطور جج اور وکیل کام کرنے کی اجازت ہوتی ۔ کورٹ فیس کو بالکل ختم کر دیا جاتا ۔ کمشن نے یہ سفارش بھی کی کہ قرارداد مقاصد کو بطور دیباچہ رکھنے کی بجائے جزوِ دستور بنا دیا جائے تاکہ اس پر عمل درآمد عدالتی ذریعے سے ہو سکے ۔ اسی طرح کمشن نے ایک نیشنل سیکورٹی کونسل قائم کرنے کی تجویز بھی پیش کی جو غیر معمولی حالات میں ملکی معاملات کنٹرول کر سکے ۔ کونسل نے یہ سفارش بھی کی کہ صوبوں کی تعداد بڑھا دی جائے، آئین ۱۹۷۳ء کی اسلامی شقوں کو بہتر بنایا

جائے اور مندرجہ بالا ساری ترمیمات کو سمونے کے لئے دستور ۱۹۷۳ء میں ترمیم کر دی جائے ۔

سب سے اہم بات یہ کہ کمشن نے بحالیٔ جمہوریت کے لئے ایک ٹائم ٹیبل بھی پیش کیا اور اس پر زور دیا کہ اس کی سفارشات اسی صورت میں اسلامی کہلائیں گی جب انہیں مکمل طور پر اپنایا جائے ۔ جناب صدر نے ۱۲ اگست کو قوم کے نام خطاب میں کمشن کی چند سفارشات کو ہی قابل اعتناء سمجھا اور باقی معاملات میں فیصلہ اپنی سیاسی ضروریات اور دیگر حالات کی بنیاد پر کیا اور بحالی جمہوریت کے لئے کمشن کے ٹائم ٹیبل کا بھی خیال نہ رکھا ۔

تجزیہ

یہ بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک ہی موضوع پر یکے بعد دیگرے چار مختلف ایجنسیوں سے رپورٹیں لینے کی کیا ضرورت تھی اور اس کے لئے پونے تین سال کا عرصہ کیوں درکار تھا جس طرح کمشن سے رپورٹ ایک محدود وقت میں لی گئی اسی طرح باقی اداروں سے بھی جلدی رپورٹیں لی جا سکتی تھیں ۔ نیتوں کی واقف تو بہر حال خدا کی ذات ہی ہے لیکن بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ صدر صاحب اس طرح وقت گزارنا چاہتے تھے اور کئی رپورٹیں بنوانے کا ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے اپنی مرضی کے نکات اخذ کرنے میں آسانی رہے جیسا کہ عملاً ہوا ۔

* * * * * *

اب ہم اختصار کے ساتھ ان اداروں کا ذکر کریں گے جنہوں نے قانون کی اسلامائزیشن کے سلسلے میں مثبت کی بجائے منفی کام زیادہ کیا ہے ۔ یہ ادارے ہیں : مجلس شوریٰ ، لاء کمشن اور وفاقی وزارت قانون

مجلس شوریٰ (وفاقی کونسل)

ضرورت

جنرل ضیاء نے دو دفعہ الیکشن کا اعلان کیا لیکن بوجوہ الیکشن نہ ہو سکے ۔ ان حالات میں گورنمنٹ یہ محسوس کرتی تھی کہ رابطۂ عوام کی کوئی صورت ہونی چاہیئے چنانچہ صدر نے قوم کے نام خطاب میں ۲۴ دسمبر ۱۹۸۱ء کو کہا کہ ہم نے ایک وفاقی کونسل (مجلس شوریٰ) قائم کرنے کا سوچا ہے جو رابطۂ عوام کا کام دے سکے جو پارلیمنٹ یا قومی اسمبلی کے باقاعدہ منتخب ہونے تک اس کے متبادل کے طور پر کام کر سکے (۲۶)۔

وفاقی کونسل کا ڈھانچہ

چنانچہ عبوری دستور میں وفاقی کونسل کے قیام کی گنجائش رکھی گئی (۲۷) اور تفصیلات بعد میں ایک صدارتی حکم کے ذریعے مہیا کی گئیں (۲۸) ۔ ان احکامات کی رو سے کونسل کے ۲۸۸ ممبر نامزد کئے گئے ۔ ۴۲ ارکان کی نامزدگی بعد میں مکمل کی گئی ۔ اس کے علاوہ وفاقی وزراء اور وزرائے مملکت اس کے بربنائے عہدہ ممبر متصور ہوتے تھے ان نامزدگیوں میں علماء مشائخ ، خواتین ، کسانوں، مزدوروں اور اقلیتی نمائندوں کو خصوصی جگہ دی گئی۔ بعد میں اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین اور ارکان کو بھی بربنائے عہدہ وفاقی کونسل کا ممبران بنائے جانے کا اعلان کر دیا گیا ۔ وفاقی کونسل کے چیئرمین کی تقرری صدر کرتا تھا جب کہ ہر سیشن میں کونسل کا چیئرمین چار نائب چیئرمین (چاروں صوبوں سے) نامزد کرنے کا حق رکھتا تھا ۔

کونسل کا دائرہ کار

کونسل صدارتی ریفرنس یا حاضر ممبران کی اکثریت کی رائے کے مطابق ۱۹۷۳ء کے دستور کے آرٹیکل ۱۴۲ اور چوتھے شیڈول میں مذکور حدود کے اندر یا تو کسی نئے قانون کے بنائے جانے کی یا پہلے سے موجود کسی قانون میں تبدیلی کی سفارش کر سکتی تھی ۔ یہ پانچ سالہ منصوبے پر غور

کر سکتی تھی اور اس کے ارکان کو پبلک اکاؤنٹس کمیٹی اور ایسی ہی دوسری کمیٹیوں میں نمائندگی بھی دی جاتی تھی ۔ اسی طرح کونسل بجٹ پر بحث بھی کر سکتی تھی ، اگرچہ ضروری نہیں تھا کہ بجٹ کونسل میں پیش کیا بھی جائے ۔ ممبران کو وہی مراعات حاصل تھیں جو ۱۹۷۳ء کے تحت اس وقت کی قومی اسمبلی کے ممبران کو حاصل تھیں کونسل کا نظام اور داخلی لائحہ عمل بھی اس وقت کی اسمبلی کے ممکن حد تک قریب رہتے ہوئے چلایا جاتا تھا ۔

اسلامائزیشن میں کونسل کا رول

وفاقی کونسل میں ۲۷ سٹینڈنگ کمیٹیاں مختلف امور کے لئے بنائی گئیں ۔ کمیٹی برائے قانون و پارلیمانی امور ۱۰ ممبروں پر مشتمل تھی جن میں سے ۸ پیشہ ور وکلاء ، ایک جاگیردار اور ایک عالم دین تھے ۔ جولائی ۸۴ تک کونسل نے مندرجہ ذیل چار اسلامی قوانین پر غور کر کے انہیں پاس کیا ۔

۱ ۔ قانون قاضی کورٹس

۲ ۔ قانونِ حق شفع

۳ ۔ قانونِ قصاص و دیت

۴ ۔ قانونِ شہادت

مندرجہ ذیل جدول سے پتہ چلتا ہے کہ قوانین کے مسودے کب کونسل کے پاس آئے اور یہ کب پاس ہوئے :

قانون سازی کے سلسلے میں وفاقی کونسل کی کارکردگی

نام مسودہ قانون	تاریخ جس دن بل پیش ہوا	تاریخ جس دن بل پاس ہوا
قاضی کورٹس آرڈیننس	۱۹۸۲-۱-۱۸	۱۹۸۳-۲-۲
قانون حق شفع	۱۹۸۲-۱-۱۸	۱۹۸۲-۰۱-۱۴
قانون شہادت	۱۹۸۲-۱۰-۱۶	۱۹۸۳-۳-۳

ان قوانین کی اسلامی حیثیت اور جس طرح سے یہ پیش ہوئے اور پاس ہوئے اس کی کیفیت جاننے کے لئے ہم صرف قانون قصاص و دیت کے بارے میں کچھ تفصیل عرض کرتے ہیں ۔

قانون قصاص و دیت : صدر مملکت کے کہنے پر اسلامی نظریاتی کونسل نے قصاص و دیت کا مسودۂ قانون اگست ۱۹۷۹ء میں بنانا شروع کیا چنانچہ جولائی ۱۹۸۰ء میں پہلا مسودہ قانون صدر کو پیش کیا گیا ، وہاں سے یہ وزارتِ قانون تک پہنچا جس نے دسمبر ۱۹۸۰ء میں اسے رائے عامہ جاننے کے لئے مشتہر کر دیا، وصول شدہ آراء کی روشنی میں نظرثانی شدہ مسودہ نظریاتی کونسل نے ۱۹۸۱ء میں حکومت کو پیش کیا ، صدر صاحب کے حکم کے مطابق یہ مسودہ قانون جنوری ۱۹۸۲ء میں وفاقی کونسل میں پیش کر دیا گیا ۔ وہاں قانون اور پارلیمانی امور کی کمیٹی نے ۱۸ جنوری ۱۹۸۲ء کو اس پر غور کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ اسے سٹینڈنگ کمیٹی برائے مذہبی اور اقلیتی امور اور خصوصی کمیٹی برائے نفاذ اسلام کو بھیج دیا جائے تاکہ ان کی رائے بھی اس میں شامل ہو جائے ۔ اس سٹینڈنگ کمیٹی نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ وزارت قانون کو یہ مسودہ صوبائی حکومتوں کو بھجوانا چاہئے اور پھر موصولہ جوابات کمیٹی کو پیش کئے جانے چاہئیں ۔ سٹینڈنگ کمیٹی برائے مذہبی و اقلیتی امور نے مسودہ قانون پر غور کر کے اور چند ترامیم تجاویز کرتے ہوئے اپنی رپورٹ ۱۲ اگست ۱۹۸۲ء کو پیش کر دی ۔ خصوصی کمیٹی برائے نفاذِ اسلام نے اپنی رپورٹ ۲۵ جنوری ۱۹۸۵ء کو پیش کی اور اس نے بھی چند ترامیم تجاویز کیں ۔ چونکہ ان دونوں کمیٹیوں کی تجاویز بعض معاملات پر ایک دوسرے سے مختلف تھیں لہٰذا کونسل نے ۴ نومبر ۱۹۸۳ء کو یہ طے کیا کہ ان دونوں رپورٹوں کو ۷ ممبران پر مشتمل ایک سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے ۔ کمیٹی ۳ وکلاء ، دو علماء اور دو خواتین ارکان پر مشتمل تھی ۔ اس کمیٹی نے طویل اجلاس کئے اور بل کے تفصیلی مطالعے کے لئے دو دفعہ کونسل سے تاریخ آگے بڑھوائی اور بالآخر جب ۳ اپریل ۱۹۸۴ء کو اپنی رپورٹ وفاقی کونسل میں پیش کی، تو کمیٹی کے تین ممبران نے (جن میں علماء ممبر بھی شامل تھے) یہ الزام لگایا کہ رپورٹ یک طرفہ اور غیر اسلامی ہے اور یہ کہ ان کے نقطۂ نظر کو اس میں کہیں بھی سمونے کی کوشش نہیں کی گئی ۔ انہوں نے کہا کہ رپورٹ کا آخری مسودہ نہ تو ان کو دکھایا گیا اور نہ ہی اس پر ان کے دستخط لئے گئے ہیں انہوں نے کہا کہ رپورٹ کے مندرجات صرف چیئرمین کے ذاتی نظریات کی عکاسی کرتے ہیں اس لئے رپورٹ کو واپس لیا جائے ۔

اس کمیٹی کی رپورٹ نے نہ صرف نظریاتی کونسل کے مسودے کو نظر انداز کر دیا ۔ بلکہ کونسل کے وجود کے جواز اور کارکردگی پر بھی ناروا حملے کئے اور کچھ یہ تاثر بھی دیا کہ اسلامی قانون عصرِ حاضر میں تطبیق کے لائق نہیں ۔ اس کمیٹی کے تجویز کردہ خاکے کا مطلب تو یہ تھا کہ ایک صدی پہلے کے انگریزی دور کے بنائے گئے پینل کوڈ کو ہی (تقریبا) بر قرار رکھا جائے ۔ اس رپورٹ کے پیش ہونے پر کونسل میں بڑی ردوکد شروع ہو گئی ۔ اور ۳۶ ممبروں نے کہا کہ اگر رپورٹ کو برائے بحث بھی قبول کیا گیا تو وہ کونسل کا بائیکاٹ کر دیں گے ۔ اس پر صدر مملکت کو اس معاملے میں ذاتی دلچسپی لینا پڑی (۲۹) ، بڑی جوڑ توڑ اور کوششوں کے بعد یہ طے ہوکہ ۴۲ ممبروں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جائے جو چاروں مسودوں پر غور کرے (ایک مسودہ نظریاتی کونسل کا اور تین وفاقی کونسل کی مختلف کمیٹیوں کے) ۔ اس کمیٹی کا سربراہ وزیرِ مذہبی امور کو بنایا گیا ۔ یہ کمیٹی کونسل کے سیشن کے دوران اپنی رپورٹ مکمل نہ کر سکی جو ۳۰ اپریل ۱۹۸۴ء کو ختم ہوگیا ۔ کونسل کا اگلا سیشن جولائی ۸۴ میں ہوا جس میں حکومت نے اس کمیٹی کی رپورٹ کو کونسل سے منظور کروالیا ۔

آئین کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کا کام

۵ فروری ۱۹۸۳ء کو صدر مملکت نے وفاقی کونسل کے پانچویں سیشن سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کونسل کے ذمے ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ اسلامی نقطۂ نظر سے پاکستان میں طرزِ حکومت کا جائزہ لے اور اس مسئلے میں حکومت کی رہنمائی کرے چنانچہ رواں سیشن میں اس مقصد کے لئے ایک خصوصی کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے چیئرمین جناب فدا محمد خاں تھے اور جس کے تیس ممبر تھے جن میں ۲ خواتین ، ۷ علماء اور باقی وکلاء اور سیاستدان تھے ۔ اس کمیٹی نے ۲۵ دن کام کیا اور پھر رپورٹ کے مسودے کی تیاری کے لئے ۸ ممبران پر مشتمل ایک سب کمیٹی بنادی ۔ اس کمیٹی نے جو رپورٹ تیار کی اس میں چار ممبران کے اختلافی نوٹ تھے جن میں سے تین علماء تھے ۔ یہ رپورٹ کونسل میں منظور کر لی گئی ۔ اس رپورٹ کے مطابق ۱۹۷۳ء کے آئین کی حدود کے اندر پارلیمانی ڈھانچے کی سفارش کی گئی جس میں بعض عمومی قسم کی اسلامی دفعات بھی تھیں ۔ صدر مملکت نے اپنی ۱۲ اگست ۱۹۸۳ء کی تقریر میں ان میں سے چند ایک تجاویز کو قبول کرتے ہوئے باقی اہم تجاویز کو رد کر دیا ۔

تجزیہ

اوپر ذکر کردہ حقائق سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ وفاقی کونسل نے اسلامائزیشن کے حق میں نہیں بلکہ اس کے خلاف ہی کام کیا ہے اور اسلامی قانون سازی کو بلاوجہ تاخیر کے چکر میں ڈالے رکھا ہے اور اس نے ان قوانین کو دوبارہ غیر اسلامی بنا دیا ہے جنہیں اسلامی نظریاتی کونسل جیسے اداروں نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا ۔

صدر مملکت نے شروع ہی میں یہ واضح کر دیا تھا کہ وفاقی کونسل ایک مشاورتی ادارہ ہوگی ۔ یہ مختلف امور پر بحث کر کے سفارشات اور قراردادیں تو پاس کر سکتی تھی لیکن یہ قانون سازی نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی بجٹ کو رد کر سکتی تھی ۔ اس کے سارے ممبر صدر کے نامزد کردہ تھے اور صرف اس وقت تک ہی ممبر رہ سکتے تھے جب تک انہیں صدر مملکت کی خوشنودی حاصل ہو ۔ ان امور کی بناء پر وفاقی کونسل ایک ایسا ادارہ بن کر رہ گئی جس کی کوئی وقعت و اہمیت نہ ہو اور اس امر کی شکایت ممبران بھی کرتے تھے مثلاً یہ کہ وزراء سنجیدگی سے کونسل میں جواب نہ دیتے تھے یا یہ کہ ایک دفعہ وزیر خزانہ نے بجٹ پریس کانفرنس میں پیش کیا اور جب اس پر کونسل میں بحث شروع ہوئی تو وہ ارکان کا سامنا کرنے کی بجائے تعطیلات منانے چلے گئے ۔

اگرچہ کونسل وسیع تر قومی نمائندگی کی حامل تھی ، پہلی بار کے نامزد ممبران میں سے ٦٥ زمیندار و جاگیردار ، ٣٨ وکلاء ، ٣٥ صنعتکار و تاجر اور ١٥ علماء شامل تھے باقی ارکان سیاستدان ، سوشل ورکر، مزدور لیڈر وغیرہ تھے ۔ علماء کی اتنی تعداد بھی کسی سابقہ اسمبلی میں نہ تھی ۔ جو بات قابل غور ہے وہ یہ کہ ان نامزدگیوں کے وقت بھی ممبران کے لئے اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی معیار مقرر نہیں کیا گیا تھا سوائے عمر اور قومیت کے جیسا کہ عام طور پر جمہوری ملکوں میں ہوتا ہے اور جیسے سابقہ پاکستانی دساتیر میں تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تقریباً انہی سیاسی، صنعتی اور جاگیردار خانوادوں کے لوگ اس کونسل میں پہنچے جو کہ سابقہ اسمبلیوں میں تھے اور جنہیں ملک و ملت کی اکثر سیاہ بختیوں کا ذمہ دار بتایا جاتا ہے ۔ اگرچہ جنرل ضیاء نے دعوی یہی کیا تھا کہ وہ اسمبلی میں قوم کے بہترین لوگوں کو جمع کریں گے لیکن عملاً ایسا نہیں ہو سکا اور وہاں اکثریت کالعدم مسلم لیگ اور کالعدم پیپلز پارٹی کے حواریوں کی تھی ۔

لاء کمشن

یہ تجویز دراصل اسلامی نظریاتی کونسل کی تھی کہ ایک لاء کمشن قائم کیا جائے جو قوانین کی اصلاح و ترقی کا کام مستقل بنیادوں پر کرتا رہے۔ چنانچہ صدر نے ۱۹۷۹ میں ایک ایسا لاء کمشن قائم کر دیا۔

تنظیمی ڈھانچہ

پاکستان کے چیف جسٹس بلحاظ عہدہ کمشن کے چیئرمین ہوتے ہیں لاء کمشن ۱۰ ممبران پر مشتمل ہوتا ہے جنہیں وفاقی حکومت کمشن کے چیئرمین اور وزارت قانون و پارلیمانی امور کے سیکریٹری کی مشاورت سے نامزد کرتی ہے جو خود بھی بلحاظ عہدہ اس کا ممبر ہوتا ہے۔ کمشن کے ارکان عام طور پر ایسے آدمی ہوتے ہیں جو عدالتی یا انتظامی افسر رہے ہوں یا وکیل اور جج ہوں، اسلامی نظریاتی کونسل کے ممبر ہوں یا کسی یونیورسٹی میں قانون کے استاد ہوں، ان ممبران کے علاوہ جو بربنائے عہدہ ممبر ہوتے ہیں عام ممبران تین سال کی مدت کے لئے نامزد کئے جاتے ہیں اگرچہ انہی افراد کی دوبارہ تقرری بھی کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کمشن کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ ایک متعین عرصے کے لئے ریسرچ وغیرہ کے لئے ملازمین بھرتی کر سکے۔ جولائی ۸۴ میں کمشن کے ارکان درج ذیل تھے:

۱۔ جناب جسٹس محمد حلیم، چیف جسٹس آف پاکستان
۲۔ جناب شریف الدین پیرزادہ، وزیر قانون و پارلیمانی امور
۳۔ جناب جسٹس ارشاد حسن خاں، سیکرٹری وزارت قانون و پارلیمانی امور
۴۔ جناب جسٹس ذکاء اللہ لودھی، چیف جسٹس کوئٹہ ہائی کورٹ
۵۔ جناب جسٹس عثمان علی شاہ، چیف جسٹس پشاور ہائی کورٹ
۶۔ جناب جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال، چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ
۷۔ جناب جسٹس عبدالحی قریشی، چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ
۸۔ جناب جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن، چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل
۹۔ جناب جسٹس (ریٹائرڈ) زیڈ ویلیانی کراچی
۱۰۔ جناب شیخ امتیاز علی، وائس چانسلر قائد اعظم یونیورسٹی، اسلام آباد

۱۱ ۔ جناب علی احمد فضیل ، سینئر ایڈوکیٹ
۱۲ ۔ حاجی شیخ عنایت اللہ ، سینئر ایڈوکیٹ

اغراض و مقاصد

لاء کمیشن کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ وہ قوانین کو مستقل طور پر سائنسی بنیادوں پر زیر مطالعہ رکھے اور مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو مطلع کرتا رہے کہ کون سا قانون قابل تنسیخ ہے یا نظر ثانی کا محتاج ہے ۔ اس کمشن کے پیش نظریہ بھی تھا کہ وہ قوانین کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق نظریۂ پاکستان اور اسلام کے تصورِ عدلِ اجتماعی کے مطابق بنانے کے لئے تگ و دو کرے ، حصول انصاف کو فوری اور کم خرچ بنانے کے لئے سادہ اور موثر اصول و ضوابط تشکیل دے اور اس غرض کے لئے نئے قوانین کے اجراء یا زائد از ضرورت قوانین کی تنسیخ یا قابل وحدت قوانین کی یکجائی کے لئے کوشش کرے ۔

کمشن کے اغراض و مقاصد میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ قوانین کی بے قاعدگیوں کو دور کرے ، قانونی نظام کی بہتری کے لئے اصلاحات تجاویز کرے اور مرکزی اور صوبائی قوانین میں اگر کہیں عدم مطابقت ہو تو اس کی نشاندہی کرے ۔ کمشن کے فرائض میں سے یہ بھی تھا کہ وہ قانون کی تعلیم کے نظام کا مطالعہ کرے اور اسے بہتر بنانے کیلئے حکومت کو تجاویز پیش کرے ۔

کوئی مرکزی یا صوبائی حکومت کمشن کے پاس ہر وہ معاملہ اس کی رائے جاننے اور مشاورت کیلئے بھجوا سکتی تھی جو اس کے دائرہ کار میں آتا ہو ۔ جو مسودہ ہائے قوانین نظریاتی کونسل تیار کرتی تھی وہ بھی وفاقی کونسل میں بھجوائے جانے سے پہلے (یا بعد) کمشن کو رائے اور نظر ثانی کے لئے بھجوائے جاتے تھے ۔

اسلامائزیشن میں کمشن کا رول

جیسا کہ ابھی ذکر ہوا کمشن کے مختلف مقاصد میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ قوانین کی اسلامی نظریات سے مطابقت کے بارے میں جائزہ لے لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کمشن اپنے مخصوص تنظیمی ڈھانچے کی بناء پر کس حد تک اس چیز کا اہل تھا جیسا کہ پچھلے کسی موقع پر ہم نے کہا کہ پاکستان میں ججوں اور وکلاء کی تعلیم و تربیت اسلامی قانون کی بجائے برٹش کامن لاء کی بنیادوں پر

ہوئی ہے ۔ چنانچہ جو لوگ اس نظام قانون و عدل کا حصہ ہیں اور ان کی معاشی اور سماجی حیثیت اور کیرئیر اسی سے وابستہ ہیں ان کی اگر یہ خواہش ہے کہ یہی نظام برقرار رہے تو یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے بد قسمتی سے عدالت ہائے عالیہ کے جج اور سینئر وکلاء بھی عمومی طور پر اس معاملے میں کوئی استثنائی حیثیت نہیں رکھتے ۔

ہماری اس رائے کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بنچ اور بار کے ممبر بھی تو آخر مسلمان ہی ہیں اور ان میں سے بعض تو اچھے اور نیک مسلمان ہونے کی شہرت بھی رکھتے ہیں تو آخر یہ کیسے تسلیم کیا جائے کہ وہ اسلامی شریعت کی اساسیات سے باخبر نہیں ہیں اور ایک اسلامی ریاست کے قاضی یا مجتہد کے طور پر کام کرنے کے اہل نہیں ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک عام مسلمان کے لئے تو شریعت کا معمولی علم اور مطالعہ کافی ہے جس سے وہ شریعت کی بنیادی باتوں کو سمجھ لے لیکن اتنا علم اس شخص کے لئے ہرگز کافی نہیں ہے جس نے اجتہاد کرنا ہے اور ایک فنی اور قانونی ماہر کی حیثیت سے قواعد و ضوابط کی تشریح و تفسیر اور تطبیق کرنی ہے ایسے شخص کے لئے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ اس نے طویل عرصے تک مطالعہ و تحقیق کر کے اسلامی قانون میں ژرف نگاہی حاصل کر رکھی ہو اس کے بغیر محض بنیادی معلومات رکھنا یا سرسری واقفیت اسلامی شریعت سے رکھنا کوئی وزن نہیں رکھتا ۔

اب ذرا کمشن کی ہیئت ترکیبی پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیجئے اس کے ممبران کی اکثریت بار اور بنچ سے ہے اور ان کا نقطۂ نظر اور ان کی ذہنی کیفیت وہی ہے جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے ، لے دے کر ایک نظریاتی کونسل کے چیئرمین رہ جاتے ہیں جو کمشن کے جلسوں میں اسلامی نقطۂ نظر کی بھرپور وکالت کرتے تھے لیکن اتنے آدمیوں میں ایک آواز کی کیا حیثیت ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ فیصلے عام طور پر اکثریت کی بنیاد پر ہوتے تھے کمشن کے پاس جو مسودہ ہائے قوانین نظر ثانی کے لئے گئے ان پر کمیشن کی جو کارکردگی سامنے آئی ہے اس پر ایک نظر ڈالنے سے یہی تاثر ابھرتا ہے کہ کمشن موجودہ قانونی ڈھانچے ہی کو برقرار رکھنا چاہتا ہے یا یہ کہ کوئی چھوٹی موٹی تبدیلی تو گوارا کی جا سکتی ہے لیکن موجودہ قانونی نظام کے انہدام کی قیمت پر وہ نیا اسلامی قانونی ڈھانچہ کھڑا کرنے کے حق میں نہیں ہے ، مثال کے طور پر قانون شہادت کو لیجئے جس کا ابتدائی مسودہ نظریاتی کونسل نے تیار کیا تھا اور رائے دہی کے لئے اسے کمشن کے پاس بھیجا گیا تھا ۔ کمشن نے کثرت رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ اس موضوع پر الگ اور نئی قانون سازی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اتنا ہی

کافی ہے کہ انگریز کے بنائے ہوئے ۱۸۹۳ء کے قانون شہادت میں کچھ معمولی تبدیلیاں کر لی جائیں ۔ (۲۱)

علاوہ ازیں بنچ اور بار کے معزز عہدہ داران پبلک میں کھلے عام قاضی کورٹس کی مخالفت کرتے رہے ہیں اور اپنے آپ کو اجتہاد کا اہل ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں یہ اچھی طرح جانتے کے باوجود کہ وہ دینی اور علمی لحاظ سے اس کے اہل نہیں ہیں ۔

اگرچہ کمشن نے دو ریسرچ آفیسروں کا تقرر کیا ہوا ہے جو عربی زبان اور شریعت کا علم رکھتے ہیں تاکہ کمشن کے فاضل ممبران کی متعلقہ مباحث میں مدد کر سکیں ۔ تاہم ظاہر ہے کہ ایسے ریسرچ آفیسرز علمی پہلو سے کمشن کے افسران کی کچھ معاونت تو کر سکتے ہیں لیکن وہ خود سے دقیق مسائل پر نظر ثانی نہیں کر سکتے اور نہ ہی مہمات امور میں کوئی اہم فیصلہ کر سکتے ہیں ۔

وزارتِ قانون و پارلیمانی امور

وزارت قانون و پارلیمانی امور بھی قانون بنانے کے سلسلے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے ۔ اس سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر سے نئی قانون سازی کرنے یا موجودہ قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھالنے میں وزارت کے دو شعبوں ڈرافٹنگ سیکشن (Drafting Section) اور سلاسٹرز ونگ (Solicitor's Wing) کا کردار اہم ہے ۔

ڈرافٹنگ سیکشن

اس سیکشن کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس مواد کو جو مختلف وزارتوں اور محکموں سے وصول ہوتا ہے مناسب قانونی شکل دے ۔ وزارت کے ایک اہم اور ذمہ دار افسر نے دوران اِنٹرویو ہمیں یہ بتایا کہ ان کا کام خالص فنی نوعیت کا ہے اور وہ یوں کہ جو مواد انہیں ملتا ہے وہ قانونی ضرورتوں کے مطابق اس کی نوک پلک سنوار دیتے ہیں اور یہ ان کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ دیکھیں کہ آیا یہ مواد اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے یا نہیں ۔ انہوں نے کہا کہ یہ ذمہ داری یا تو اسلامی نظریاتی کونسل کی ہونی چاہئیے یا پھر ان محکموں اور وزارتوں کی جو یہ مواد ہمیں بھجواتے ہیں انہوں نے کہا جب وہ کسی مسودے کو قانونی شکل دیتے ہیں تو ان کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ دیکھیں کہ اس مسودہ قانون میں کوئی تضاد یا ابہام نہ ہو ۔ وہ پہلے سے موجود قوانین کے خلاف نہ ہو اور سوسائٹی کے سماجی، تعلیمی اور تہذیبی معیار اور ضرورتوں کے مطابق ہو اور عوام کے لئے قابل قبول ہو انہوں نے کہا کہ وزارت کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ مسودہ قانون کی تیاری میں ایسے الفاظ اور اصطلاحات استعمال کی جائیں جو کہ قانون سازوں کے حقیقی منشاء کے عین مطابق ہوں ۔ تاہم انہوں نے یہ تسلیم کیا کہ جو لوگ یہ کام کرتے ہیں وہ اسلامی قانون کے ماہر نہیں ہیں ۔

سلاسٹرز ونگ (Solicitor's Wing)

یہ ونگ ان ترمیمات و تنسیخات کو نمٹاتا ہے جن کے بارے میں وفاقی شرعی عدالت کسی مرکزی یا صوبائی حکومت کو حکم دیتی ہے ۔ اس سلسلے میں سیکشن کے ایک ذمہ دار افسر نے دوران انٹرویو ہمیں بتایا کہ جوں ہی وفاقی شرعی عدالت کی طرف سے کوئی حکم کسی قانون یا قانون کے کسی جزء کے خلافِ اسلام ہونے کے بارے میں ملتا ہے تو ہم متعلقہ وزارت یا محکمہ سے رجوع

کرتے ہیں ۔ اگر اس وزارت یا محکمہ کو اس قانون کی ترمیم و تنسیخ پر کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم اس قانون کی ترمیم و تنسیخ کے لئے ضروری کارروائی کر دیتے ہیں ۔ لیکن اگر متعلقہ محکمہ اس کے خلاف ہو تو ہم پھر یہ کہتے ہیں کہ وہ اس کے متعلق مواد ہمیں بھجوا دے اور ہم اس کی روشنی میں سپریم کورٹ کی شریعت اپیلٹ بنچ میں اپیل دائر کر دیتے ہیں ۔ انہوں نے کہا اس سلسلے میں ہم عموماً بروقت کارروائی کرتے ہیں اور شریعت کورٹ کی دی گئی میعاد کے اندر اندر ہم یا تو متعلقہ قانون کو تبدیل / منسوخ کر دیتے ہیں یا پھر اس کے خلاف اپیل دائر کر دیتے ہیں ۔

تجزیہ

ممکن ہے اس بات میں کچھ وزن ہو کہ یہ وزارت قانون اور پارلیمانی امور کی براہ راست ذمہ داری نہیں ہے کہ اس کے بنائے ہوئے مسودہ ہائے قوانین اسلامی شریعت کے عین مطابق ہوں تاہم اس بات سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا کہ قانون بنانے کے لئے جو مواد مختلف محکمے اس وزارت کو بھجواتے ہیں، اسے قانونی شکل دیتے وقت یہ وزارت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مثلاً یہ وزارت متعلقہ محکمہ سے بات چیت کر کے اس کے بھیجے ہوئے مواد میں اپنے نقطہ نظر سے تبدیلی بھی کرواتی ہے جیسا کہ یہ بات وزارت قانون اور پارلیمانی امور کے ڈرافٹسمین کے اس تبصرے سے ظاہر ہے جو اس نے نظریاتی کونسل کے مسودہ ہائے قوانین برائے قصاص و دیت اور حق شفع کے دیباچے میں دیئے ہیں اور طبع شدہ موجود ہیں ۔

اگر کوئی قانون اس وزارت کے نقطۂ نظر سے تسلی بخش نہ ہو تو مختلف حیلے بہانے سے یہ اس کو موخر کر سکتی ہے یا فائلوں میں دبا سکتی ہے ۔ مثلاً وزارت مذہبی امور نے اس وزارت کو لکھا کہ ایک مسودہ قانون بنایا جائے جس کی رو سے قادیانیوں کو قرآن کا ترجمہ چھاپنے سے منع کیا جائے۔ وزارتِ قانون نے جواب میں وزرات مذہبی امور کو لکھا کہ قادیانیوں کا ذکر کئے بغیر اس قسم کا قانون بنانا نامناسب ہو گا ۔ وزراتِ مذہبی امور نے اس کا مناسب جواب دے دیا ۔ اس پر وزارت قانون نے لکھا کہ اس سلسلے میں آخری فیصلہ کرنے سے پہلے دیگر مسلم ممالک کے قوانین کو بھی پیش نظر رکھا جائے ۔ وزارت مذہبی امور نے وزارت قانون کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ایک مقامی مسئلہ ہے اور دیگر مسلم ممالک کو پاکستان کی طرح قادیانی مسئلے کا سامنا نہیں ہے لیکن وزارت قانون نے اپنی رائے پر اصرار کیا چنانچہ یہ مسئلہ پچھلے طویل عرصہ سے تعطل کا شکار ہے ۔

کسی نئے مسودہ ہائے قانون کی تیاری ایک اہم اور نازک مسئلہ ہے ۔ اگر ڈرافٹسمین اسلامی قانون کا ماہر نہ ہو تو محض ایک شوشہ کی کمی بیشی سے پورے مسودہ قانون کا ستیاناس ہو سکتا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ جو لوگ اسلامی نقطۂ نظر سے مسودہ قانون بنائیں وہ مروج قانون کے ساتھ ساتھ اسلامی شریعت کا بھی گہرا علم رکھتے ہوں ۔

اس سلسلے میں ہم یہ تجویز پیش کرنا چاہیں گے کہ جب تک پاکستان میں قانون کی تعلیم کو ایسی بنیاد پر استوار نہیں کیا جاتا کہ ہمارے لاء کالجوں سے ایسے افراد تیار ہو کر نکلیں جو اسلامی اور متداول قانون دونوں میں ماہر ہوں اس وقت تک وزارت قانون میں ہمہ وقتی اسلامی قانون کے ماہرین کو بطور مشیر تعین کیا جائے اور سارے مسودہ ہائے قوانین ان کے مشورے سے مرتب کئے جائیں ۔

قانون کی اسلامائزیشن سے متعلق اداروں اور ان کی کارکردگی پر ایک مجموعی تبصرہ

پچھلے صفحات میں ہم نے تفصیل سے ان اداروں کا ذکر کیا ہے جو موجودہ قوانین اور آئین کو اسلام کے مطابق ڈھالنے اور نئی اسلامی قانون سازی کے لئے بنائے گئے تھے ۔ ان سب کے ذکر کے بعد اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ اس سارے کام پر ایک مجموعی تجزیاتی نظر ڈال سکیں ۔

بنیادی طور پر یہ بات قرارداد مقاصد میں طے کر دی گئی تھی کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہو گا اور یہ کہ ریاستی قوت کا استعمال ملک کے منتخب نمائندوں کے ذریعے اور اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر ہو گا ۔ اس قرارداد میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر ان اصولوں اور مطالبات کی روشنی میں جو قرآن و سنت میں مذکور ہیں مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اچھے مسلمانوں کی حیثیت سے زندگی گزار سکیں ۔

اس قرارداد مقاصد کی روشنی میں ملک کا دستور بنانے والوں کا یہ فرض تھا کہ وہ اس قرارداد کو جزو آئین بناتے اور ایسے ادارے وجود میں لاتے جو اس قرارداد میں مذکور مقاصد کو بروئے کار لا سکتے ۔ بد قسمتی سے یہ نہیں کیا گیا ماضی میں جتنے بھی آئین بنے ان میں قرارداد مقاصد کو محض ایک دیباچے کے طور پر رکھا گیا جس پر عدالتی چارہ جوئی نہیں ہو سکتی تھی اس طرح سوسائٹی اور قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے لئے اول تو ادارے قائم ہی نہ کئے گئے اور جو تھوڑا بہت

کام ہوا وہ بھی بے دلی سے کیا گیا نتیجہ یہ کہ اس کا کوئی نتیجہ نہ نکل سکا ۔

۱۹۵۶ء کے دستور میں ایک اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ اور قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایک کمشن کے قیام کا ذکر تھا ۔ یہ آئین تقریباً ۲ سال تک نافذ رہا لیکن یہ دونوں ادارے قائم نہ کئے گئے ۔ اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی ابتداء ۱۹۶۰ء میں ہوئی جبکہ اسلامی مشاورتی کونسل ۱۹۶۲ء کے دستور کے تحت قائم کی گئی ۔ وزارت مذہبی امور کا قیام ۱۹۷۵ء میں عمل آیا ۔ یہ سب ادارے ۱۹۷۷ء سے پہلے موجود تھے لیکن ان کی کوئی خاص کارکردگی نہ تھی ۔

کیونکہ ماضی کی حکومتیں اسلامی قوانین کے حق میں مخلص اور پر جوش نہ تھیں ۔ تاہم جنرل ضیاء کے دور میں ان کو ترقی دی گئی اور انہیں فعال بنایا گیا ۔ ان اداروں کی ماضی اور حال کی کارکردگی کے جو اعداد و شمار ہم نے دیئے ہیں اس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان اداروں نے کتنا کام کیا ہے ۔

اس غرض کے لئے جو دیگر ادارے جنرل ضیاء کے دور حکومت میں قائم کئے گئے ان میں وفاقی شرعی عدالت، مجلس شوریٰ، اسلامی یونیورسٹی اور لاء کمیشن شامل ہیں ان میں سے بعض اداروں کا دائرہ کار وسیع ہے لیکن ہم نے اپنے کام کو ان کے اسی رول تک محدود رکھا ہے جس کا تعلق قانون کی اسلامائیزیشن سے ہے ۔

ان اداروں کے ڈھانچے اور کارکردگی پر ایک نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان اداروں نے اسلامی نقطہ نظر سے قانون سازی کے سلسلے میں کافی کام کیا ہے ۔ بعض عدالتوں کو پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ غیر اسلامی قوانین کو ختم کرسکیں ۔ اسی طرح اسلام آباد کی اسلامی یونیورسٹی پاکستان میں اپنی نوعیت کی پہلی یونیورسٹی ہے جس کے پیش نظر ایسے افراد تیار کرنا ہے جو اسلامائیزیشن کے عمل کو آگے بڑھا سکیں ۔ اسی طرح مجلس شوریٰ میں ۱۵ علماء دین تھے جبکہ پاکستان کی کسی بھی قانون ساز اسمبلی میں اتنے علماء نہ تھے ۔

ظاہر ہے کہ ان اداروں کی غیر موجودگی میں کوئی بڑا کام نہ کیا جاسکتا تھا ۔ لہٰذا ضیاء حکومت کو یہ کریڈٹ تو بہرحال جاتا ہے کہ اس نے قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے پہلے سے موجود اداروں کو ترقی دی اور نئے ادارے قائم کئے تاہم اس بات سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا ... قانون کی اسلامائزیشن کے اس سارے عمل نے

پاکستانی معاشرے پر کوئی مثبت اثر نہیں چھوڑا ۔ اس کی متعدد وجوہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس غرض کے لئے مناسب اور ضروری ادارے قائم نہیں کئے گئے اور نہ ہی انہیں صحیح طریقے سے کام کرنے کا موقع دیا گیا ہے ۔ مثال کے طور پر اسلامی نظریاتی کونسل کو اپنی رپورٹیں شائع کرنے کی اجازت نہیں دی گئی ، اسکی اکثر سفارشات پر عمل درآمد نہیں کیا گیا اور اس کا رول ابھی تک مشاورتی ہے حالانکہ اسے ایک مارشل لاء آرڈر کے ذریعے بدلا جا سکتا تھا ۔ اسی طرح وفاقی شرعی عدالت کا دائرہ کار محدود رکھا گیا اور اس میں آئین ، شخصی قوانین ، عدالتی طریق کار اور مالیاتی قونین کو شامل نہیں کیا گیا ۔ اس کے فیصلوں کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے انصاف میں کافی تاخیر ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ عدالت مظلوم کی عملی مدد بھی نہیں کر سکتی ۔

کچھ ایسا ہی معاملہ مجلس شوریٰ کا ہے کہ اگرچہ اس میں علماء موجودہ ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اکثریت ان مخصوص اغراض کے حامل طبقوں کی ہے (مثلاً جاگیردار، سرمایہ دار، صنعت کار وغیرہ) جنہوں نے قانون کی اسلامائزیشن کے سلسلے میں علماء کو کوئی خاص کام کرنے نہیں دیا اس کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رہے کہ مجلس شوریٰ درحقیقت قانون ساز مجلس نہیں بلکہ صدر کے پاس کرنے کے لئے محض قانون بنانے کی سفارش کر سکتی تھی ، اس کے باوجود کہ مجلس شوری کے سارے ممبران صدر مملکت نے اپنی مرضی سے چنے تھے ۔ اسی طرح لاء کمیشن قائم کیا گیا لیکن اس کے ارکان کی اکثریت عدالتی افسران پر مشتمل ہے جو انگریزی قانون کے تو ماہر ہیں لیکن قانون کی اسلامائزیشن کے نہ تو وہ زیادہ اہل ہیں اور نہ ہی اس کے پرجوش حامی ہیں ۔ اسی طرح اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ورنہ وہ خاصا بہتر رول ادا کر سکتا تھا ۔

مندرجہ بالا وجوہ کی بناء پر قانون کی اسلامائزیشن میں مصروف یہ ادارے کوئی ایسا بڑا کام نہیں کر سکے جس کے مثبت اثرات سوسائٹی پر نمایاں ہوں ۔

مبحث دوم: قانون کی اسلامائزیشن کے کام کا تجزیاتی مطالعہ

قانون کی اسلامائزیشن میں مشغول اداروں کی کارکردگی پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اب ہم اسلامائزیشن کے عمل کے لئے ضیاء حکومت کے وضع کردہ نظام اور طریق کار کا ایک تجزیاتی مطالعہ کریں گے اور اس مطالعہ میں مندرجہ ذیل نکات کو پیش نظر رکھیں گے ۔

۱- کارکردگی کا احتسابی پہلو
۲- سیاسی عدم استحکام کے اثرات
۳- مارشل لاء کی شریعت پر بالادستی
۴- بیوروکریسی کا رول
۵- کوششوں میں ہم آہنگی کا فقدان
۶- فرقہ وارانہ چپقلشیں
۷- پبلک اور دینی جماعتوں کا عدم تعاون
۸- سست روی
۹- قوانین کی اسلامائزیشن کے اثرات

اس تبصرے کے بعد ہم اس پوزیشن میں ہوں گے کہ ان صحیح خطوط کی نشان دہی کر سکیں جن پر چلتے ہوئے یہ کام مؤثر انداز میں کیا جا سکتا تھا۔

کارکردگی کا احتسابی پہلو

قوانین کی اسلامائزیشن کے کام کا وقتاً فوقتاً جائزہ لینے کے سلسلے میں ضیاء حکومت نے جو اقدامات کئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

علماء کنونشن ۱۹۸۰ء

صدر ضیاء کی تجویز پر دو روزہ علماء کنونشن ۲۱/۲۲ اگست ۱۹۸۰ء کو اسلام آباد میں ہوا جس میں مختلف مکتبہ ہائے فکر کے ۱۰۶ علماء شریک ہوئے ۔ کنونشن کا مقصد یہ تھا کہ ان اقدامات کا جائزہ لیا جائے جو حکومت نے اسلامائزیشن کے سلسلے میں کئے ہیں اور اسے بہتر انداز میں کرنے کے لئے تجاویز پر غور کیا جائے ۔ اس کنونشن کے انعقاد میں یہ بات بھی پیش نظر تھی کہ اس کام میں علماء کے رول کی اہمیت کے پیش نظر ان کا تعاون حاصل کیا جا سکے ۔

جناب صدر نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ "میں نے اسلامائزیشن کے سلسلے میں کئی اقدامات کئے ہیں لیکن میرا احساس یہ رہا ہے کہ علماء اس کام میں پوری طرح شریک نہیں ہیں ۔ آپ نے اسلام کی بہت خدمت کی ہے ۔ تحریکِ پاکستان اور تحریکِ نظام مصطفیٰ میں آپ کا کردار بہت عظیم رہا ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ آگے آئیں اور ملک میں شریعت کے نفاذ کے کام میں میری مدد کریں" (۲۲) ۔

صدر نے علماء سے گزارش کی کہ وہ حکومت کے پہلے سے کئے گئے اقدامات (خصوصاً زکوٰۃ و عشر کے نفاذ) کو مؤثر بنانے کے لئے اور فرقہ وارانہ اختلافات کو کم کرنے کے لئے مؤثر تجاویز دیں تاکہ یہ امور شریعت کے نفاذ میں رکاوٹ نہ بنیں ۔ دو دن کی بحث کے بعد کنونشن نے متفقہ طور پر ایک پندرہ نکاتی چارٹر پاس کیا جو یہ ہے:

۱ ۔ ملکی نظامِ تعلیم کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے لئے اس میں انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں اور یہ کام ایک ایسے بورڈ کی نگرانی میں کیا جائے جس میں علماء بھی شامل ہوں ۔

۲۔ خواتین یونیورسٹی فوراً قائم کی جائے ۔

۳ ۔ ذرائع ابلاغ سے عریانی اور فحاشی ختم کی جائے اور انہیں ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی کے زیر نگرانی چلایا جائے جس میں اسلامی ذہن رکھنے والے لوگ شامل ہوں اور انہیں اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور معاشرے کی اخلاقی بہتری کے لئے استعمال کیا جائے ۔

۴ ۔ موجودہ قانونی نظام کو فی الفور ختم کیا جائے تاکہ انصاف تک عام آدمی کی رسائی ہو سکے ۔

۵ ۔ سرکاری حکام اور ملازمین کو یہ ہدایت کی جائے کہ وہ سادگی اختیار کریں اور تعیشات سے پرہیز کریں ۔ سرکاری ملازمین کے لئے سادہ قومی لباس مقرر کیا جائے ۔

۶۔ رشوت کو ختم کرنے کے لئے سخت ترین انتظامات کئے جائیں۔

۸ ۔ سرکاری ملازمین کی خفیہ رپورٹیں مرتب کرتے وقت اسلامی اقدار سے ان کی وابستگی اور عمل کو بھی پیش نظر رکھا جائے ۔ صرف انہی لوگوں کو گورنمنٹ سروس اور اہم عہدوں پر لیا جائے جو اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے ہوں ۔

۹ ۔ حدود کے لئے الگ اسلامی عدالتیں بنائی جائیں جن میں علماء کو جج مقرر کیا جائے ۔

۱۰ ۔ وفاقی شرعی عدالت میں صرف انہیں لوگوں کو جج مقرر کیا جائے جن کی دیانت ، تقویٰ اور شرعی علوم میں مہارت عام طور پر معروف ہو ۔ علماء کو بھی اس عدالت کا جج مقرر کیا جائے ۔

۱۱ ۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی ساری رپورٹیں پبلک کی اطلاع کے لئے شائع کی جائیں اور اس کی سفارشات پر عمل کیا جائے ۔

۱۲ ۔ جتنی جلدی ممکن ہو ملکی معیشت سے سود کا عمل دخل ختم کر دیا جائے ۔

۱۳ ۔ زکوٰۃ اور عشر آرڈیننس میں اسلامی تعلیمات کے مطابق تبدیلیاں کی جائیں ۔

۱۴ ۔ قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا کام تیز تر کیا جائے ۔

۱۵ ۔ اسلامائزیشن کے پروگرام کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے اور اس کمیٹی میں ان لوگوں کو شامل کیا جائے جو کام کے لئے مخلص اور پر جوش ہوں ۔

صدر مملکت نے اپنی اختتامی تقریر میں ان میں سے بعض سفارشات کو منظور کرتے ہوئے کہا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کو اپنی رپورٹیں شائع کرنے کی اجازت دے دی جائے گی ،

رسالت مآبؐ ، صحابہ کرامؓ اور اہل بیت کے احترام کے لئے قانون بنایا جائے گا ، نیز علماء کو اسلامی یونیورسٹی میں بطور اساتذہ تعینات کیا جائے گا اور صوبائی کونسلوں میں بھی ان کو شامل کیا جائے گا ۔ صدر مملکت نے علماء کی سفارشات پر عمل درآمد کے لئے چھ کمیٹیاں بنانے کا اعلان کیا ۔ جن میں تعلیمی کمیٹی ، کمیٹی برائے ذرائع ابلاغ و تبلیغ ، اسلامائزیشن کے عمل کو تیز کرنے کی کمیٹی ، مالیاتی کمیٹی ، کمیٹی برائے قانون و سماجی بہبود اور کمیٹی برائے مساجد شامل تھیں ۔ انہوں نے کہا کہ ان کمیٹیوں کو ۲ ماہ کے اندر اپنی رپورٹیں پیش کر دینی چاہئیں ، چھ علماء پر مشتمل ایک کنوینگ کمیٹی قائم کی گئی جس کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ ان کمیٹیوں کے تنظیمی ڈھانچے اور کارکردگی پر نظر رکھے ۔ وزارت مذہبی امور کے سکرٹری کو اس کمیٹی کا سکریٹری بنایا گیا ۔

جناب صدر نے یہ بھی اعلان کیا کہ ۱۵ مشہور علماء پر مشتمل ایک علماء بورڈ دو ماہ میں کم از کم ایک میٹنگ کرے گا اور چھ کمیٹیوں کی رپورٹوں کو عمل درآمد کے نقطۂ نظر سے تیار کرے گا ، اور یہی بورڈ صدر کے لئے مشاورتی خدمات بھی انجام دے گا ۔

مشائخ کانفرنس

علماء کانفرنس کے ایک ماہ بعد ۲۲ ستمبر ۱۹۸۰ء کو اسلام آباد ہی میں ایک مشائخ کانفرنس ہوئی جس میں ۱۱۶ مشائخ نے حصہ لیا ۔ صدر نے مشائخ سے درخواست کی وہ ملک میں اسلامائزیشن کے عمل کا جائزہ لیں اور اس غرض کے لئے پہلے سے کئے گئے اقدامات کو مؤثر بنانے کے لئے سفارشات پیش کریں ۔ صدر نے ان سے یہ بھی درخواست کی کہ وہ فرقہ وارانہ کشیدگی کے خاتمے ، ملی یکجہتی اور معاشرے کو اسلامی رنگ میں رنگنے کے لئے بھی اپنی سفارشات پیش کریں (۲۴) ۔ پچیس مشائخ نے تقاریر کیں اور متعلقہ مسائل پر روشنی ڈالی انہوں نے شریعت اسلامی کے نفاذ کے لئے تجاویز بھی پیش کیں ایک متفقہ طور پر پاس کی گئی قرارداد میں مشائخ نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ اسلامائزیشن کے عمل کو تیز کیا جائے ، تعلیمی نظام کو اسلام کے مطابق ڈھالا جائے اور نوجوانوں کو لازمی فوجی تربیت دی جائے ۔

صدر مملکت نے جو بنفس نفیس یہ ساری تقریریں سن رہے تھے ، مشائخ کا شکریہ ادا کیا اور اپنی اختتامی تقریر میں کہا کہ وہ اکیلے پاکستان میں شریعت نافذ نہیں کر سکتے ۔ انہوں نے

علماء اور مشائخ سے گزارش کی کہ وہ آج بھی معاشرے کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کی اسی طرح کوشش کریں جس طرح انہوں نے قیام پاکستان کے لئے جدوجہد کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ان کی حکومت مشائخ کانفرنس میں پیش کردہ تجاویز پر عمل کرنے کی پوری کوشش کرے گی اور یہ بھی کہا کہ وہ اس امر پہ بھی غور کر رہے ہیں کہ پچھلے ماہ کی علماء کانفرنس میں قائم کئے گئے علماء بورڈ کی طرز پر ایک مشائخ بورڈ بھی قائم کر دیا جائے۔

اسلامائزیشن کانفرنس

۲۶ جنوری ۱۹۸۳ء کو صدر نے اکنامک کمشن ہال میں ایک اسلامائزیشن کانفرنس منعقد کی جو ۱۰ گھنٹے تک جاری رہی۔ اس میں ان سب لوگوں کو بلایا گیا جو کسی بھی طرح اسلامائزیشن کے کام سے متعلق تھے تاکہ وہ اکٹھے بیٹھ کر، رو در رو، اسلامائزیشن کے مسائل پر بحث کر سکیں اور پیش آمدہ مشکلات کا حل ڈھونڈھ سکیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل، لاء کمیشن، مجلس شوریٰ، وفاقی شرعی عدالت اور اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نمائندے موجود تھے۔ ابلاغ عامہ، مذہبی امور، قانون، تعلیم، ہیلتھ اور وزارت داخلہ کے وزراء اور ان وزارتوں کے سکرٹری بھی موجود تھے۔ صدر نے خود اس کانفرنس کی صدارت کی۔

پہلے سیشن میں ایک عمومی بحث کے بعد اسلامائزیشن کے پروسیس کو تیز کرنے کے لئے مندرجہ ذیل نکات پر بحث ہوئی جو اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے تیار کئے گئے تھے (۲۵)

۱۔ گورنمنٹ کو اسلامائزیشن کے معاملے پر نظر ثانی کرنی چاہئے اور از سر نو ترجیحات کا تعین کرنا چاہئے۔

۲۔ اعلیٰ سرکاری ملازمین کا طریقِ تقرری اور نظامِ تربیت ایسا ہو کہ وہ اسلامائزیشن کا کام دلجمعی اور لگن سے کریں۔

۳۔ جون ۱۹۸۳ء تک مروجہ انگریزی قوانین کو بدل کر شرعی قوانین نافذ کر دیئے جائیں (باستثناء مالیاتی قوانین)۔

۴۔ جون ۱۹۸۴ء تک مالیاتی قوانین بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق تبدیل کر دیئے جائیں سوائے ان امور کے جن میں بیرونی ممالک سے لین دین ہو۔

۵۔ وفاقی کونسل کو چاہئیے کہ نظریاتی کونسل کے تیار کردہ قانونی مسودہ جات پر کوئی آخری فیصلہ کرنے سے پہلے اس سے رابطہ قائم کرے۔

۶ ۔ مختلف اداروں نے جو سفارشات اسلامائزیشن کے لئے پیش کی ہیں ان سب پر بلاتاخیر عمل کیا جائے اور ان اقدامات کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے مختلف اقدامات کئے جائیں ۔

۷۔ اسلامائزیشن کے عمل کے جائزے کا مستقل انتظام ہونا چاہئے اور منسلکہ محکموں اور وزارتوں کو باقاعدہ رپورٹیں بھجوانی چاہئیں ۔

۸ ۔ مختلف مذہبی مسالک کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے اقدامات کئے جائیں ۔

۹ ۔ اہم سرکاری محکموں اور شعبوں میں سرکاری ملازمین کی تقرری کے وقت امیدواروں کے اسلامی اور اخلاقی معیار کو بھی پیش نظر رکھا جائے ۔

۱۰ ۔ اسلامائزیشن کے کام کی نگرانی وزارت مذہبی امور کے سپرد کی جائے اور دوسری وزارتیں اس غرض کے لئے اس وزارت سے تعاون کریں ۔

۱۱۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹیں شائع کی جائیں تاکہ عام لوگوں کو اس شعبے میں حکومت کی اچھی کارکردگی کا اندازہ ہوسکے ۔

۱۲ ۔ اردو زبان کو سرکاری شعبوں میں رائج کیا جائے ۔

۱۳ ۔ ملکی معیشت سے سود کا عمل دخل بالکل ختم کیا جائے ۔

صدر مملکت نے اس کانفرنس کو سمیٹتے ہوئے مختلف وزارتوں کو یہ ہدایت دی کہ وہ اپنی وزارتوں سے متعلق امور کو نوٹ کریں اور اس کے لئے ضروری اقدامات کریں ۔ صدر مملکت نے یہ وعدہ بھی کیا کہ ایک مستقل کمیٹی بنائی جائے گی جو اسلامائزیشن کے کام کی نگرانی کرے گی ۔ اور یہ کمیٹی ایک ماہ کے اندر کام شروع کر دے گی ۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگلے دو ماہ میں قاضی عدالتیں کام کرنا شروع کر دیں گی اور یہ کہ اس سلسلے میں عدالتی اور پولیس افسران کی ٹریننگ کا کام اسلامی یونیورسٹی کے علاوہ بھی شروع کر دیا جائے گا ۔

دوسرا علماء کنونشن ۱۹۸۴ء

ایک اور علماء کنونشن ۴ ، ۵ جنوری ۱۹۸۴ء کو اسلام آباد میں ہوا جس میں ۱۴۰ علماء اور اسلامی سکالرز نے حصہ لیا ۔ صدر مملکت نے اپنی افتتاحی تقریر میں اسلامائزیشن کے سلسلے میں حکومت کی مشکلات کا ذکر کیا اور مندوبین سے درخواست کی کہ وہ مندرجہ ذیل چار نکات پر اپنی توجہ مرکوز کریں ۔

۱ ۔ اسلامائزیشن کے کام میں رکاوٹوں کو کیسے دور کیا جائے ؟
۲ ۔ ملک کے اندر مختلف مذہبی مسالک کے اندر ہم آہنگی کیسے بڑھائی جائے ؟
۳ ۔ عصری مشکلات سے عہد برآ ہونے کے لئے اجتہاد کے ادارے سے کیسے مستفید ہوا جائے ؟
۴ ۔ اسلامی احکام کی روشنی میں عشر کی مد میں وصول ہونے والی رقوم کو عوامی بہبود کے لئے کیسے خرچ کیا جائے ؟

افتتاحی تقریب کے بعد مندوبین کو چار کمیٹیوں میں تقسیم کیا گیا ۔ دوسرے دن ہر کمیٹی میں سے دو ممبران نے رپورٹیں پیش کیں یاد رہے کہ ہر کمیٹی کا صدر صوبائی وزیر مذہبی امور تھا ۔ ہم اپنے موضوع سے متعلق ہونے کی بناء پر صرف اسلامائزیشن اور اجتہاد کمیٹی کی سفارشات کا خلاصہ ذیل میں درج کر رہے ہیں ۔

اسلامائزیشن کمیٹی کی سفارشات (۲۶)

یہ کمیٹی ۷۵ مندوبین پر مشتمل تھی اس نے طویل بحث کے بعد مندرجہ ذیل سفارشات پیش کیں :

اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹوں کو شائع کیا جائے اور ان عمل کیا جائے ۔ اس وقت اسلامائزیشن کا کام غیر مناسب ہاتھوں کے ذریعے ہو رہا ہے ان لوگوں کے ذریعے جو یا تو سرے سے اس میں یقین ہی نہیں رکھتے یا کم از اس سلسلے میں پر جوش اور فعال نہیں ہیں اس کی بجائے یہ کام ان لوگوں سے لیا جائے جو اس کے اہل ہیں ۔ وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کے دائرہ کار پر لگائی گئی پابندیوں کو ختم کیا جائے اور انہیں بلاامتیاز سب قوانین کو اسلام کی کسوٹی پر پرکھنے کی اجازت دی جائے ۔

مسلم فیملی لاز آرڈیننس ۱۹۶۱ء کو ختم کیا جائے کیونکہ یہ ہمارے قانونی نظام پر بدنما داغ ہے ۔ اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت نے موجودہ قوانین میں جو ترامیم تجاویز کی ہیں ان پر فی الفور عمل درآمد کروایا جائے ۔ اسلامی تعلیمات پر مبنی نئے قوانین بنائے جائیں کیونکہ موجودہ قوانین میں معمولی کتر بیونت سے اصل غرض پوری نہ ہوگی ۔

اسلام آباد کی اسلامی یونیورسٹی صحیح رخ میں ایک قدم ہے تاہم یہ یونیورسٹی سارے ملک

کی ضروریات پوری نہیں کر سکتی لہذا ہر صوبائی دارالحکومت میں شریعت کالج قائم کئے جائیں جن میں علماءؒ کو استاد مقرر کیا جائے ۔ موجودہ نظام تعلیم کو اسلامی ضروریات کے مطابق ڈھالنا بھی ناگزیر ہے مزید وقت ضائع کئے بغیر اس سلسلے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پر عمل درآمد کیا جائے ۔

ارتداد کے خلاف نئی قانون سازی کی جائے ۔ اسلامائزیشن کے پروگرام کی نگرانی کے لئے ایک ایسے ادارے کا قائم کیا جانا ضروری ہے جو صدر مملکت کو جوابدہ ہو اور متعلقہ وزارتوں کو ضروری ہدایات جاری کر سکے ۔

سود کو ملکی معیشت میں سے فی الفور ختم کر دیا جائے اس سلسلے میں اہم اور فوری تبدیلیوں کی ضرورت ہے کیونکہ نیم دلانہ اقدامات بے اثر ثابت ہوئے ہیں ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے ایک ادارہ قائم کیا جائے ۔ ذرائع ابلاغ کے کردار کو بہتر بنانے کے لئے مزید اصلاحات کی ضرورت ہے ۔

زندگی کے ہر شعبہ میں سادگی کو رواج دیا جائے ، تمام سرکاری تقریبات میں غیر ضروری سجاوٹوں اور روشنیوں کو ترک کر دیا جائے ۔

اجتہاد کمیٹی کی سفارشات (۲۰)

اس کمیٹی میں ۲۷ علماء اور سکالرز شامل تھے جن کی سفارشات کا خلاصہ یہ ہے : اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہے ۔ شریعت اور فقہاء کے کام کی روشنی میں آج بھی اجتہاد کیا جاسکتا ہے اس غرض کے لئے ایک بورڈ قائم کیا جائے جس میں مشہور سکالر اور علماء ہوں اس بورڈ کے ممبران کو قرآن اور سنت کا ماہرانہ علم حاصل ہونا چاہئے جبکہ وہ اپنے تقویٰ اور نیک نامی میں بھی معروف ہوں ۔ آزادانہ رائے زنی اجتہاد نہیں تحریف ہے ۔ جو امور قرآن و سنت میں قطعی طور پر بیان ہو چکے ہیں وہاں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ۔ حکومت کو ملک میں اس قسم کے انحراف کی حوصلہ شکنی کرنی چاہئے ۔

اسلامی یونیورسٹی اور پرائیویٹ دینی مدارس میں قرآن و سنت ، فقہ اور مذاہب کے مابین تقابلی مطالعے کے لئے الگ شعبہ جات کھولے جانے چاہئیں تاکہ اجتہاد کرنے کے لئے مناسب لوگ میسر آسکیں ۔ بین المذاہب تقابلی مطالعہ کو متعلقہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لازمی قرار دیا جائے ۔

اسلامی نظریاتی کونسل میں علماء کی تعداد بڑھائی جائے تاکہ وہ تیزی سے فیصلے کر سکے ۔ اس کونسل کی سفارشات کو شائع کیا جائے ۔ ایک کمیٹی بنائی جائے جو ان موضوعات کو مرتب کرے جن میں نئے اجتہاد کی ضرورت ہے اس طرح کی لسٹ کو علماء اور سکالرز کے پاس بھیجا جائے تاکہ وہ اپنی سفارشات پیش کر سکیں ۔ ان سفارشات کو اسلامی نظریاتی کونسل کے پاس بھیجا جائے تاکہ وہ اس پر ضروری کاروائی کر سکے ۔

پرائیویٹ دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلیاں لائی جائیں تاکہ اس سے فارغ التحصیل ہونے والوں کو عصری ضروریات اور مختلف علوم و فنون میں مکمل معلومات حاصل ہوں تاکہ وہ شریعت کی روشنی میں پیش آمدہ مسائل کو اچھے طریقے سے حل کر سکیں ۔

اسلامی فقہ اور اصول فقہ میں ریسرچ کے لئے ایک الگ اکیڈمی قائم کی جائے ۔ ایک اور اکیڈمی ایسی ہونی چاہئے جس میں ساری مسلم دنیا کے علماء ہوں تاکہ پیش آمدہ مسائل کے حل پیش کئے جاسکیں ۔ علماء کو موجودہ حکومت کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے تاکہ وہ شریعت کے نفاذ میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کر سکے ۔

ان کانفرنسوں اور کنونشنوں کے علاوہ بھی متعدد صحافیوں اور سکالروں نے اسلامائزیشن کے کام کی نگرانی کے لئے کئی تجاویز مختلف مواقع پر پیش کیں ۔ مثال کے طور پر پشاور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ، (ریٹائرڈ) جناب عبدالحکیم خان نے یہ تجویز پیش کی کہ سارے ملک کے علماء اور دینی و سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں پر مشتمل ایک سالانہ کانفرنس ہونی چاہئے تاکہ سال بھر میں کئے گئے کام کا جائزہ لیا جائے اور آئندہ کے لئے پلاننگ کی جائے ۔ معروف صحافی جناب الطاف حسن قریشی نے فروری ۱۹۸۴ء میں یہ تجویز پیش کی کہ اسلامائزیشن کے سلسلے میں ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی بنائی جائے جو اس کام کا جائزہ لیتی رہے اور مستقبل کے لئے پلاننگ کرتی رہے ۔ اس کمیٹی میں ماہرین تعلیم ، دانشور ، علماء اور اسلامی ذہن کے ایڈمنسٹریٹر شامل ہونے چاہئیں اور اس کمیٹی کے اجلاس ہر ماہ ہونے چاہئیں ۔

تلخیص و تجزیہ

مختلف کنونشنوں اور کانفرنسوں کی سفارشات پر اگر ہم ایک تنقیدی نگاہ ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے علماء کنونشن منعقدہ ۱۹۸۰ء میں صدر کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی تھی کہ اسلامائزیشن کے کام کی نگرانی اور جائزے کے لئے ایک مستقل کمیٹی کی ضرورت ہے ۔

جنوری ۱۹۸۳ء کی اسلامائزیشن کانفرنس میں پھر یہ مطالبہ دہرایا گیا اور جناب صدر نے یہ وعدہ کیا کہ ایسی کمیٹی ایک مہینے کے اندر بنا دی جائے گی لیکن اس پر کوئی عمل درآمد نہیں ہوا پھر جنوری ۱۹۸۴ء میں دوسرے علماء کنونشن میں یہ مطالبہ پھر دہرایا گیا، صدر نے اس کو تسلیم کیا لیکن آج تک اس پر کوئی عمل درآمد نہیں ہوا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو سفارشات اور جو مطالبات اگست ۱۹۸۰ء میں پیش کئے گئے تھے جنوری ۱۹۸۴ء میں بھی انہیں دہرانا پڑا ۔ ہمارے محتاط تجزیے کے مطابق اس دوران ایک چوتھائی سے بھی کم سفارشات پر عملدرآمد ہوا ۔ بہت سے معاملات میں صدر نے ذاتی وعدے کئے لیکن ان پر کوئی کاروائی نہیں ہوئی مثلاً پہلے علماء کنونشن میں صدر نے کہا کہ نظریاتی کونسل کو رپورٹیں شائع کرنے کی اجازت دے دی جائے گی لیکن عملاً اس کی اجازت نہیں دی گئی ۔ اسی طرح صدر نے ایک سے زیادہ بار پبلک اعلانات میں خواتین یونیورسٹی قائم کرنے کا وعدہ کیا لیکن آج تک کوئی یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی ۔ اسی طرح پہلے علماء کنونشن میں صدر نے علماء کا ایک بورڈ بنانے کا اعلان کیا جو آج تک نہیں بنا ۔ اسی طرح سے علماء کنونشن میں صدر نے یہ تسلیم کیا کہ بعض اعلیٰ سرکاری ملازمین اسلامائزیشن کے حق میں نہیں ہیں لیکن اس صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے کوئی اقدامات نہیں کئے گئے اور وہ پہلے کی طرح بیوروکریسی پر ہی انحصار کرتے رہے ۔

ان چند مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ صدر مملکت نے اسلامائزیشن کے لئے وعدے تو کئے مگر ان پر عمل نہیں ہوا ۔ ۱۹۸۰ء کے پہلے علماء کنونشن میں اسلامائزیشن کے لئے وہ پرعزم اور پرجوش تھے جبکہ ۱۹۸۴ء کے علماء کنونشن میں ان کا رویہ مدافعانہ تھا بلکہ انہوں نے اسلامی نظریاتی کونسل کے وجود کے جواز کو بھی قابل سوال ٹھہرایا ۔ (اور یہ غالباً اس لئے تھا کہ کونسل کے سربراہ محنت سے تیار کی گئی سفارشات پر عمل درآمد نہ ہونے کے سخت شاکی تھے) اگر ایک مستقل نگران ادارہ اس کام کے لئے ہوتا تو شاید اس کے نتائج بہتر ہو سکتے تھے ۔

صدر مملکت اس سلسلے میں جو عذر پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ انہیں عملی مشکلات درپیش ہیں لیکن اسلامی عناصر کبھی بھی ان مشکلات کو اس طرح نہیں سمجھ سکے حالانکہ انہوں نے اسلامائزیشن کے نام پر صدر کی حمایت کرکے اور اپنی نیک نامی کو خطرے میں ڈال کر اس کی بھاری قیمت ادا کی ہے ۔ مندرجہ بالا وقائع سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ علماء اور اسلامی سکالرز کو کنونشنوں میں بلایا گیا اور ان سے سفارشات تیار کروائی گئیں لیکن ان پر کوئی عمل درآمد نہیں

ہوا ۔ جیساکہ ہم نے پہلے باب میں واضح کیا ہے کہ اسلامی ریاست میں اجتہاد (قانون سازی) میں علماء کا کردار بہت اہم ہے اور اس غرض کے لئے ان کا بااختیار ہونا ضروری ہے لیکن پاکستان کی موجودہ صورت حال میں انہیں کوئی اختیار نہیں دیا گیا انہیں فیڈرل کونسل اور اسلامی مشاورتی کونسل میں نامزد کیا گیا اور نگرانی کے سلسلے میں کنونشنوں اور کانفرنسوں میں مدعو کیا گیا لیکن فیصلہ کرنے کا اختیار انہیں نہیں دیا گیا بلکہ ان کا رول صرف مشاورتی ہی رہا ہے ۔

سیاسی عدم استحکام کے اثرات

پس منظر

بد قسمتی سے پاکستان پہلے دن ہی سے سیاسی بحرانوں کا شکار رہا ہے قائد اعظم پاکستان بننے کے ایک سال بعد اس دنیا سے تشریف لے گئے اور چند ہی سال بعد ان کے دست راست لیاقت علی خاں کو راولپنڈی میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا ۔ پارلیمانی نظامِ حکومت کی کمزور سیاست نے فوجی جرنیلوں کو سیاست میں دخل اندازی پر اکسایا ۔ اسی دوران اسلامی سیاسی عناصر اور مغربی ذہن کے سیاست دانوں و حکمرانوں کے مابین نظریاتی کشمکش جاری رہی ۔ فوجی حکمرانوں کے خلاف ایک طویل جدوجہد سیاست دانوں کو دوبارہ حکومت کے ایوانوں میں لے آئی لیکن پاکستان پیپلز پارٹی کی غلط پالیسیوں نے عوام کے اندر اضطراب پیدا کر دیا جس کے نتیجے میں ساری دینی اور سیاسی جماعتوں نے پاکستان پیپلز پارٹی اور مسٹر بھٹو کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا ۔ جب بھٹو کے خلاف یہ عوامی تحریک زوروں پر تھی تو فوجی جرنیلوں نے دوبارہ مداخلت کی ، جنرل ضیاء کے الفاظ میں "ملک کو سیاسی انارکی سے بچانے کے لئے" اور اس دعوی کے ساتھ کہ تین ماہ کے اندر اندر الیکشن کروانے کے بعد فوج بیرکوں میں واپس چلی جائے گی تاہم عملاً ایسا نہ ہو سکا ۔

سیاسی عدم استحکام کی نوعیت اور اسباب

جب جنرل ضیاء نے مارشل لاء لگایا تھا تو فضا اسلامائزیشن کے حق میں ہموار تھی کیونکہ قوم اسلامی نظام یا نظام مصطفی کے نام پر متحرک ہو چکی تھی ۔ قومی محاذ کے رہنماؤں نے بھٹو کے خلاف عوام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر شریعت نافذ کر دیں گے ۔ اس وقت صدر ضیاء کو یہ چاہئے تھا کہ یا تو وہ محاذ کا ساتھ دیتے یا اسلامی نظام کے سلسلے میں اپنا

پروگرام سامنے لاکر عوام کو اعتماد میں لیتے تاہم انہوں نے یہ نہیں کیا ۔ اس کی بجائے انہوں نے ایک غیر جانبدار ریفری کا کردار ادا کرنا شروع کیا جس کا سب سے پہلا مظاہرہ اس وقت ہوا جب انہوں نے مارشل لاء لگاتے وقت پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان قومی اتحاد دونوں کے لیڈروں کو حراست میں لے لیا اور دونوں کو ایک سطح پر رکھا ۔ انہوں نے اپنا وزن کبھی بھی اسلامی قوتوں کے حق میں نہیں ڈالا ۔ وہ ان کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ان کے ساتھ بیٹھ کر وشنید کر سکتے تھے (انہوں نے پاکستان قومی اتحاد کی پارٹیوں کے ساتھ اس طرح کا ایک معاملہ کرنے کی ایک کوشش بعد میں ضرور کی لیکن اُس وقت جب یہ تحریک ٹھنڈی پڑ چکی تھی اور عوام پر پاکستان قومی اتحاد کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی) نتیجتاً پاکستان قومی اتحاد کی بعض جماعتیں حکومت میں شامل ہوگئیں لیکن جلد ہی انہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکتیں ، وہ صرف مارشل لاء حکام کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ گئی ہیں چنانچہ وہ حکومت سے باہر آ گئیں ۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے دو دفعہ اعلان کیا کہ وہ عام انتخابات کرائیں گے، انہوں نے ہمیشہ اس رائے کو جھٹلایا کہ وہ ایک لمبے عرصے کے لئے آئے ہیں ۔ ان کا موقف یہ تھا کہ وہ مناسب وقت پر حکومت سول ہاتھوں میں دے دیں گے اور فوج بیرکوں میں واپس چلی جائے گی جب کہ ان کے سیاسی حریف ان کی اس بات پر یقین نہیں رکھتے تھے اور ان کو الزام دیتے تھے کہ انہوں نے اپنی حکومت کو طول دینے کے لئے اسلامائزیشن کا کھڑاگ کھڑا کیا ہوا تھا ۔ دوسری جانب جنرل ضیاء الحق کا کہنا یہ تھا کہ حالات عام انتخابات کے لئے موزوں نہیں ہیں اور وہ اس عبوری مدت کے لئے جب تک کہ حالات ساز گار نہ ہو جائیں اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ اسلامائزیشن کے پروگرام پر عمل کریں اس کے برعکس ان کے سیاسی مخالفین کا کہنا یہ تھا کہ قوم نے ان کو اسلامائزیشن کا کوئی اختیار نہیں دیا ۔ جنرل ضیاء الحق کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ الیکشن کروائیں اور حکومت سول نمائندوں کو سونپ کر رخصت ہو جائیں ۔

بہت سی سیاسی جماعتوں اور گروہوں نے تحریکِ بحالی جمہوریت (M.R.D) قائم کر لی تاکہ جمہوری ادارے بحال ہو جائیں ان میں اکثریت بائیں بازو کے کاغذی گروہوں کی تھی ایم آر ڈی نے ضیاء الحق کے خلاف تحریک چلانے کی کوشش کی اور ناکام رہی کیونکہ وہ عوام کو متحرک نہ کر سکی نیز اکثر بڑے لیڈر جیل میں تھے اور تحریک انتہا پسندوں کے ہاتھوں میں چلی گئی جو ملک میں خصوصاً جنوبی صوبے سندھ میں امن وامان کا مسئلہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کے

نتیجے میں حکومت کے لئے ان کو کچلنا آسان ہوگیا ۔ ۱۲ اگست ۱۹۸۳ء کو جنرل ضیاء الحق نے وعدہ کیا کہ وہ الیکشن کروانے کے بعد اختیارات سیاسی حکومت کو ۱۸ ماہ بعد (یعنی مارچ ۱۹۸۵ء میں) سونپ دیں گے جنرل ضیاء الحق کے سیاسی مخالفین ان پر یہ الزام بھی عائد کرتے ہیں کہ انہوں نے سارے منظم اداروں کو ختم کر دیا اور یہ کہ انہوں نے سیاسی جماعتوں کو خلاف قانون ہی قرار نہیں دیا بلکہ ان کی تقسیم میں بھی اہم کردار ادا کیا کیونکہ اس دوران بہت سی سیاسی جماعتیں گروپوں میں تقسیم ہوگئیں ۔ بار کونسلوں کی سرگرمیوں پر بھی پابندیاں عائد کر دی گئیں ، عدالتوں کے اختیارات کم کر دیئے گئے اور طلبہ تنظیموں پر پابندی لگادی گئی ۔

جنرل ضیاء نے قوم سے بہت سے وعدے کئے تھے جن میں سے اکثر پورے نہیں کئے گئے دو دفعہ انتخابات کا اعلان ہوا لیکن یہ دونوں دفعہ ملتوی کر دیئے گئے ، پہلی دفعہ الیکشن معطل کرتے ہوئے انہوں نے محاسبے اور کرپشن کے خلاف محاذ کھولنے کا دعویٰ کیا ، وہائٹ پیپر تیار اور شائع کئے گئے تاہم ان امور میں ملوث سرکاری ملازمین کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی گئی ۔ اسی طرح دوسری دفعۂ الیکشن ملتوی کرتے ہوئے صدر ضیاء نے کہا کہ ان کا اصل ہدف اسلامائزیشن ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ علماء اور دینی جماعتوں کی سفارشات قبول نہیں کی گئیں ۔ انہوں نے یہ وعدہ بھی کیا کہ خواتین کے لئے الگ یونیورسٹیاں بنائی جائیں گی لیکن ان کے کسی وعدے پر بھی عمل درآمد نہیں ہوا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ هفت روزہ 'ایشیا' کے مدیر کے الفاظ میں "اب کوئی بھی شریف آدمی صدر کی بات پر یقین نہیں کرتا اور اعتماد کا یہ بحران درحقیقت سب سے بڑا بحران ہے ۔"

ضروریات زندگی کی بڑھتی ہوئی قیمتوں اور افراطِ زر کی اونچی شرح نے عوام کے اندر بےچینی پیدا کر دی ۔ مارشل لاء موجود تھا لیکن امن و امان کے حالات دن بدن بد سے بدتر ہوتے گئے ان چیزوں سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ جنرل ضیاء کی حکومت کمزور اور نااہل تھی ۔

نہ صرف یہ کہ ملک کی اندرونی صورت حال ڈانواں ڈول تھی بلکہ سرحدوں کی کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں تھی ۔ روس کی قائم کردہ افغان حکومت نے پاکستان کے مغربی بارڈر پر خلاف ورزیوں کو معمول بنا رکھا تھا جبکہ روسی حمایت یافتہ ہندوستان کی حکومت نے مشرقی بارڈر پر زور دیا ہوا تھا ۔

ان سب عوامل نے مل کر پاکستان میں سیاسی عدم استحکام پیدا کر دیا ۔ سیاسی حالات ایسے تھے کہ ان میں دینی اور سیاسی جماعتوں کے لئے مشکل تھا کہ وہ جنرل ضیاء سے

تعاون کریں چاہے وہ اسلامائزیشن کا عمل ہی کیوں نہ ہو ۔ جبکہ دوسری طرف جنرل ضیاء الحق کی یہ حالت تھی کہ نہ تو ان کی اپنی کوئی جماعت تھی اور نہ ملک کے سیاسی عناصر کی حمایت انہیں حاصل تھی وہ مجبور تھے کہ بیوروکریسی پر انحصار کریں جس کی اسلام کے لئے حمایت شک و شبہ سے بالاتر نہیں تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ جنرل ضیاء کے اسلامائزیشن کے پروگرام کے کوئی خوشگوار اور مثبت اثرات نہیں نکلے ۔

مارشل لاء کی شریعت پر بالادستی

عرصۂ زیر بحث میں پاکستان میں تین طرح کے قوانین بیک وقت کارفرما تھے ایک مروج قوانین جن کی بنیاد انگریزی قانون پر رکھی گئی تھی اور جو پاکستان کو انگریز سے ورثے میں ملے تھے، جس میں بنچ اور بار کا ڈھانچہ، قوانین اور پروسیجرل ضوابط بھی شامل تھے۔ دوسرے نمبر پر مارشل لاء کے احکامات تھے جو قانونی حیثیت رکھتے تھے، ایک عارضی دستور بھی بنایا گیا تھا، فوجی عدالتیں بھی کام کر رہی تھیں ۔ تیسرے نمبر پر شرعی قوانین تھے ۔ زنا، چوری، قذف اور شراب نوشی کے خلاف حدود کے قوانین جاری کئے گئے جن کے مقدمات ضلع اور سیشن عدالتوں میں جاتے ہیں جبکہ وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کے شرعی بنچ اپیل کورٹ کے طور پر کام کرتے ہیں ۔

بیک وقت ان تین طرح کے قوانین کی بناء پر معاشرے میں کرپشن اور نظریاتی اضمحلال پیدا ہوا ۔ فیڈرل شریعت کورٹ کے جج جناب محمد صدیق نے ایک دفعہ پی پی آئی کو بتایا کہ اس چیز کا فیصلہ پولیس خود کرتی ہے کہ وہ کوئی کیس کس مد میں رجسٹر کرے پاکستان پینل کوڈ کے تحت، اسلامی حدود کے تحت یا پھر اسے فوجی عدالت کو ریفر کر دے انہوں نے کہا کہ اس کا اثر وفاقی شرعی عدالت کی کارکردگی پر بھی پڑتا ہے ۔ روزنامہ "جسارت" کراچی نے اپنے اداریے میں لکھا کہ اس مبہم اور غیر یقینی صورت حال سے پولیس فائدہ اٹھا رہی ہے اور خوب روپیہ بنا رہی ہے کیونکہ ایک ہی جرم کے لئے پاکستان پینل کوڈ، مارشل لاء اور شریعت کے تحت مختلف سزائیں ہیں چنانچہ پولیس اس پوزیشن میں ہوتی ہے کہ وہ مجرموں کو سخت سزا کی دھمکی دے کر ان سے معاملہ کر سکے ۔ اخبار نے لکھا کہ یہ صورت حال اسلامائزیشن کے عمل کو بہت نقصان پہنچا

رہی ہے اور اس نے مطالبہ کیا کہ شرعی قوانین کی ہر حالت میں دوسرے قوانین پر بالادستی ہونی چاہیئے ۔

فیڈرل کونسل کی اسلامائزیشن کمیٹی نے بھی یہ مطالبہ کیا کہ یہ پالیسی ترک کر دی جائے کیونکہ اس نے ذہنی انتشار کو جنم دیا ہے اور یہ عام آدمی تک بروقت انصاف پہنچنے میں ایک رکاوٹ ہے ۔

اسلام آباد کی اسلامائزیشن کانفرنس میں ہفت روزہ تکبیر کے مدیر جناب محمد صلاح الدین نے صدر کی توجہ اس صورت حال کی طرف مبذول کروائی اور انہیں بتایا کہ یہ صورت حال بہت سی برائیوں کو جنم دے رہی ہے انہوں نے مطالبہ کیا کہ شرعی قوانین کو عام حالات میں بھی اور حدود میں خاص طور پر بالاتر پوزیشن حاصل ہونی چاہیئے ۔

آخر کیا وجہ ہے کہ جنرل ضیاء مارشل لاء کو شریعت کے مقابلے میں بالاتر رکھنا چاہتے تھے ، اسکے باوجود کہ وہ اسلام اور اسلامائزیشن کا ہر وقت دم بھرتے تھے ؟ بظاہر اس کی وجہ یہ لگتی ہے کہ اگر وہ مارشل لاء ہٹا دیتے تو وہ بنیاد ہی گر جاتی جس پر ان کی حکومت قائم تھی ۔ ۱۹۷۳ء کا آئین وہ بحال نہیں کر سکتے تھے کیونکہ یہ آئین اسے توڑنے والے کو غداری کا موجب گرداتنا ہے جس کی سزا عمر قید یا موت ہے ۔ علاوہ ازیں یہ خدشہ بھی اپنی جگہ موجود تھا کہ اگر وہ مارشل لاء ہٹا دیتے تو اعلیٰ عدالتیں انہیں غاصب قرار دے دیں گی جیسا کہ یحیٰی خان کے بارے میں ہو چکا ہے ۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مارشل لاء ہٹنے کی صورت میں شرعی قوانین کی رو سے بھی ضیاء حکومت کا جواز ثابت نہ ہو سکتا ۔

اگر یہ سب کچھ ذہن میں رکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ جنرل ضیاء کے پاس مارشل لاء کو ایک بالاتر قانون رکھنے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا جب تک کہ وہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے برسراقتدار رہنا چاہتے ۔ تاہم کئی اور جہات ایسی تھیں جہاں وہ شریعت کو بالاتر حیثیت دے سکتے تھے مثلاً وہ وفاقی شرعی عدالت کے اختیارات میں اضافہ کر سکتے اور اسکے دائرہ اختیار پر پابندیاں ختم کر سکتے تھے تاکہ وہ ہر قسم کے قانون کو ، بلااستثناء ، غیر اسلامی قرار دے سکے ۔ اسی طرح یہ بھی کیا جا سکتا تھا کہ وہ جرائم جو حدود کے تحت آتے ہیں ان کے بارے میں فوجی عدالتوں کی (مروجہ فوجداری ضابطوں کے تحت) جیورسڈکشن ختم کر دی جاتی ۔

اس امر کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں حقیقت یہی ہے کہ جنرل ضیاء کے اسلام اور اسلامائزیشن کے ولفریب نعروں کے باوجود پاکستان میں شریعت بالاتر قانون نہیں تھی اس کا نمبر غالباً تیسرے درجے پر تھا ۔ مارشل لاء کے ضابطے چونکہ سول کورٹس میں زیر بحث نہیں آسکتے تھے اس لئے وہ پہلے نمبر پر تھے ، دوسرے نمبر پر مروجہ قانون تھا جس پر سول عدالتوں کے ذریعے عمل درآمد ہوتا تھا اوران میں سے کچھ ایسے قوانین بھی تھے جنہیں غیر اسلامی ہونے کی بنیاد پر وفاقی شرعی عدالت میں بھی چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا گویا اس کی پوزیشن دوسری تھی ۔ اسلامی شرعی قوانین تیسرے درجے میں آتے تھے کیونکہ مارشل لاء ضوابط یا آئین پاکستان کسی بھی عدالت کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ روزمرہ کے معاملات میں شرعی قانون نافذ کرسکیں اور جہاں تک اسلامی قانون کا تعلق تھا تو اِس سلسلے میں اُس وقت تک چند ہی قوانین پاس ہوسکے تھے ۔

یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ شرعی قوانین پر مارشل لاء کی بالادستی انتہائی غیر اسلامی فعل ہے ۔ جیسا کہ پہلے باب میں وضاحت کی جاچکی ہے شریعت خدائی قانون ہے اور وہ مسلمان ریاستوں کا اعلیٰ ترین قانون ہونا چاہیئے ۔ کسی بھی وضعی قانون کی شریعت پر بالادستی بذات خود اسلام کی نفی اور اسکی تعلیمات اور اسکے مزاج کے بالکل خلاف ہے ۔ (خواہ وہ فوجی قانون ہو یا سول) ۔

نوکر شاہی کا رول

نظری طور پر نوکر شاہی عوام کی خادم ہوتی ہے اور بظاہر سرکاری ملازمین کو اس سے غرض نہیں ہونی چاہئیے کہ حکومت کس کی ہے ؟ ان کا کام تو صرف اتنا ہے کہ وہ حکومت کی پالیسیوں پر عملدرآمد کریں ۔ تاہم پاکستان کے مخصوص سیاسی حالات نے یہاں کی نوکر شاہی کو خصوصی رول عطا کیا ہے س کی مثال ممکن ہے دیگر ممالک سے میسر نہ آسکے ۔

تقسیم ہندوستان سے پہلے انگریزوں نے اپنی ضرورتوں کے مطابق سرکاری ملازمین کی تربیت ایک خاص نہج سے کی تھی نظریاتی طور پر ان کی تعلیم و تربیت اس طرح کی جاتی تھی کہ وہ مغربی زندگی کے دلدادہ ہو جائیں اور اس تہذیب اور کلچر کا ایک حصہ بن جائیں خواہ وہ نام کے مسلمان یا ہندو رہیں تاہم ان کا اصل کام شعوری یا غیر شعوری طور پر انگریز کے مخصوص مفادات کی حفاظت ہو ۔ (۳۹)

قیامِ پاکستان کے بعد کے ابتدائی سالوں میں نوکر شاہی کا رویہ خاصا دستوری تھا تاہم جب پہلے صوبائی انتخاب میں مسلم لیگ کی حکومت نے انتخاب جیتنے کے لئے نوکر شاہی کو ناجائز استعمال کیا تاکہ وہ ہر قیمت پر برسرِ اقتدار رہ سکے تو ایڈمنسٹریشن میں نوکر شاہی کا عمل دخل بڑھ گیا (۴۰)۔ لیاقت علی خان کے قتل کے بعد مسلم لیگ متحد نہ رہ سکی اور کمزور مخلوط حکومتوں کی وجہ سے نوکر شاہی کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ غلام محمد جس نے دستور ساز اسمبلی برخاست کی، ایک سرکاری ملازم تھا۔ سکندر مرزا، جس نے ملٹری بیورو کریسی کے ساتھ مل کر ۱۹۵۸ء میں سیاسی حکومت کو چلتا کر کے مارشل لاء نافذ کر دیا وہ بھی سرکاری ملازم تھا، اس وقت دستور ختم کر دیا گیا اور سیاسی جماعتیں توڑ دی گئیں، نوکر شاہی نے بادشاہ گر کا رول ادا کرنا شروع کر دیا۔ اعلیٰ معیارِ زندگی نے کرپشن کو رواج دیا۔ نوکر شاہی نے پہلے دن ہی سے اپنی تربیت اور مزاج کے عین مطابق اسلامائزیشن کی مخالفت کی جبکہ سیاست دانوں کے لئے ایسا کرنا آسان نہ تھا لہٰذا انہیں سمجھوتوں سے کام لینا پڑا۔

کیونکہ فوجی حکومت اپنا مینڈیٹ عوام سے نہیں لیتی اس لئے ایک سیاسی حکومت کے مقابلے میں فوجی حکومت کو اپنی پالیسیوں میں نوکر شاہی پر زیادہ انحصار کرنا پڑتا ہے۔

جب صدر ضیاء نے نومبر ۱۹۷۹ میں دوسری دفعہ الیکشن ملتوی کئے اور حالات سازگار ہونے تک اسلامائزیشن کے کام کا منصوبہ بنایا تو بظاہر ان کے پاس نوکر شاہی پر انحصار کرنے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا کیونکہ وہ دینی اور سیاسی قوتوں کے تعاون سے محروم ہو چکے تھے۔ سوال یہ ہے کہ شریعت ایسی نوکر شاہی کے ہاتھوں کیسے نافذ ہو سکتی ہے جو نہ تو اسے نافذ کرنے کی خواہشمند ہو اور نہ ہی اس کی اہلیت رکھتی ہو۔ "تاریخ کی یہ ایک منفرد مثال ہے کہ تبدیلی ان ہاتھوں کے ذریعے لائی جا رہی ہے جو اس میں یقین ہی نہیں رکھتے" یہ الفاظ ایڈیٹر "تکبیر" کے ہیں جو انہوں نے صدر ضیاء کی بیورو کریسی کے ذریعے اسلام نافذ کرنے کی پالیسی کے بارے میں کہے۔ ان کوششوں کے نتائج صاف ظاہر ہیں کہ ملک میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی اور اگر شریعت کو موجودہ نوکر شاہی کے ہاتھوں ہی نافذ ہونا ہے تو مستقبل میں بھی نہیں آ سکتی۔

اس نفاذِ شریعت کا حاصل کیا ہے؟ سات سالوں میں سات آرڈیننس جبکہ پانچ برسوں میں چوری، ڈکیتی، زنا وغیرہ کے حدود کے قانون کے تحت کسی ایک مجرم کو بھی سزا نہیں ہوئی

اس سے صاف ظاہر ہے کہ انتظامیہ اسلام نہیں چاہتی کیونکہ وہ یہ جانتی ہے کہ اگر شریعت سچ مچ نافذ ہوگئی تو اپنے کرتوتوں کی بناء پر سب سے پہلے اسے ہی کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ سرکاری ملازمین کا ایک نیا گروپ تیار کیا جائے تاکہ وہ صحیح جذبے اور عزم کے ساتھ اسلامائزیشن کا کام کر سکے ۔ اور اسی لئے کونسل نے یہ مطالبہ بھی کیا تھا کہ سرکاری ملازمین کی بھرتی ، ٹریننگ اور ترقی کے وقت ان کی اسلام کے ساتھ وابستگی کو لازمی طور پر پیش نظر رکھا جائے ۔

مربوط کوششوں کی کمی

اس وقت کم از کم آٹھ ادارے قانون کی اسلامائزیشن کے کام سے متعلق تھے (۱) اسلامی نظریاتی کونسل (۲) وفاقی شرعی عدالت (۳) فیڈرل کونسل (۴) لاء کمیشن (۵) اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (٦) اسلامی یونیورسٹی (۷) وزارت مذہبی امور اور (۸) وزارت قانون ۔ تاہم یہ تعجب خیز بات ہے کہ ان اداروں کے درمیان کوئی ربط اور تعاون نہیں ہے بڑی حد تک یہ ادارے ایک دوسرے سے لاتعلق رہ کر کام کرتے ہیں (۴۲) ۔ ان اداروں کے کام کرنے کا وہی پرانا طریقہ اور فرسودہ انداز تھا جس میں فائلیں ایک دفتر سے دوسرے دفتر آتی جاتی رہتی ہیں اور بعض اوقات کسی فیصلے پر پہنچنے میں برسوں بیت جاتے ہیں ۔ قاضی عدالتوں کا قانون اور قصاص و دیت کے اسلامی مسودے اس کی بہترین مثالیں ہیں ۔

سب سے بدتر یہ کہ ان میں سے بعض ادارے ایک دوسرے کی مخالفت کرتے اور ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے رہتے تھے مثلاً فیڈرل کونسل کی کمیٹی برائے قصاص اور دیت نے کہا کہ اسلامی نظریاتی کونسل مذکورہ قانون تیار کرنے کا کوئی اختیار نہیں رکھتی تھی اور یہ کہ مجوزہ مسودہ ناقابل عمل اور از کار رفتہ ہے (۴۳) ۔

اسی طرح اسلامی نظریاتی کونسل نے فیمیلی پلاننگ پر ایک رپورٹ تیار کی ، ایک صحافی کو کہیں سے یہ رپورٹ ہاتھ لگ گئی اور اس نے یہ شائع کر دی ۔ اگلے دن ایک حکومتی ترجمان نے وضاحت کرتے ہوئے پریس کو یہ بیان دیا کہ حکومت نے فیملی پلاننگ کے لئے ادارے قائم کر رکھے ہیں اور وہ نظریاتی کونسل کی مذکورہ رپورٹ کے باوجود کام کرتے رہیں گے ۔ ترجمان نے یہ بھی کہا کہ متعلقہ وزارتیں کونسل کی سفارش پر غور کریں گی اور دیکھیں گی کہ یہ رپورٹ کیبنٹ میں پیش کئے جانے کے قابل بھی ہے یا نہیں (۴۴) ۔

اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ قاضی عدالتوں کا مسودہ قانون وزارت داخلہ کی تحریک پر وزارت قانون نے بنایا، نظریاتی کونسل نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس پر نظرثانی کی، جب یہ مسودہ فیڈرل کونسل میں زیر بحث آیا تو اس میں بہت سے تبدیلیاں کی گئیں جو غیر اسلامی تھیں فیڈرل کونسل کے ایک ممبر نے جو مشہور عالم دین بھی ہین یہ الزام لگایا کہ نظریاتی کونسل جتنے بھی مسودے فیڈرل کونسل کو بھجواتی ہے یہاں ان کا حلیہ بگاڑ دیا جاتا ہے کیونکہ کونسل کے ممبران کی اکثریت اسلامی تعلیمات سے نابلد ہے (۴۵) ۔

مدیر "تکبیر" نے اس کا بڑا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے انہوں نے روزنامہ جسارت میں لکھا کہ "اسلامائزیشن کی گاڑی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے حکومت نے بعض لوگوں کو اسے دلدل سے نکالنے کے کام پر لگا رکھا ہے، ایک ایکسیلیٹر کو دباتا ہے تو دوسرا بریکوں کو ، کچھ لوگ اسے آگے دھکیلتے ہیں اور کچھ پیچھے ، ہر آدمی ہانپ رہا ہے اپنی محنت کا معاوضہ وصول کر رہا ہے ، تاہم گاڑی وہیں کی وہیں ہے (۴۶) ، ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر اس صورت حال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی تو اسلامائزیشن کی یہ گاڑی اس دلدل سے کبھی نہیں نکلے گی اگر اسلامائزیشن کے متعلق مختلف محکموں میں تعاون اور مستحکم رابطہ نہ ہو ، اگر ان کے گاہے بگاہے اجلاس نہ ہوں اور اگر ان کا کوئی نگران ادارہ نہ ہو جسے وہ اپنے مسائل سے آگاہ کریں، اس کا حل پوچھیں انہیں کام کی رپورٹ دیں تو اس کام سے کوئی مفید مطلب نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا ۔

فرقہ وارنہ اختلافات

پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت سنی حنفی ہے تاہم یہ اکثریت دو حصوں میں منقسم ہے بریلوی اور دیوبندی ۔ یہ خاص تقسیم صرف برصغیر پاک و ہند ہی میں موجود ہے اور دوسرے مسلمان ملکوں میں وجود نہیں رکھتی ۔ بریلوی حضرات ، جناب احمد رضا خان بریلوی کے پیرو کار ہیں جو قدامت پسندانہ نقطہ نظر رکھنے والے ایک مذہبی رہنما تھے ۔ دیوبندی وہ حنفی ہیں جو علماء دیوبند کی آراء کا تتبع کرتے ہیں ۔ دیوبند ہندوستان کا ایک بہت بڑا اسلامی تعلیمی مرکز ہے ۔ بریلویوں کے مقابلے میں دیوبندی معتدل قسم کے حنفی سمجھے جاتے ہیں ۔ دیوبندی اور بریلوی دونوں اگرچہ فقہی لحاظ سے حنفی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں لیکن بد قسمتی سے وہ عموماً باہم متصادم رہتے ہیں مسجدیں ان کے مورچے اور لاؤڈ سپیکر ان کے ہتھیار ہیں ۔ اگرچہ بعض اوقات بات اس سے آگے بھی بڑھ جاتی ہے ۔

حنفیوں کے علاوہ پاکستان میں شیعہ اور اہل حدیث بھی ہیں ۔ شیعہ مسلک کی فقہ اور اصول فقہ الگ ہے ۔ اہل حدیث اگرچہ کسی خاص امام کی پیروی نہیں کرتے تاہم وہ اہل سنت میں شمار ہوتے ہیں ۔ قادیانی سب کے نزدیک غیر مسلم ہیں ۔

قانونی لحاظ سے شیعہ اور سنی اختلاف اہم ہے کیونکہ شیعہ حضرات کی اپنی فقہ ہے جو سنیوں سے مختلف ہے جہاں تک دیوبندیوں اور بریلویوں کا تعلق ہے ان کے اختلافات فقہ سے زیادہ عقائد و کلام سے متعلق ہیں ، اہل حدیثوں کے اختلافات حنفیوں اور شیعوں کے ساتھ اگرچہ فقہی نوعیت کے ہیں تاہم وہ تعداد میں اتنے کم اور آپس میں اتنے منقسم ہیں کہ انہوں نے کبھی علیحدہ قانونی مطالبات پیش نہیں کئے ۔

۱۹۵۱ء میں مختلف مذہبی مسالک کے علماء ایک ۲۲ نکاتی پروگرام پر متحد ہو گئے تھے ۔ ان نکات میں فرقہ وارانہ اختلافات کو احسن طریقے سے حل کیا گیا تھا اور یہ کہا گیا تھا کہ "مسلمہ اسلامی فرقوں کو قانونی حدود کے اندر مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوگی ، وہ اپنے پیروکاروں کو مذہبی تعلیم دے سکیں گے ، قانونِ احوال شخصیہ میں ہر مسلک کو اپنے فقہی مذہب کے مطابق عمل کرنے کا حق حاصل ہو گا بلکہ یہ زیادہ مناسب ہو گا کہ ان کے ہم مسلک جج ہی ان امور میں فیصلے کریں" (۲۷) ۔ گویا اس کا مطلب یہ تھا کہ ملک کا عام قانون عوام کی اکثریتی رائے کے مطابق ہو گا تاہم قانون احوال شخصیہ ہر آدمی کے مسلک کے مطابق ہو گا ۔

جب ضیاء الحق نے اسلامائزیشن کا کام شروع کیا تو شیعہ گروہوں نے سنّی نقطہ نظر کے مطابق بنائے گئے قوانین پر عدم اعتماد کا اظہار کیا اور اس پر اصرار کیا کہ ان کے مسلک کو بھی قانون میں جگہ دی جائے اور انہیں عمومی قانون سے مستثنیٰ قرار دیا جائے ۔ شیعہ اقلیت پاکستان میں بڑی متحرک اور طاقتور ہے ۔ ایرانی انقلاب نے اسے اور بھی پر جوش بنا دیا ہے اس نے کئی دفعہ انتظامیہ کے لئے امن و امان کا مسئلہ پیدا کیا اور مختلف ہتھکنڈوں سے دباؤ ڈال کر حکومت کو اپنے مطالبات ماننے پر مجبور کر دیا مثلاً زکوٰۃ و عشر کے قوانین اور اسلامی حدود میں ۔

سنّی اکثریت اس صورت حال کو بڑی مشکل سے برداشت کئے ہوئے ہے ، ستمبر ۱۹۸۳ء میں کراچی میں دونوں گروہوں کے درمیان خونریز جھڑپیں ہوئیں اس میں دونوں جانب سے بہت سے آدمی مارے گئے ۔ ملک کے بعض حصوں میں اب بھی عدم اطمینان کے شواہد پائے جاتے ہیں محرم الحرام کے عشرے کو خیریت سے گزارنا حکومت کے لئے مسئلہ بن چکا ہے ، اور

کسی بھی وقت حالات تشویش ناک رخ اختیار کر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ صدر مملکت نے جب بھی اسلامائزیشن کی کوئی کانفرنس کی تو مختلف فرقوں کے علماء سے یہ مطالبہ کیا کہ آپس میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے سوچ بچار کریں ۔

حکومت کو یہ مسئلہ حل کرنے کے لئے ٹھنڈے دل و دماغ سے فیصلے کرنا ہوں گے ورنہ یہ فرقہ وارانہ اختلافات ، اسلامائزیشن تو رہی ایک طرف ، خود ملک کے امن و امان کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں ۔

اسلامائزیشن کے کام میں پبلک اور دینی جماعتوں کی سرد مہری

بد قسمتی سے جنرل ضیاء اپنے اسلامائزیشن کے پروگرام کے لئے عام پبلک خصوصاً دینی جماعتوں کا سرگرم تعاون حاصل نہیں کر سکے ۔ جس کی چند مثالیں یہ ہیں ۔

مفتی سیاح الدین کاکاخیل (جو اسلامی نظریاتی کونسل کے ممبر تھے) نے ہفت روزہ "اذان" بر ہم کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ نظریاتی کونسل عوام کی حمایت سے محروم ہے ۔ علماء سمیت سب لوگ جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ تو کرتے ہیں تاہم کوئی یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ نظریاتی کونسل کی سفارشات پر عمل درآمد کیا جائے یا اس کی سفارشات کو شائع ہی کر دیا جائے ۔

شرعی عدالت نے اپریل ۱۹۸۴ء میں یہ قرار دیا کہ پاکستان سیکورٹی ایکٹ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے لہذا اسے بدلا جائے۔ اس کی تفصیلات پریس کو مہیا کی گئیں جس میں عدالت نے اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ پبلک نے عموماً اور سیاست دانوں اور صحافیوں نے خصوصاً اس معاملے میں دلچسپی نہیں لی حالانکہ اس کے متعلق خصوصی نوٹس پریس میں شائع کئے گئے تھے ۔ اسی طرح پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس ۱۹۶۰ء پر غور کرتے ہوئے کچھ صحافیوں کو عدالت میں حاضر ہونے کے سمن جاری کرنے پڑے کیونکہ پبلک نوٹس میں کسی نے اس معاملے میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا ۔

جب شرعی عدالت قائم کی گئی تو یہ صرف پٹیشن پر ہی فیصلہ کر سکتی تھی تاہم عام پبلک اور دینی اور قانونی حلقوں کی طرف سے عدم دلچسپی کی بناء پر عدالت کے چیف جسٹس جناب آفتاب حسین نے اپنے چیمبر میں وکلاء اور علماء کے ایک وفد سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ قوانین کی اسلامائزیشن کے سلسلے میں انہیں دلچسپی لینی چاہئے اور کمیٹیاں بنا کر کام کرنا چاہئے ۔

وفاقی شرعی عدالت نے پبلک نوٹس نہ صرف اخباروں اور رسالوں کو شائع کرنے کے لئے دیئے بلکہ دینی اور مذہبی اداروں کو بھی بھجوائے لیکن اکا دکا انفرادی واقعات کے علاوہ کسی جماعت یا ادارے نے اس کام میں عدالت سے رجوع نہیں کیا حالانکہ عدالت نے ان پبلک نوٹسوں کی اشاعت پر تقریباً چار لاکھ روپے خرچ کئے ۔ عوام کی سردمہری کے اس رویے پر قومی پریس میں مختلف شکایات بھی شائع ہوئیں مثلاً مفتی محمد حسین نعیمی نے جو ایک معروف عالم دین ہیں ایک اخباری بیان میں کہا کہ جماعت اسلامی نے جو اسلامی نظام کی چمپین بنتی ہے قوانین کی اسلامائیزیشن کے عمل میں وفاقی شرعی عدالت اور دوسرے اداروں کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا (۴۸) ۔ اس سردمہری کے اسباب بے شمار ہو سکتے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسلامائزیشن کے کام کے سلسلے میں جنرل ضیاء پر اعتماد کی کیفیت موجود نہیں تھی علاوہ ازیں پبلک کا ایک عنصر یہ بھی سمجھتا تھا کہ جنرل ضیاء کو قوم نے اس کام کے لئے کوئی مینڈیٹ نہیں دیا بلکہ بعض عناصر تو ضیاء حکومت کو سرے سے غیر آئینی سمجھتے تھے ۔

پبلک میں ایک عام تاثر یہ بھی تھا کہ جنرل ضیاء اسلامی قوانین کے نفاذ کی خاطر نہیں بلکہ محض اپنے اقتدار کی خاطر حکومت کو طول دے رہے ہیں اور بعض کے نزدیک وہ اور ان کی حکومت اسلامائزیشن کے لئے سرے سے کوئی اہلیت ہی نہیں رکھتی تھی ۔ جب ایم آر ڈی نے ضیاء کے خلاف بحالی جمہوریت کی تحریک چلائی تو اس کے بعض دینی رہنماؤں نے عوام سے کہا کہ حکومت کو زکوٰۃ و عشر نہ دیں کیونکہ یہ غیر اسلامی حکومت ہے (۴۹) ۔

دینی اور مذہبی جماعتیں ضیاء سے اس وجہ سے بھی ناراض تھیں کہ اس نے انہیں گروپوں میں تقسیم کر دیا تھا وہ سمجھتے تھے کہ اس میں ضیاء حکومت کا ہاتھ ہے ۔ صرف جماعت اسلامی اس تقسیم سے بچی تاہم جماعت پر وار کرنے کے لئے اس کی حمایت یافتہ طلبہ تنظیم کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور اس سے وابستہ اساتذہ کی تنظیم کو بھی خلاف قانون قرار دینے کی دھمکی دی گئی ۔ مختصر یہ کہ ضیاء حکومت کی پالیسیوں کی وجہ سے دینی عناصر دن بدن اس سے دور ہو رہے تھے اس چیز کا اسلامائزیشن پر بھی برا اثر پڑا ۔

اسلامائزیشن کے کام کی سُست رفتاری

جنرل ضیاء الحق نے اس چیز کا کئی دفعہ اظہار کیا کہ وہ اسلامائزیشن کے لئے انقلابی کے بجائے تدریجی کام کی حمایت کرتے ہیں (۵۰) تاہم قانون و دستور کی اسلامائزیشن کے سلسلے میں ان کے کام کی رفتار انتہائی کم اور عدم اطمینان بخش رہی ہے اور اسلامائزیشن کے متعلق ہر کانفرنس اور کنونشن صرف اسی امر پر غور کرتی رہی ہے کہ اس کام کو تیز روی سے کس طرح کیا جائے ۔ فیڈرل کونسل اور اسلامی نظریاتی کونسل نے بھی اس سلسلے میں اپنی تجاویز پیش کی ہیں ۔

پیشتر اس سکے کہ ہم اس صورت حال کا تجزیہ کریں ہم سات سالہ اسلامائزیشن کے کام کے بارے میں کچھ اعداد و شمار پیش کرنا چاہتے ہیں ۔

	قوانین	
	جن پر عمل در آمد ہوا	جن پر عملدر آمد نہیں ہوا
۱) اسلامی نوعیت کے جو قانونی مسودہ جات اسلامی نظریاتی کونسل اور دوسرے اداروں نے تیار کئے	۷	۹
۲) پاکستان کوڈ کی ۱۲ جلدوں پر نظر ثانی کا کام جو وفاقی شرعی عدالت نے کیا	۱۲	-
۳) وہ قانون جن پر اسلامی نظریاتی کونسل نے نظر ثانی کی	-	۸
۴) تعلیم ، ذرائع ابلاغ اور سوشل آرڈر سے متعلق سات رپورٹیں	-	۷
۵) علماء کنونشن ۱۹۸۴ء کی سفارشات	۵	۱۰
۶) علماء کنونشن ۱۹۸۳ء کی سفارشات	۴	۹

اگرچہ حدود کے قوانین نافذ کر دیئے گئے تاہم ان پر عمل در آمد نہیں ہوا جس کی وجہ سے امن و امان کی صورت حال پر بہت برا اثر پڑا ۔

یہ کارکردگی حوصلہ شکن محسوس ہوتی ہے اگر ہم یہ ذہن میں رکھیں کہ یہ کام سات سال میں ہوا ہے اور مارشل لاء کے زمانے میں ہوا ہے جب سارے اختیارات ایک فرد کے ہاتھ میں تھے جہاں ایک فعال حکومت کے تیزی سے کام کرنے کے امکانات سست جمہوری ڈھانچے کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں ۔ مندرجہ ذیل جدول سے عیاں ہو جائے گا کہ مختلف حکومتی اداروں نے اسلامی قوانین کو پاس کرنے میں کتنا وقت لیا ہے ۔

مسودہ قانون کا نام	وقت جو نظریاتی کونسل نے لیا (سال / ماہ)	وقت جو دوسری وزارتوں نے نظر ثانی میں گزارا: سال	ماہ	وقت جو شوریٰ نے لیا: تاریخ جس کو پیش ہوا	تاریخ جس کو پاس ہوا	کل عرصہ: سال	ماہ	موجودہ کیفیت	وقت جو صدر جولائی ۸۳ء تک منظوری میں: سال	ماہ
قانون قصاص و دیت	۱۱ ۸/۸۰-۷/۷۹	۱	۵	۸۲-۱-۱۸	۸۳-۷-۲۶	۲	۶	ابھی تک قانون نہیں بنا	-	
قانون حق شفع	۳ ۔ ۶/۸۰-۹/۱۰	۱	۴	۸۳-۱-۱۸	۸۲-۱۰-۱۲	-	۹	〃	۲	-
قانون شہادت	۷/۱۳		۲	۸۲-۱۰-۲۱	۸۳-۳-۳	-	۵	〃	۱	۲
قوانین [illegible]	۶/۸۰	۱	۵	۸۳-۱-۱۸	۸۳-۲-۲۰	۱	۱	〃	۱	۱

ہماری رائے میں سابقہ مباحث کی روشنی میں اس سست روی کے اسباب درج ذیل ہیں ۔

اسلامائزیشن میں سست روی کے اسباب

اس سست روی کا ایک بڑا سبب قوت فیصلہ کی کمی ہے ۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر (جو صدر مملکت بھی تھے) قانون سازی کا واحد منبع تھے ۔ کابینہ ، اسلامی نظریاتی کونسل ، مجلس شوریٰ اور وفاقی شرعی عدالت ان سب کے ممبران کو یا تو صدر خود نامزد کرتا تھا یا اس کی منظوری سے ان کی تقرری ہوتی تھی ۔ اسی طرح وزارتِ مذہبی امور اور وزارتِ قانون کے اہم افسران کی تقرریاں، تبادلے بھی صدر کی مرضی ہی سے ہوتے تھے ۔ گویا اسلامائزیشن سے متعلق جتنے بھی ادارے تھے ان میں ذمہ داری کے مناسب صدر کے پسندیدہ افراد کے پاس تھے ، اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ان اداروں کی چھلنی سے چھن کر جب مسودہ ہائے قوانین صدر کے پاس

پہنچتے تو وہ ان پر دستخط نہیں کرتے تھے بلکہ یہ مہینوں اور برسوں وہاں پڑے رہتے تھے یا ان پر غور کے لئے مزید کمیٹیاں بٹھا دی جاتی تھیں ۔ صدر کیوں بر وقت فیصلے نہیں کرتے یا نہیں کر پاتے تھے ؟ ہمارے خیال میں اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ پاکستان میں یہ طے نہیں ہے کہ کسی امر کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کے بارے میں (قانونی طور پر) فیصلہ کون کرے گا ۔ (گویا دوسرے لفظوں میں تعبیر شریعت کا اختیار کس کے پاس ہے ؟) غالباً اسلامی نظریاتی کونسل اس کے لئے بہترین ادارہ ہے کیونکہ اس میں ملک بھر کے جید علماء (جن کا تعلق مختلف مکتبہ ہائے فکر سے ہوتا ہے) موجود ہوتے ہیں لیکن اس کی مشکل یہ ہے کہ آئینی طور پر کونسل کا رول مشاورتی ہے اور اسے فیصلہ کرنے کے اختیارات حاصل نہیں ہیں ، حکومت چاہے تو اس کی سفارشات کو مانے اور چاہے تو رد کر دے ۔ وفاقی شرعی عدالت بھی اس سلسلے میں مفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن عدالت ہونے کے ناطے اس کا دائرۂ کار محدود ہے جسے بڑھایا نہیں جا سکتا (اگرچہ حکومت نے بعض اہم معاملات میں غیر رسمی سطح پر عدالت کے ججوں سے بعض اوقات مشورے لئے ہیں) ۔ مجلس شوریٰ چونکہ پارلیمنٹ کی نعم البدل نہیں اس لئے وہ قانون سازی نہیں کر سکتی تھی اور پھر اس کے ممبران کی اکثریت بھی اسلامی قوانین سے نابلد تھی اس لئے اگر وہ بااختیار ہوتی بھی تو اسے قوانین کے اسلامی ہونے یا نہ ہونے پر اتھارٹی نہیں سمجھا جا سکتا تھا ۔ اس طرح فیصلہ کن اختیارات گویا صدر ہی کے پاس تھے لیکن ان کی نفسیاتی مشکل یہ تھی کہ صدر ہونے کے ناطے وہ سب کو خوش رکھنا چاہتے تھے ۔ وہ ذاتی طور پر اسلامائزیشن کی حمایت کرتے تھے لیکن جب معاملہ کہیں اٹک جائے اور نزاع پیدا ہو جائے تو وہ اسلامی قوانین کے حق میں فیصلہ دینے کی بجائے غیر جانبداری کا رویہ اور مصالحت کا رول اختیار کر لیتے تھے ۔

اسلامی حدود سے متعلق پانچ آرڈیننس پاس کئے گئے جس میں زیادہ وقت نہ لگا غالباً اس لئے کہ یہ قوانین براہ راست قرآن و سنت سے مستنبط کئے گئے تھے ، جبکہ متنازعہ قوانین زیادہ تر صدر اسلام کے فقہاء کے استنباطات پر مشتمل تھے اگرچہ بنیادی طور پر وہ بھی قرآن و سنت کی تعلیمات پر ہی مبنی تھے ۔ براہ راست قرآن و سنت پر مبنی قوانین کی مخالفت مشکل ہے جبکہ مقابلتاً فقہ پر مبنی قوانین کی مخالفت کی گنجائش نکل سکتی ہے ۔

ایک اور بڑی مشکل جس نے اس صورت حال کو پیچیدہ بنا دیا وہ یہ تھی کہ صدرِ مملکت خود اسلامی قوانین کے ماہر نہیں تھے جب متضاد آراء ان کے پاس پہنچتیں اور ہر رائے کے بارے میں کہا جاتا کہ یہ اسلامی ہے تو ان کے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ۔ اگر ایک ہی کام مختلف

اداروں اور ایجنسیوں کو جو یکساں اختیارات رکھتے ہوں بغیر کسی موثر انتظامی کنٹرول کے دے دیا جائے تو اس سے ثنویت اور تاخیر کا پیدا ہونا ناگزیر ہے ۔ اس وقت اسلامی قانون کی ڈرافٹنگ بیک وقت وزارتِ قانون ، وزارت مذہبی امور ، اسلامی نظریاتی کونسل ، اور فیڈرل کونسل کے پاس تھی ۔ اسی طرح اسلام میں حکومتی ڈھانچے جیسے حساس دستوری موضوع کو چار مختلف ایجنسیوں کے سپرد کر دیا گیا یعنی کابینہ کی سپیشل کمیٹی ، نظریاتی کونسل ، فیڈرل کونسل اور انصاری کمیشن ۔ ان رپورٹوں کے مکمل ہونے میں دو سال سے زیادہ عرصہ لگ گیا ۔ قصاص اور دیت کا مسودہ قانون اس کی ایک اور مثال ہے ۔ اس پر فیڈرل کونسل کی ۵ کمیٹیوں نے غور کیا ۔

- قانون اور پارلیمانی امور کی سٹینڈنگ کمیٹی ۔
- مذہبی اور اقلیتی امور کی اسٹینڈنگ کمیٹی ۔
- اسلامائیزیشن کی سپیشل کمیٹی ۔
- قصاص اور دیت کے مسودے پر غور کیلئے سلیکٹ کمیٹی ۔
- قصاص اور دیت کے مسودے کے لئے سپیشل کمیٹی ۔

اس کا نتیجہ شدید اختلافات کی صورت میں نکلا اور فیڈرل کونسل کو اس مسودہ قانون کو منظور کرنے میں اڑھائی سال کا عرصہ لگ گیا ۔

قانون کی اسلامائزیشن سے متعلق کام کرنے والی مختلف ایجنسیوں کے درمیان کوئی تعاون اور رابطہ نہیں تھا ۔ اس کے برعکس بعض اوقات یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان میں سے بعض ایک دوسرے کے خلاف کام کر رہی ہیں ۔ اسی طرح اس عمل کی مناسب نگرانی کا بھی انتظام نہیں تھا ۔ کوئی ایسا ادارہ نہیں تھا جس کو یہ مختلف ایجنسیاں اپنے کام کی رپورٹ دینے کی پابند ہوتیں یا پیش آمدہ مسائل اور مشکلات میں مشورہ کر سکتیں ۔

نوکر شاہی خاص طور پر اونچی سطح کے سرکاری ملازمین اور حکومتی بزر جمہروں کو (صدرِ مملکت کے علاوہ) نفاذِ اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ بلکہ وہ اسلام کو قدامت پرستی ، ملّا ازم ، اور بنیاد پرستی سمجھتے تھے ۔ جبکہ درحقیقت ان کی رائے میں ہماری ہر مشکل کا حل اس راز میں پوشیدہ ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن کی پیروی کی جائے ۔

یہ وہ چند وجوہ ہیں جو قانون کی اسلامائزیشن میں تاخیر کا سبب بنیں ۔ یہ صورت حال بدل سکتی تھی اگر جناب صدر اسلامائزیشن کے حق میں اپنی اتھارٹی استعمال کرتے بشرطیکہ اس کے لئے ایک منظم اپروچ ہوتی ، نگرانی کا مؤثر انتظام ہوتا اور متعلقہ اداروں میں مضبوط رابطہ اور تعاون ہوتا ۔

اسلامائزیشن کے اثرات

عام طور پر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ جنرل ضیاء نے اسلامائزیشن کے لئے جو اقدامات کئے سوسائٹی پر اس کے مثبت اثرات نمایاں نہیں ہوئے ۔ دوسرے علماء کنونشن میں جو ۴ اور ۵ جنوری ۱۹۸۳ء کو اسلام آباد میں ہوا صدر مملکت نے اس موضوع کو چھیڑا ۔ انہوں نے کہا میں ان لوگوں کی منطق سمجھنے سے قاصر ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ ہماری اسلامائزیشن کی کوششوں کے کوئی نمایاں اثرات نہیں ہیں ۔ تاہم انہوں نے علماء سے کہا کہ وہ اس موضوع پر بحث کریں اور انہیں بتائیں کہ اسلامائزیشن کے مثبت اثرات کو کس طرح پیدا کیا اور بڑھایا جا سکتا ہے (۵۱) ۔

بعض علماء نے اس موضوع پر تقریریں بھی کیں ۔ اس سلسلے میں ہماری پہلی گزارش تو یہ ہے کہ اگر معاشرے کے سماجی ، اخلاقی ، سیاسی اور معاشرتی ڈھانچے میں کوئی حقیقی اور مثبت تبدیلی عملاً واقع نہ ہوئی ہو جسے ہر آدمی دیکھ سکے اور محسوس کر سکے تو کسی مصنوعی طریقے یا پراپیگنڈے کے ذریعے عوام کو کوئی ایسی تبدیلی باور نہیں کروائی جا سکتی ۔

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

سچی بات تو یہ ہے کہ اس اسلامائزیشن کے معاشرے پر کوئی اثرات نہیں پڑے اس کی متعدد وجوہ میں سے چند ایک یہ ہیں ۔

اسلامائزیشن کا عمل سطحی، سست اور غیر فعال رہا ہے ۔ سات سال کے عرصے میں صرف سات اسلامی قوانین بنائے گئے ۔ اور قانون کی اسلامائیزیشن اور دوسرے امور کے لئے نظریاتی کونسل نے جتنی بھی تجاویز پیش کیں ان کو نظر انداز کر دیا گیا ۔

اسلامائزیشن کے لئے جو برے بھلے اقدامات کئے بھی گئے ان پر ٹھیک طریقے سے عمل درآمد نہیں ہوا ، مثال کے طور پر حدود نافذ کی گئیں لیکن ان پر عمل نہیں ہوا لہذا شرح جرائم میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ بعض صورتوں میں اضافہ ہی ہوا ۔ اس سلسلے میں سوڈان کی مثال

بھی ہمارے سامنے ہے جہاں اسلامائزیشن کا عمل پاکستان کے مقابلے میں بہت دیر سے شروع ہوا ۔ تاہم وہاں حدود کے نفاذ کے بعد پہلے سال ساٹھ چوروں اور ڈاکوؤں کے ہاتھ کاٹے گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں جرائم میں چالیس فیصد کمی واقع ہو گئی (۵۲) ۔ لوگوں کے اذہان و قلوب کو صرف قانونی اور انتظامی اقدامات سے نہیں بدلا جاسکتا ، اسلامائزیشن کے عمل میں لوگو شریک کرنے اور اس کام میں ان کا سرگرم تعاون حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ابلاغ عامہ ور تعلیم و تربیت کے سارے میسر وسائل کو اس غرض کے لئے استعمال کیا جاتا تاکہ تبدیلی کا عمل ، صرف اوپر سے شروع ہوتا بلکہ وہ جڑوں سے بھی پھوٹتا کیونکہ حقیقی اور پائیدار تبدیلی صرف نہی ہوتی ہے جو انسان کے اندر سے ابھرے یا جس تبدیلی کو وہ اپنے اندرونی جذبے سے سچا جانے ، مانے اور اپنائے ۔ اس سلسلے میں بعض دوسرے عوامل جن کا ذکر ہم تفصیل کے ساتھ پچھلے صفحات میں کر چکے ہیں یہ ہیں : شریعت پر مارشل لاء کی بالادستی ، نوکرشاہی کا منفی رول ، متعلقہ اداروں میں عدم تعاون اور عدم رابطہ ، سیاسی انارکی ، دینی عناصر اور عوام کی عدم توجہی ۔

تلخیص مبحث

گورنمنٹ نے اسلامائزیشن کے لئے نئے ادارے قائم کئے اور بعض پہلے اداروں کو ترقی دی ۔ ان میں سے بعض اداروں نے اچھا اور مفید کام کیا جبکہ بعض دوسرے ادارے اسلامائزیشن کے لئے مفید ثابت نہیں ہوئے ۔

اسلامائزیشن کے کام کی رفتار سست رہی ہے ۔ خاص کر شریعت پر مارشل لاء کی بالادستی ، نوکرشاہی کا منفی کردار ، سیاسی عدم استحکام ، قوتِ فیصلہ کی کمی ، اداروں میں تعاون کی کمی اور کسی بالادست و نگران ادارے کی عدم موجودگی کی وجہ سے اسلامائزیشن کے لئے کیا گیا کام نہ صرف اپنے کیف و کم کی وجہ سے غیر اطمینان بخش ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی ناکام رہا ہے کہ اس نے معاشرے پر مثبت اثرات نہیں چھوڑے خصوصاً انتظامیہ کی عدم دلچسپی اور ان پر بھدے طریقہ سے عملدرآمد کرانے اور ان دیگر اقدامات کی وجہ سے جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں ۔

علاوہ ازیں اسلامائزیشن کا کام اس صحیح اسلامی سپرٹ ، تقاضوں اور ترجیحات کے مطابق نہیں ہوا جن کا ذکر ہم نے پہلے باب میں کیا ہے ۔ ان سب امور کا نتیجہ یہ ہے کہ ان

کوششوں کا خاطر خواہ اور مثبت نتیجہ نہیں نکلا تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ صحیح سمت میں ایک قدم ضرور تھا جبکہ پچھلی حکومتیں یہ بھول ہی گئی تھیں کہ پاکستان اسلام کے نفاذ ہی کے لئے وجود میں آیا تھا ۔ ضیاء حکومت کے سلسلے میں یہ اعتراف تو بہرحال ہونا چاہیئے کہ اس نے پاکستان کی نظریاتی گاڑی کو دوبارہ پٹڑی پر چڑھا دیا یہ بہت کچھ نہیں کر سکی تاہم اس نے کچھ نہ کچھ تو کیا ہے اور کچھ نہ کرنے کے مقابلے میں تھوڑا کرنا بہرحال قابل مذمت نہیں ہو سکتا ۔ تاہم پاکستان میں کچھ عناصر ایسے بھی ہیں جو سنجیدگی اور اخلاص سے یہ رائے رکھتے ہیں کہ مارشل لاء کے ان ادھورے اقدامات نے اسلام اور اسلامائزیشن دونوں کو نقصان پہنچایا ہے ۔

ہم نے پچھلے صفحات میں قانون کی اسلامائزیشن کے متعلق ان اقدامات کا ذکر کیا ہے جو جولائی ۱۹۷۷ء سے جولائی ۱۹۸۴ء کے درمیانی عرصے میں کئے گئے ہیں پھر ایک معروضی تجزیئے کے ذریعے ان عوامل پر بحث کرنے کی کوشش کی ہے جو اسلامائزیشن کے اس عمل پر مثبت یا منفی طور پر اثر انداز ہوئے ہیں ۔ ہم ان مباحث کی روشنی میں اب اس پوزیشن میں ہیں کہ صورت حال کی اصلاح کے لئے اپنی طرف سے کچھ تجاویز پیش کر سکیں ۔

قانون کی اسلامائزیشن کے لئے ہماری تجویز

پچھلے مباحث کی روشنی میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ قانون کی اسلامائزیشن کے لئے ایک ایسا ادارہ ناگزیر ہے جو عوام کا منتخب کردہ ہو اور جس کے ممبران شریعت کے ماہر ہوں ۔ ایسے ادارے کو اسلامی اصولوں کے تحت اجتہاد (قانون سازی) کی پوری آزادی ہونی چاہیئے ۔

ملک میں ایک منتخب سیاسی جمہوری حکومت ہونی چاہیئے ، انتخابات متناسب نمائندگی کے اصول کے تحت ہونے چاہئیں ، جہاں ووٹ افراد کو نہیں سیاسی جماعتوں کو ملیں ۔ سیاسی جماعتوں کو پہلے سے بتا دیا جائے کہ ان کی لسٹوں میں اسلامی قانون کے ماہرین بھی ہونے چاہئیں ۔ ان ماہرین کی صفات ایک مجتہد کی صفات کے اقرب ترین ہونی چاہئیں ۔ جنہیں باقاعدہ دستور کا ایک جزء ہونا چاہیئے ۔

ایک منتخب پارلیمنٹ میں ان کامیاب ارکان کی جو شرعی قانون کے ماہر ہوں ایک اجتہاد کمیٹی بنا دی جائے ۔ اور اس میں ہر جماعت کے نمائندے اسی تناسب سے لئے جائیں جس تناسب سے پارلیمنٹ کی نشستیں اس سیاسی جماعت نے جیتی ہوں ۔ پارلیمنٹ میں ایک عمومی

بحث کے بعد سارے مسودہ ہائے قوانین اس کمیٹی کو بھجوا دیئے جائیں ۔ قانون سازی میں اس کمیٹی کا فیصلہ حتمی اور آخری ہو اور اسے ختم کرنے کا اختیار نہ پارلیمنٹ کو ہو نہ صدرِ مملکت کو ۔ تاہم صدرِ مملکت اور پارلیمنٹ کی اکثریت اپنی ترمیمی تجاویز کے ساتھ کسی مسودہ قانون کو نظرِ ثانی کے لئے اس کمیٹی کے پاس واپس بھجوا سکتے ہیں ۔

یہ تجویز اس تجزیئے پر مبنی ہے جو تیسرے باب میں ہم نے نظریاتی کونسل اور فیڈرل کونسل کے بارے میں کیا ہے اور جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قانون کی اسلامائزیشن کے سلسلے میں کسی مشاورتی ادارے کا کوئی وزن نہیں ہو سکتا ، علاوہ ازیں جن ممبران میں اجتہاد کی صلاحیت نہیں پائی جاتی ان کو اجتہاد کا حق بھی نہیں دیا جا سکتا ۔ جیسا کہ ہم نے پہلے باب میں ذکر کیا ہے ۔

یہ کمیٹی خود مختار ہونی چاہیئے جو اپنا طریق کار خود طے کرے اور اپنا چیئرمین خود چنے ۔ اس کمیٹی کو یہ اختیار بھی ہونا چاہیئے کہ وہ دو تہائی اکثریت سے کسی کمیٹی ممبر کی رکنیت ختم کر سکے جس میں کم سے کم مطلوبہ علمی اور دینی صفات نہ پائی جاتی ہوں ۔

اس طرح سے بنایا گیا قانون سپریم کورٹ میں اس بنیاد پر چیلنج کیا جا سکے گا کہ وہ قرآن و سنت کے خلاف ہے بشرطیکہ عدالت کے جج اسلامی قانون کے ماہر ہوں اور ان میں مجتہد ہونے کی کم از کم شرائط پائی جاتی ہوں ۔

اس طرح کی کمیٹی کے سپرد سابقہ قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کا کام بھی کیا جا سکتا ہے ۔

اگر انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر ہوں یعنی سیاسی جماعتوں کو الیکشن لڑنے کی اجازت نہ ہو تو اس طرح کی اجتہاد کمیٹی اسلامی قانون کے ان ماہرین پر مشتمل ہو سکتی ہے جو عام انتخابات میں کامیاب ہوں ۔ باقی ساری شرائط وہی ہوں گی جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے ۔

جیسا کہ ہم نے جزء اول کی ابتداء میں عرض کیا تھا کہ یہ مباحث جولائی ۱۹۷۷ سے لے کر جولائی ۱۹۸۴ تک کے عرصہ پر محیط ہیں لیکن عام انتخابات کے بعد لیگی وزارت نے حلف مارچ ۱۹۸۵ میں اٹھایا اس لئے اس درمیانی عرصے میں آنے والے واقعات کا سرسری ذکر بھی ضروری ہے ۔

۱۲ اگست ۱۹۸۳ کو صدر ضیاء نے انتخابی شیڈول کا اعلان کر دیا تھا اس طرح اس ایڈہاکزم میں مزید شدت پیدا ہو گئی جو شروع ہی سے ضیاء حکومت کا ایک خاصہ تھا کہ انتخابات کا التوا اچانک ہوتا رہا اور ایک مستحکم سیاسی نظام کی عدم موجودگی میں سارے امور عارضی بنیادوں پر چلائے گئے چنانچہ اس عرصے میں اسلامائزیشن کے سلسلے میں بھی کوئی خاص کام نہیں ہوا ۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۸۴ کو صدر ضیاء نے اپنی اسلامی پالیسیوں اور بحالی جمہوریت کے حق میں ایک ریفرنڈم کروا کر اپنے اپ کو اگلے پانچ سال کے لئے منتخب قرار دے لیا ۔ ان کے مخالفین اس ریفرنڈم کو جمہوریت کا بد ترین مظاہرہ قرار دیتے ہیں ۔ ۲۵ فروری ۱۹۸۵ کو قومی اور ۲۸ فروری کو صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے ۔ ۲ مارچ ۱۹۸۵ کو صدر نے ۱۹۷۳ کے دستور میں ترامیم کر کے اسے مرحلہ وار بحال کرنے کا اعلان کر دیا ، ان ترامیم میں جہاں سیاسی طور پر اہم بات یہ تھی کہ توازن برقرار رکھنے کے نام پر صدر کو کافی اختیارات دیئے گئے تھے وہاں اسلامی نقطۂ نظر سے یہ بات اہم تھی کہ اس قرارداد مقاصد کو آئین کا عملی حصہ بنا دیا گیا جو اس سے پہلے ہر آئین کے دیباچے کے طور پر رکھی جاتی رہی تھی چونکہ یہ آئین کی عملی شقوں کا حصہ نہ تھی اس لئے اس کی بناء پر عدالتی کاروائی نہ ہو سکتی تھی ۔ پھر سینٹ کے انتخابات کروائے گئے ۔ ۲۰ مارچ کو اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا اور ۲۳ مارچ کو مسلم لیگی رہنما محمد خان جونیجو نے بطور وزیراعظم حلف اٹھایا اور منتخب سول حکومت کے طور پر کام شروع کر دیا ۔

جزءدوم :

مسلم لیگی وزارت کا عرصہ

(مارچ ۱۹۸۵ تا مئی ۱۹۸۸)

غیر جماعتی انتخابات کے نتیجے میں وجود میں آنے والی اسمبلی میں اگرچہ کچھ نوجوان نئے چہرے بھی موجود تھے لیکن اکثریت انہی سرمایہ داروں اور جاگیردار گھرانوں کے افراد کی تھی جو ماضی میں حکمران رہے تھے ، اسمبلی میں سندھ سے تعلق رکھنے والے ایک دھیمے مزاج کے مسلم لیگی جاگیردار (محمد خان جونیجو) کو وزارت عظمیٰ سونپی گئی ۔ اکتوبر میں قومی اسمبلی اور سینٹ نے آٹھواں ترمیمی بل منظور کیا جس میں مارشل لاء کے تمام احکام ، اقدامات اور ضوابط کو تحفظ فراہم کیا گیا تھا ، اسمبلی میں آزاد اور اسلامی گروپ نے آئین میں اس طرح من مانی ترامیم کی مزاحمت کی اور نتیجے کے طور پر یہ طے ہوا کہ آئین میں آٹھویں ترمیم کے بعد اسلامائزیشن کے لئے ایک نویں ترمیم پیش کر دی جائے گی ، اپوزیشن کے اصرار پر اس وعدے کو پورا کرنے کے لئے ایک قرارداد بھی اسمبلی میں منظور کروالی گئی ۔ (متن کے لئے ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر ۱)

صدر ضیاء نے ۳۰ دسمبر ۱۹۸۵ کو ملک سے مارشل لاء اٹھانے کا اعلان کر دیا اور آئین مکمل طور پر بحال کر دیا گیا چونکہ ایوان کو کنٹرول کرنے میں دقت پیش آرہی تھی اس لئے پولٹیکل پارٹیز ایکٹ میں ترمیم کر دی گئی اور وزیر اعظم نے مسلم لیگ کو بحال کر لیا تاکہ اسمبلی کو نظم و ضبط سے چلایا جا سکے ۔

پرائیویٹ شریعت بل : ۱۳ جولائی ۱۹۸۵ کو سینٹ میں دو ممبروں قاضی عبداللطیف اور مولانا سمیع الحق (جمعیت علماء اسلام درخواستی گروپ) نے ایک پرائیویٹ شریعت بل پیش کیا (متن کے لئے ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر ۲) ۔ بل سینٹ کی قانونی اور پارلیمانی امور کی سٹینڈنگ کمیٹی کو بھیج دیا گیا ۔ کمیٹی تین مہینے سے زائد عرصے تک اس بل کو لئے بیٹھی رہی اور اس کے باوجود اس نے سینٹ کو کوئی رپورٹ پیش نہیں کی حالانکہ سینٹ کے ضوابط کار کے مطابق اس کے پاس جو بل بھیجا جائے اس کی رپورٹ اسے معمولاً ایک [illegible] مہینے کے اند[illegible] پیش کر دینی چاہیئے ۔ سینٹ نے

۲۶ اکتوبر ۱۹۸۵ کو اپنے اجلاس میں سٹینڈنگ کمیٹی کو مزید وقت دینے سے انکار کر دیا اور ضوابط کے مطابق ایک سلیکٹ کمیٹی مقرر کی اور اسے پندرہ دن کے اندر اندر اپنی رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت کی ۔ سلیکٹ کمیٹی نے اپنی رپورٹ متفقہ طور پر معینہ وقت کے اندر سینٹ کو پیش کر دی ۔ جب یہ رپورٹ سینٹ میں زیر غور آئی تو یہ فیصلہ ہوا کہ رائے عامہ جانتے کے لئے اس کو مشتہر کر دیا جائے چنانچہ عوام سے کہا گیا کہ وہ ۲۵ اپریل ۱۹۸۶ تک اس کے بارے میں اپنی تجاویز سینٹ سیکرٹریٹ کو بھجوا دیں تقریباً ۱۴ لاکھ آراء سینٹ کو بھجوائی گئیں جن میں ۹۹٪ اس کے حق میں تھیں لیکن چونکہ مسلم لیگی حکومت نہیں چاہتی تھی کہ بل پاس ہو اور سینٹ میں اسے بھاری اکثریت حاصل تھی لہذا اس نے ایک اور کمیٹی بنا دی جو موصول شدہ آراء پر مزید غور کرتی ، سینٹ میں مختصر اسلامی گروپ جو اس سارے عرصے میں حکومتی مزاحمت اور اس کے تاخیری حربوں کے خلاف جدوجہد کرتا رہا تھا ، اس نے بطور احتجاج اس کمیٹی کا بائیکاٹ کر دیا چنانچہ یہ شریعت بل تادم تحریر اپریل ۱۹۸۹ء سینٹ میں معلق ہے ۔

مسلم لیگی حکومت اس سارے عرصے میں پرائیویٹ شریعت بل کو پاس کرنے میں لیت و لعل سے کام لیتی رہی ، اسلامی جماعتوں کو مذاکرات میں الجھاتی رہی ، وزارت مذہبی امور کے انچارج وزراء بدلتے رہے لیکن اس بل کو منظور کروانے میں اس نے کوئی دلچسپی نہ لی ، وہ ایک بے ضرر قسم کا بل پاس کروانا چاہتی تھی جب کہ دینی عناصر اسے موثر بنائے رکھنے پر مصر تھے ۔ اس عرصے میں یہ بل ترامیم کے کئی مراحل سے گزرا ، جب اسے اسلامی نظریاتی کونسل میں بھجوایا گیا تو اس نے کئی ترامیم تجاویز کیں ، اس دوران یہ واضح ہو چکا تھا کہ مذہبی جماعتیں بھی اس پر متحد نہ تھیں کیونکہ جمعیت علماء اسلام (درخواستی گروپ) کو یہ بل سینیٹ میں بغیر کسی تیاری کے پیش کر دینا پڑا تھا اس لئے وہ دوسرے دینی عناصر سے پیشگی مشورہ نہ کر سکی تھی ، اب اس پر سارے دینی عناصر نے مل کر غور کیا اور لاہور کی جامعہ نعیمیہ میں ایک مشترکہ اجلاس میں اس میں ترمیمات کی منظوری دے دی گئی (تبدیل شدہ شریعت بل کے متن کے لئے ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر۳) اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ جب بل سینیٹ میں زیر غور آئے گا تو یہ متفقہ ترامیم اس میں شامل کر دی جائیں گی ، چنانچہ جب بل سینیٹ میں زیر غور آیا تو یہ ترامیم پیش کر دی گئیں ، بل کو غیر موثر بنانے کے لئے حکومتی حلقوں نے بھی ترامیم پیش کیں لیکن چونکہ حکومت کا ارادہ اس بل کو پاس کرنے کا نہ تھا اس لئے اس نے آئین میں نواں ترمیمی ایکٹ اسی دوران 23 دسمبر 1985 کو سینیٹ میں پیش کر دیا (ملاحظہ ہو ایکٹ کے متن کے لئے ضمیمہ نمبر۴) اور چونکہ

حکومت شریعت بل کی کاٹ کے طور پر ، یہ تاثر بھی دینا چاہتی تھی کہ وہ شریعت نافذ کرنے میں مخلص ہے لہٰذا اس نے یہ ایکٹ 8 جولائی 1986 کو سینیٹ سے پاس بھی کروالیا ۔ تقابلی مطالعے کے لئے ملاحظہ ہو پرائیویٹ شریعت بل (علماء کی طرف سے ترمیم شدہ) اور آئین کے نویں ترمیمی ایکٹ کا ایک موازنہ :

۱ ۔ نویں ترمیمی ایکٹ میں وفاقی شرعی عدالت کے اختیارات میں محدود توسیع کی گئی ہے ، دستور کو اس کے حیطۂ عمل سے باہر رکھا گیا ہے اور مالیات کے سلسلے میں اسے فیصلے کرنے کا اختیار نہیں بلکہ معاشی ماہرین کے تعاون سے محض سفارشات پیش کرنے کا اختیار دیا گیا ہے اور وہ بھی ایسی سفارشات جو سابقہ تاریخوں سے نافذ نہیں ہو سکتیں اس کے مقابلے میں شریعت بل یہ کہتا ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کے حیطۂ اختیار پر کوئی پابندی نہیں ہونی چاہئے اور وہ آئین اور مالی امور سمیت جس چیز کو چاہے غیر اسلامی قرار دے سکتی ہے ۔

۲ ۔ شریعت بل یہ کہتا ہے کہ شریعت قرآن و سنت ہے اور یہی ملک کا بالاتر قانون ہے ۔ عدالتیں اس امر کی پابند ہوں گی کہ وہ صرف شریعت کے مطابق ہی فیصلے کریں اور ان کا ہر وہ فیصلہ قابل تنسیخ ہو گا جو شریعت کے مطابق نہ ہو ۔ یہ بل عدلیہ مقننہ اور انتظامیہ تینوں پر یہ پابندی لگاتا ہے کہ وہ شریعت کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کریں گی اور اگر کریں گی تو مستوجب سزا ہوں گی ۔ اس کے برعکس نویں آئینی ترمیم یہ کہتی ہے کہ اسلام کے احکام جیسا کہ قرآن و سنت سے ماخوذ ہوں ملک کا بالاتر قانون اور رہنمائی کا ماخذ ہوں گے اور پارلیمنٹ و صوبائی اسمبلیوں کے وضع کردہ قوانین کے ذریعے نافذ ہوں گے ۔ گویا بالاتر شریعت نہیں بلکہ قومی اسمبلی ہے اور قوانین وہ نہیں چلیں گے جو قرآن و سنت میں منصوص ہیں بلکہ وہ معتبر ہوں گے جو قرآن و سنت سے اخذ کر کے اسمبلیاں بنائیں گی ۔

۳ ۔ شریعت بل میں اس امر کا اہتمام کیا گیا ہے کہ ملک کا عدالتی نظام اسلامی بنیادوں پر استوار ہو اس کے لئے کہا گیا ہے کہ علماء کو عدالتوں میں جج مقرر کیا جائے گا ، وہ بطور وکیل پریکٹس کر سکیں گے ، موجودہ عدالتی اہلکاروں اور ججوں کی اسلامی شریعت میں تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے گا اور قانون کی تعلیم کو اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے گا ، نویں ترمیم میں ایسی کوئی چیز نہیں ۔

۴ - اسی طرح شریعت بل میں سوسائٹی کی اسلامائزیشن کے لئے کئی اقدامات تجویز کئے گئے ہیں مثلاً یہ کہ پریس اور ذرائع ابلاغ کے کردار کو اسلامی بنایا جائے گا - خلافِ شریعت کاروبار کرنا اور حرام طریقوں سے دولت کمانا ممنوع ہو گا اور اس کی خلاف ورزی مستوجب سزا ہو گی - بنیادی حقوق کے خلاف کوئی حکم نہیں دیا جا سکے گا اور عمال حکومت بشمول صدر مملکت قانون سے بالاتر نہ ہوں گے جب کہ نویں ترمیم میں ان چیزوں کا کوئی ذکر نہیں -

۵ - اس کے برعکس شریعت بل کی کمزوری یہ ہے کہ یہ محض ایک بل ہے اور کوئی بل دستور کے خلاف نہیں ہو سکتا ، اگر یہ بل پاس بھی ہو جائے تو اس کا عملاً کوئی فائدہ نہ ہو گا جب تک دستور کو اس کے مقتضیات کے مطابق تبدیل نہ کروا لیا جائے اور دستور کو تبدیل کروانا ظاہر ہے شریعت بل پاس کروانے سے زیادہ مشکل ہے لہذا یہ بل اگر آئینی ترمیم کی صورت میں ہوتا تو اس کا کچھ عملی فائدہ بھی ہوتا - نویں ترمیم اگرچہ اس بل کے مقابلے میں ہمیں بہت کچھ نہیں دیتی لیکن بہر حال یہ آئینی ترمیم ہے بل نہیں -

کچھ ایسا ہی حال ان "ترمیمات کا ہے جو سرکاری ممبران نے پرائیویٹ شریعت بل میں پیش کی ہیں اگر یہ ترامیم منظور ہو جاتی ہیں تو گویا یہ ایک نیا حکومتی شریعت بل وجود میں آجائے گا - ان ترامیم میں کہا گیا ہے کہ شریعت سے مراد اسلام کے وہ تمام اصول ہیں جو قرآن و سنت میں درج ہیں (گویا حجت قرآن و سنت نہیں صرف اس کے اصول ہیں تاکہ ان کی من مانی تشریح کی جا سکے) - اسی طرح ان ترامیم میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی مسئلہ عدالت زیر بحث میں پیش ہو اور یہ سوال اٹھ کھڑا ہو کہ متعلقہ قانون غیر اسلامی ہے تو مسئلہ وفاقی شرعی عدالت میں بھجوا دیا جائے گا لیکن مذکورہ عدالت اس کا فیصلہ رائج الوقت قانون کے تحت کر دے گی اور شرعی عدالت کے فیصلے کا انتظار نہیں کرے گی - اور سب سے مضحکہ خیز بات جو ان ترامیم میں کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہر فقہ کے پیروکاروں کے لئے شریعت ان کی فقہ کے مطابق ہو گی اس طرح ان ترامیم نے ان فقہوں کو شریعت بنا دیا ہے حالانکہ کوئی فقہ بھی شریعت نہیں ہوتی ، طعنہ مولویوں کو قدامت پرستی کا دیا جاتا ہے اور خود یہ حالت کہ جتنی فقہیں ہیں اتنی ہی شریعتیں بنائی جا رہی ہیں اور ہر فقہ کو شریعت قرار دیا جا رہا ہے -

شریعت بل پاس کروانے کے لئے دینی عناصر نے باہم متحد ہو کر ایک "متحدہ شریعت محاذ" بنا لیا تھا جس میں سارے دینی نقطہ ہائے نظر کے لوگ شامل تھے - تاہم یہ حادثہ بھی اس

ملک کی تاریخ میں پہلی بار ہوا کہ بعض دینی جماعتوں نے نہ صرف یہ کہ شریعت بل کی حمایت نہ کی بلکہ اس کی پر جوش مخالفت کی ، اس کے خلاف جلوس نکالے اور جلسے کئے ۔ بظاہر اس مخالفت کے دو سبب نظر آتے ہیں ، ایک ان کی آپس کی مسابقت بلکہ اختلافات اور دشمنیاں مثلاً اگر ایک اہلحدیث گروپ نے شریعت بل کی حمایت کر دی تو اس کے مخالف اہل حدیث گروپ نے بل کی مخالفت شروع کر دی کہ یہ بل تو سراسر غیر اسلامی ہے (گویا ان کو اگر پہلے متحدہ شریعت محاذ میں شامل کر لیا جاتا یا دوسرے حریف گروپ کو نکال کر ان کو شامل کر لیا جاتا تو وہ شریعت بل کی مخالفت ختم کر دیتے) ۔ اسی طرح جمعیت علماء اسلام (فضل الرحمان گروپ) کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بل اس کے مخالف دھڑے نے پیش کیا تھا) ۔ دوسرا سبب بعض دینی گروپوں کا ہر قیمت پر صدر ضیاء کی مخالفت کرنے کا وطیرہ تھا جس کے اصل اسباب سیاسی تھے مثلاً جمعیت علماء اسلام کا جو گروپ ایم آر ڈی میں تھا اس نے اول دن سے بغیر کسی تحفظ کے شریعت بل کی مخالفت اس زعم میں کی کہ شریعت بل کو بالواسطہ طور پر صدر ضیاء کی حمایت حاصل تھی اور ان کی رائے میں وہ اسے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کر رہے تھے تاکہ لولی لنگڑی اسمبلی اور سیاسی اداروں کو ناکام ثابت کر کے اپنے اقتدار کو طول دے سکیں ۔ یہ مخالفت خواہ اس کے اسباب کچھ بھی ہوں ہمارے نزدیک بہرحال ایک بڑا حادثہ تھی اور اس سے دینی کاز اور ملک کے اسلامی مستقبل کو بہت ٹھیس پہنچی ۔ پھر اس "متحدہ شریعت محاذ" کی بھی نااتفاقی اور کمزوری تھی کہ اس نے یکسو ہو کر بل کی کامیابی کے لئے پوری کوشش نہیں کی اگرچہ جلسے بھی کئے گئے ، جلوس بھی نکالے گئے اسمبلی کا گھیراؤ بھی ہوا ، اسمبلیوں سے استعفٰی کی دھمکیاں بھی دی گئیں ، لیکن اس جدوجہد کو کسی نتیجے پر پہنچائے بغیر چھوڑ دیا گیا ۔ غالباً یہ بھی غلط نہیں کہ لیگی حکومت کے مقابلے میں انہیں صدر ضیاء کی خاموش اور بالواسطہ حمایت حاصل تھی ، صدر ضیاء وقتاً فوقتاً لیگی حکومت سے یہ کہتے رہے کہ وہ اسلامائزیشن کی طرف توجہ دے ، اپریل ۱۹۸۸ میں انہوں نے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں حکومت پر اس سلسلے میں سہل انگاری سے کام لینے پر خاصی تنقید بھی کی اور جب انہوں نے ۲۹ مئی کو قومی اسمبلی اور کابینہ کو توڑ دیا تو اس کی ناکامی کے جو اسباب گنوائے اس میں دیگر باتوں کے علاوہ لیگی حکومت کے اسلامائزیشن کے لئے کام نہ کرنے کو بھی اس کی وجہ جواز قرار دیا ۔

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ پاکستان میں سیاسی حکمران طبقہ تین عناصر پر مشتمل ہے ، جاگیردار ، سرمایہ دار اور بیوروکریٹ اور یہ تینوں طبقے اپنے مزاج اور تربیت کے لحاظ سے

کسی حقیقی اسلامی تبدیلی کے حق میں نہیں ہیں ۔ مسلم لیگ ان کے لئے بہترین پلیٹ فارم ہے کیوں کہ مسلم لیگ کو اس ملک کی خالق جماعت ہونے کا اعزاز حاصل ہے ۔ یہ جماعت اپنی تاریخ اور مزاج کے لحاظ سے نہ تو بائیں بازو کی جماعت ہے اور نہ سیکولر بلکہ یہ ایک قوم پرست مسلم جماعت ہے جو دینی رجحان کی حمایت کرتی ہے تاہم جیسا کہ قیام پاکستان کے بعد کی چالیس سالہ تاریخ گواہ ہے یہ جماعت ، اسلامی کاز کیلئے مخلص اور پرجوش نہیں ہے ۔ یہ زبانی کلامی اسلامی کاز کی حمایت کرتی ہے ، اسلام کا نام لیتی ہے ، دباؤ پڑے تو چھوٹے موٹے اقدام بھی کر لیتی ہے لیکن بس وقت گذاری کی خاطر ، اپنی حکومت کے دوام کے لئے ، اس سے بڑھ کر یہ توقع اس سے نہیں کی جا سکتی کہ اسلامائزیشن کے حق میں وہ کوئی ایسا اقدام کرے جس سے معاشرے میں کوئی حقیقی تبدیلی واقع ہو ، کیوں کہ اگر ایسا ہو تو اس کے مفادات پر ضرب پڑے گی اور مقتدر طبقے (جاگیردار ، سرمایہ دار اور بیوروکریٹ ؛ جن سے مل کر مسلم لیگ بنی ہے اور ہر حکومت بنتی ہے خواہ وہ کسی بھی پارٹی کی ہو) کبھی بھی اپنے مفادات پر آنچ نہیں آنے دیں گے ۔ مسلم لیگی حکومت کی ، پاکستان بننے کے بعد ، پہلے دس سالوں میں بھی یہی پالیسی تھی اور بعد میں جب ضیاء کی وجہ سے لیگی وزارت کو کام کرنے کا موقع ملا تو پھر بھی اس کی یہی پالیسی تھی کہ اسلامائزیشن کی مخالفت کی ضرورت نہیں لیکن اس کے حق میں بھی عملاً کچھ نہیں ہونا چاہئے ۔ مذاکرات کرو ، جوڑ توڑ کرو ، وقت گزارو اور اگر اسلام کے حق میں قانون سازی کرنا ہی پڑے تو وہ اس طریقے سے کرو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے ، قانون اتنا بے جان اور پھسپھسا بناؤ کہ کسی حقیقی تبدیلی کی راہ ہموار نہ ہو سکے ۔ شریعت بل کی مخالفت اور نویں آئینی ترمیم کی منظوری ہمارے دعووں پر شاہد عادل ہیں ۔

جزءسوم

صدرضیاء کانگران حکومت کاعرصہ

(۲۹ مئی تا ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء)

جنرل ضیاء نے اپنے آئینی اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے ۲۹ مئی ۱۹۸۸ کو اچانک مسلم لیگی وزارت کو ختم کر دیا اور اسمبلی و کابینہ توڑ دی گئیں تاہم سینٹ کو برقرار رکھا گیا اور آئین نہیں توڑا گیا۔ اگرچہ اس برخواستگی کی زیادہ تر وجوہ سیاسی تھیں (جن سے ہمیں یہاں بحث نہیں) لیکن جنرل ضیاء نے وضاحت سے کہا کہ اس کی ایک وجہ جونیجو حکومت کی اسلامائزیشن میں عدم دلچسپی بھی تھی جو کہ ایک معلوم حقیقت تھی۔

اگرچہ جنرل ضیاء نے نگران حکومت کے طور پر کابینہ بنائی لیکن اس میں وزیراعظم کسی کو نہیں رکھا اور ملکی انتظام کی دیکھ بھال دوبارہ خود شروع کر دی، ان پر دباؤ تھا کہ وہ آئین کے مطابق ۹۰ دن کے اندر اندر انتخابات کروانے کی تاریخ دیں لیکن وہ اس سے پہلو تہی کرتے رہے۔ اس کے برعکس انہوں نے اسلامائزیشن کے عمل کو تیز تر کر دیا انہوں نے اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر ہالیپوتا کی زیر صدارت ایک کمیٹی بنائی جس نے ایک شریعت آرڈیننس کا مسودہ تیار کر لیا، پھر اس مسودے کو مختلف مکتبہ ہائے فکر کے علماء اور اسلامی سکالرز کی ایک بڑی کمیٹی کے سامنے رکھا گیا۔ اس کمیٹی نے صدر ضیاء کی سربراہی اور موجودگی میں مسلسل کام کیا اور ایک متفقہ مسودہ منظور کر لیا اور ۱۵ جون ۱۹۸۸ کو نفاذ شریعت آرڈیننس ۱۹۸۸ جاری کر دیا گیا (ملاحظہ ہو متن کے لئے ضمیمہ نمبر ۵)

اس آرڈیننس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ اس آرڈیننس نے اس امر کی مزید توثیق کر دی کہ قرارداد مقاصد آئین کا ایک عملی حصہ ہے اور اس کی بنیاد پر عدالتی فیصلے کئے جا سکتے ہیں۔

۲۔ اس آرڈیننس نے یہ طے کر دیا کہ شریعت قرآن و سنت ہی ہے۔ وہ ملکی قانون کا بالاتر ماخذ ہے اور ریاستی میں پالیسی سازی کے لئے ہدایت کا درجہ رکھتی ہے۔

۳ ۔ اس آرڈیننس نے ملک کے عدالتی نظام کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کے لئے کئی اقدامات کئے ۔ اگر کسی عدالت میں یہ سوال پیدا ہو کہ کوئی قانون شریعت کے مطابق ہے یا نہیں تو اسے وفاقی شرعی عدالت کو بھیجا جائے گا ، جو امور اس کے حیطۂ اختیار سے باہر ہیں ان کے لئے ہائیکورٹ سے رجوع کیا جائے گا ، ان ہائی کورٹوں کی اسلامی رہنمائی کے لئے مفتیوں کا تقرر کیا جائے گا ، یہ عدالتیں دو مہینوں کے اندر اندر فیصلہ کرنے کی پابند ہوں گی ۔ علاوہ ازیں اس آرڈیننس میں کہا گیا ہے کہ علماء کا بطور جج تقرر ہو سکے گا ، وہ بطور وکیل کام کر سکیں گے اور عدلیہ کے موجودہ ارکان کی شریعت میں تربیت کا اہتمام کیا جائے گا ۔

۴ ۔ اس آرڈیننس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ملک کے تعلیمی اور معاشی نظاموں کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے لئے صدر آرڈیننس کے اجراء کے ایک ماہ کے اندر اندر کمیشن قائم کرے گا جو ایک سال کے اندر صدر کو رپورٹ پیش کریں گے اور متعلقہ شعبوں میں اسلامائزیشن کے پروگراموں کی نگرانی بھی کریں گے ۔

۵ ۔ جنرل اسلامائزیشن کے لئے اس آرڈیننس میں یہ کہا گیا ہے کہ پریس اور ذرائع ابلاغ اسلامی اقدار کو فروغ دینے کے لئے کام کریں گے ۔

نفاذ شریعت آرڈیننس کی کمزوریاں (بموازنہ پرائیویٹ شریعت بل)

۱ ۔ اسمبلی کی غیر موجودگی میں چونکہ صدر تنہا دستور میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا اس لئے صدر کی یہ مجبوری تھی کہ دستوری حدود کے اندر رہتے ہوئے قانونی اقدام کریں لہذا یہ آرڈیننس دستور کے تحت جاری کیا گیا ہے اور اس میں وفاقی شرعی عدالت کے اختیارات وغیرہ کو نہیں چھیڑا گیا ۔

۱ ۔ اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ انتظامیہ (بشمول صدر مملکت) قانون کے سامنے جواب دہ ہوگی (حالانکہ یہ بات اس مسودے میں موجود تھی جو بالیپوتہ کمیٹی اور بعد میں بڑی کمیٹی نے پاس کئے تھے)

۳ ۔ اس میں صراحت سے یہ نہیں کہا گیا کہ عدالتیں شریعت کے مطابق فیصلے کرنے کی پابند ہوں گی اور احکام شریعت کے خلاف ان کا ہر فیصلہ قابل تنسیخ ہو گا جیسا کہ شریعت بل میں کہا گیا ہے ۔

۴ ۔ اس میں بنیادی حقوق کے تحفظ اور حرام آمدنی کے خلاف بھی کچھ نہیں کہا گیا اور نہ ہی یہ کہا گیا ہے کہ انتظامیہ ، عدلیہ اور مقننہ تینوں شرعی احکام کی پابند ہوں گی یا ان کی خلاف ورزی مستوجب سزا ہوگی ۔

۵ ۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس میں یہ تو کہا گیا ہے کہ شریعت قانون کا اعلیٰ ترین ماخذ ہوگی لیکن یہ نہیں کہا گیا کہ یہ ملک کا بالاترین قانون بھی ہوگی ۔

اس شریعت آرڈیننس کی عام لوگوں اور غیر سیاسی رجحان رکھنے والے دینی عناصر نے حمایت کی لیکن ان دینی جماعتوں نے جو سیاسی جماعتوں کے طور پر بھی کام کرتی ہیں اس آرڈیننس کی سخت مخالفت کی ، بعض نے تو اسے 'نفاذ شریعت آرڈیننس' کی بجائے 'انسداد شریعت' آرڈیننس تک کہہ دیا ، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی یہ مخالفت محض سیاسی بنیادوں پر تھی ۔ اس میں شک نہیں کہ آرڈیننس میں کمزوریاں تھیں ، شریعت کو ملک کا بالاتر قانون قرار دینے کی بجائے اسے عام قوانین کا ماخذ قرار دیا گیا تھا ، انتظامیہ کو قانون کی بالادستی سے باہر رکھا گیا تھا اور چونکہ یہ قانون آئین کی کسی دفعہ کے خلاف نہ جا سکتا تھا لہذا وفاقی شرعی عدالت کے اختیارات کو بھی نہ بڑھایا جا سکا لیکن اس طرح کی خامیوں کے علی الرغم بہرحال یہ اسلامائزیشن کی طرف ایک اور اہم قدم تھا ، اس نے کئی رکاوٹوں کو دور کیا تھا اور کئی نئے راستے کھولے تھے ، یہ اتنا موثر نہ سہی جتنا اسے ہونا چاہئے تھا لیکن بہرحال اس کی مخالفت کا کوئی جواز نہ تھا ۔ دینی سیاسی جماعتوں نے اس کی مخالفت محض سیاسی نقطۂ نظر سے کی اور ہم اسے ملک و ملت کی بدقسمتی سمجھتے ہیں کہ سیاست اور سیاسی مفادات اہل دین پر اتنے غالب آ جائیں کہ وہ دینی مفادات کو بھی سیاسی پیمانے سے ناپنا شروع کر دیں ۔ دین میں سیاست ضرور ہے اور ہونی چاہئے لیکن بدقسمتی سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری دینی سیاسی جماعتوں نے سیاست ہی کو اپنا دین بنا لیا ہے اور وہ ہر چیز کو اسی معیار پر ناپتی تولتی ہیں۔ شریعت بل کے بعد جس طرح سیاسی دینی عناصر نے نفاذ شریعت آرڈیننس کی مخالفت کی ہے اس نے اس لحاظ سے ملک و ملت کے دینی مستقبل کو سخت نقصان پہنچایا ہے کہ مستقبل میں اب شائد ہی کبھی یہ عناصر نفاذ شریعت کے لئے کی جانے والی کسی قانونی و آئینی کوشش پر متفق ہو سکیں ۔ جس طرح ان عناصر نے شریعت بل اور پھر نفاذ شریعت آرڈیننس کی مخالفت سیاسی بنیادوں پر کی ہے ، اس طرح تو ان میں سے کوئی جماعت اگر مستقبل میں برسر اقتدار آ جائے تو دوسرے دینی عناصر اسی بنیاد پر اس کی مخالفت کر سکیں گے ۔ یہ ایک ایسا راستہ کھول دیا گیا ہے جسے بند کرنا اب مشکل ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے یہ راستہ تباہی کا راستہ ہے ۔

علماء و شیوخ کانفرنس ۱۹۸۸ : جنرل ضیاء نے یہ دیکھتے ہوئے کہ سیاسی طور پر تو وہ تنہا تھے ہی اب (سیاسی) دینی عناصر نے ان کے پاس کردہ نفاذ شریعت آرڈیننس کو رد کر کے بلکہ اس کی مخالفت کر کے ان کے اقدامات کو بے وقعت کر دیا ہے ملک بھر کے علماء و شیوخ کو ۱۰ ، ۱۱ اگست ۱۹۸۸ کو اسلام آباد میں دو روزہ کانفرنس کے لئے بلوایا انہوں نے کانفرنس کی افتتاحی تقریر میں کہا کہ یہ ملک پارلیمانی جمہوریت کے لئے نہیں بلکہ اسلام اور اسلامی احکام کے نفاذ کے لئے بنایا گیا تھا ، انہوں نے کہا کہ ان کی کوشش کے باوجود سابقہ اسمبلیوں نے اسلامائزیشن کے لئے کوئی کام نہ کیا اور جب انہوں نے سینٹ میں شریعت بل پیش کرنا چاہا تو انہیں بتایا گیا کہ وہ فنی بنیادوں پر ایسا نہیں کر سکتے ۔ انہوں نے اپنی کوتاہیوں کو تسلیم کیا لیکن کہا کہ ایک فرد جتنا کام کر سکتا ہے انہوں نے بساط بھر کیا ہے ۔

مستقبل کے منصوبے : ۱۲ اگست ۱۹۸۸ کو ایوان صدر میں یوم پاکستان کی تقریب پر انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ۱۶ نومبر کے انتخابات سے پہلے وہ انشاءاللہ ملک میں اسلامی عدل و انصاف کا نظام نافذ کر دیں گے ، انہوں نے کہا کہ سستا اور فوری انصاف قوم کا حق ہے اور اسے اس حق سے محروم رکھنے کا کوئی جواز نہیں اور اس کے لئے وہ آئندہ حکومت کا انتظار نہیں کریں گے ، انہوں نے متعلقہ اداروں کو قاضی کورٹس اور قصاص و دیت کے قوانین پر کام تیز کرنے کا حکم دے رکھا تھا ۔

قدرت کا فیصلہ : لیکن قدرت اپنے فیصلے خود کرتی ہے ، ۱۷ اگست کی سہ پہر کو بہاولپور کے قریب ان کا جہاز اسلام دشمن قوتوں نے تباہ کروا دیا اور دو دن بعد ان کو عالمی اسلامی یونیورسٹی کی فیصل مسجد کے صحن میں سپرد خاک کر دیا گیا ۔ جس طرح لاکھوں لوگوں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ، ہاتھوں میں ان کی تصویریں اٹھائے ہوئے ، اللہ اکبر کے نعروں کی گونج میں ان کو رخصت کیا وہ اس چیز کا منہ بولتا ثبوت تھا کہ یہ قوم اپنے دین سے محبت رکھتی ہے اور یہ ہر اس فرد سے محبت کرتی ہے جو اس دین کا خادم اور پیروکار ہو اور جو شریعت کو نافذ کرنے کی کوشش کرے ۔ اگرچہ ہمارا معروضی مطالعہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ مرحوم صدر کے اقدامات ، قانون کی اسلامائزیشن کے سلسلے میں ٹھوس اور نتیجہ خیز نہ تھے ۔

فصل سوم:

پیپلز پارٹی کا دورِ ثانی (دسمبر 1988ء ۔)

جنرل ضیاء کی موت کے بعد سینٹ کے چیئرمین جناب غلام اسحاق خاں نے قائم مقام صدر کا عہدہ سنبھال لیا اور فوج اور عدلیہ کے مثبت فیصلوں اور مدد سے جماعتی بنیادوں پر انتخابات ۱۶ نومبر ۱۹۸۸ء کی مقررہ تاریخ کو ہو گئے ۔ ان انتخابات میں کسی جماعت کو واضح برتری حاصل نہ ہو سکی تاہم چونکہ پیپلز پارٹی نے مقابلتاً زیادہ ووٹ حاصل کئے تھے اور سندھ میں اسے مکمل فتح حاصل ہوئی تھی اس لئے صدر نے انہیں مرکز میں حکومت بنانے کی دعوت دی اس طرح بے نظیر بھٹو نے ۲ دسمبر ۱۹۸۸ء کو وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھایا ۔ صوبوں میں مخالف پارٹیوں کی یا مخلوط حکومتیں بن گئیں ۔

پیپلز پارٹی اپنی تاریخ اور مزاج کے لحاظ سے سیکولرزم، فاشزم اور بائیں بازو کے رجحانات رکھتی ہے اور اسلامائزیشن کے حق میں اس سے کسی ٹھوس کام کی توقع رکھنا فضول ہے چنانچہ اس نے جنرل ضیاء والے شریعت آرڈیننس کی توسیع نہ کی اور وہ زائد از میعاد ہو کر ۱۴ فروری ۱۹۸۹ء کو خود بخود ختم ہو گیا (گو صدر غلام اسحاق کی عبوری حکومت نے اس کی توسیع کر دی تھی)۔ اسی طرح حدود قوانین کے خلاف وزیر اعظم بے نظیر کے بیانات ریکارڈ پر موجود ہیں ۔ وزیر مذہبی امور نے زکوٰۃ و عشر کے قوانین کے خلاف ڈپلومیٹک قسم کے بیان دیئے ہیں اور پیپلز پارٹی کی حکومت نے ذرائع ابلاغ کو بائیں بازو کے اباحیت پسند ادیبوں کے تصرف میں دے دیا ہے، ملک میں امن و امان کی حالت خراب ہے اور نظریاتی اور تہذیبی خلفشار کے آثار پیدا ہو رہے ہیں ، اگرچہ پارلیمنٹ میں واضح برتری نہ رکھنے کی وجہ سے اور دیگر حالات کی بناء پر پیپلز پارٹی کی حکومت ابھی تک اسلام مخالف اقدامات کرنے میں محتاط ہے تاہم نظر یہی آتا ہے کہ سیاسی قوتوں نے اپنے ماضی سے کوئی خاص سبق نہیں سیکھا اور اگر حالات اسی رخ پر بڑھتے رہے تو بعید نہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا دے اور پیپلز پارٹی کے اقدامات کے نتیجے میں سیاسی قوتیں اس کے خلاف اکٹھی ہو جائیں اور پھر سیاسی تحریک چلے، مارشل لاء آجائے یا صدر مملکت کو ہنگامی حالات میں نئے انتخابات کروانے پڑیں ۔

سیاسی ضرورت کے تحت چونکہ مرکز میں مختلف گروہوں کی حمایت حاصل کرنا پیپلز پارٹی کی

مجبوری ہے اس لئے اس نے جمعیت علماء اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) سے حال ہی میں وعدہ کیا ہے کہ وہ ایوان میں نیا شریعت ایکٹ لائے گی، یہ تو مستقبل ہی بتائے گا کہ اس شریعت بل کی کیا شکل ہوگی اور اس پر کس طرح عمل درآمد ہو گا۔

حرفِ آخر

قرآن وسنت کی رو سے اسلام معروف مغربی مفہوم کے مطابق صرف ایک مذہب ہی نہیں بلکہ ایک مکمل نظام حیات ہے جو ساری انسانی زندگی کی صورت گری کرتا اور زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں ہدایات بہم پہچاتا ہے ۔ قانونی میدان میں اسلام نے تفصیلی احکامات صرف ان شعبوں میں دیئے ہیں جو انتہائی بنیادی نوعیت کے ہیں اور جن کے بغیر سوسائٹی کی بنیادیں نفاست ، پاکیزگی، اور عدل پر استوار نہیں کی جاسکتیں مثلاً اسلام نے انسانی جان کی حفاظت ، اس کی نسل ، مال ، عقل اور اس کے دین کی حفاظت کے لئے بھاری سزائیں مقرر کی ہیں ۔ یا پھر اسلام نے وہاں تفصیلی ہدایات دی ہیں جہاں اس نے محسوس کیا ہے کہ ایسی تفصیلات انسان اپنی محدود عقل اور تجربے کی بنیاد پر بہم نہیں پہنچا سکتا جیسے ذاتی زندگی کے مسائل میں نکاح ، طلاق اور وراثت وغیرہ کے مسائل ۔

ان دو طرح کے امور سے قطع نظر اسلام نے کسی شعبہ زندگی کے بارے میں مسلمانوں کو تفصیلی قانونی احکامات نہیں دیئے بلکہ صرف بنیادی اصولوں کے دینے تک اپنے آپ کو محدود رکھا ہے اور مسلمانوں کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ ان بنیادی اصولوں کی روشنی میں اپنی ضروریات کے مطابق تفصیلی قانون سازی کرتے رہیں ۔ مسلمان علماء اور ماہرینِ قانون نے اپنی محنت اور تدبر سے ماضی میں ہمیشہ ایسے تفصیلی قوانین تیار کئے ہیں جو ان کی عصری ضروریات بخوبی پوری کرتے رہے ہیں ۔ ان کی اس قیمتی اور گراں قدر جدوجہد کا تاریخی ریکارڈ ہمارے پاس آج بھی موجود ہے اور ہمارے لئے باعثِ فخر ہے ۔ پس اسلامی قانون اپنے مزاج ، نوعیت اور دائرۂ کار کے لحاظ سے دنیا کے دوسرے نظام ہائے قوانین کے مقابلے میں ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے ۔ بنیادی طور پر یہ وحی پر مبنی ایک ناقابلِ تغیر قانون ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے اجتہاد کی اجازت کی صورت میں نصوص قرآنی پر غور کرنے اور بدلے ہوئے حالات میں نئی تفصیلات طے کرنے کے لئے انسانی عقل و تدبر کے استعمال کی ایسی اجازت بھی دی ہے کہ یہ ہر زمانے میں قابلِ عمل رہا ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ کے لئے رہے گا ۔

جیسا کہ ابھی ذکر ہوا کہ اسلام مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو منضبط کرنے والا دین ہے لہٰذا یہ ایک ایسی سوسائٹی کا طالب ہے جہاں اس کے ماننے والے رضاکارانہ طور پر اپنی زندگیوں میں اس کے اصولوں پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوں اور یہ ایک ایسی ریاست کا بھی

طالب ہے جو اجتماعی زندگی کے متعلق اس کے احکام پر عمل درآمد کرے اور افراد کو اس کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے میں مدد دے ۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں نے ان علاقوں میں جہاں وہ اکثریت میں تھے ایک ایسے الگ وطن کا مطالبہ کیا جہاں وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گزار سکیں ۔ یہ مطالبہ اس شدت سے اٹھا کہ انگریز اور ہندو اس کو نظر انداز نہ کر سکے اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی مملکت دنیا کے نقشے پر ظہور پذیر ہوئی ۔ ان حالات میں یہ بالکل منطقی ہوتا اگر پاکستان کی حکومت ایسے ادارے وجود میں لاتی جو مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے میں مدد دیتے لیکن افسوس کہ عملاً ایسا نہ ہوا ۔ اس کے مختلف اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ ہے کہ حکمران طبقے شعوری یا لاشعوری طور پر مغربی تہذیب کی چکاچوند سے متاثر اور اس کے مادہ پرست سیکولر ڈھانچے کی برتری پر یقین رکھتے تھے لہٰذا پاکستان کے مختلف دساتیر میں جو اسلامی شقیں ہمیں نظر آتی ہیں وہ محض ایک دکھاوا ہیں اور صرف اسلامی گروپوں کے دباؤ کا نتیجہ ہیں ورنہ سنجیدگی سے کسی حکومت نے کبھی بھی پاکستان میں شریعت کے نفاذ کے لئے کوئی بڑی کوشش نہیں کی مزید برآں یہ کہ پاکستان بننے کے بعد جو قانونی اور عدالتی ڈھانچہ ہمیں ورثے میں ملا وہ اکثر و بیشتر انگریز کے کامن لاء کی بنیاد پر ہی استوار تھا ۔

اس نظریاتی اور سیاسی پس منظر میں بھٹو حکومت کے خلاف جو عوامی تحریک ابتداءً اس کی انتخابی دھاندلیوں کی وجہ سے چلی وہ پاکستان میں نظام مصطفٰے کے نفاذ کی تحریک کی صورت اختیار کر گئی اور جب ملک میں امن و امان کی حالت دگرگوں ہو گئی تو آرمی چیف آف سٹاف جنرل ضیاء الحق نے مداخلت کرتے ہوئے سیاسی حکومت کو برطرف کر کے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا یہ دیکھتے ہوئے کہ لوگ اسلامی نظام کے نفاذ کی شدید خواہش رکھتے ہیں انہوں نے اپنے آپ کو اسلام کے مخلص سپاہی کی حیثیت سے پیش کیا انہوں نے وفاقی شرعی عدالت ، وفاقی کونسل، اسلامی یونیورسٹی ، لاء کمیشن اور انصاری کمیشن جیسے ادارے قائم کئے اور اسلامی نظریاتی کونسل ، اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ اور وزارت مذہبی امور جیسے پہلے سے موجود اداروں کو ترقی دی تاکہ قانونی اور دستوری ڈھانچے کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالا جا سکے انہوں نے یہ کوشش بھی کی کہ نئی قانون سازی بھی شریعت کے مطابق ہو ۔ مذکورہ اداروں میں سے بعض (مثلاً اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت) نے اچھا کام کیا ۔ غالباً اس لئے کہ مناسب جگھوں پر مناسب آدمی موجود تھے ۔ جبکہ دوسرے اکثر ادارے کوئی خاص کام اسلامائزیشن کے حق میں نہ کر سکے ،

کمزور پلاننگ ، فرسودہ انتظامی ڈھانچے اور دوسرے بہت سے موانع کی وجہ سے ۔

جنرل ضیاء ، مختلف وجوہ کی بناء پر جن میں مارشل لاء کی شریعت پر بالادستی ، سیاسی عدم استحکام ، مذہبی حلقوں کا عدم تعاون، نوکر شاہی کا منفی رول اور مناسب افراد کی عدم فراہمی وغیرہ شامل ہیں ، اپنی بار بار کی کہی ہوئی باتوں پر بھی عمل درآمد نہیں کرا سکے یہی وجہ ہے کہ اسلامائزیشن کے اس عمل سے ایک عام آدمی کی زندگی پر کوئی مثبت اثر نہیں پڑا ۔

غالباً اس کے برعکس اس نے بعض دینی عناصر کو مایوسی میں مبتلا کر دیا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ جنرل ضیاء کے سطحی اور ادھورے اقدامات نے ملک میں اسلامی عمل کو نقصان پہنچایا ہے اور مستقبل قریب میں اسلامی نقطۂ نظر سے کسی بڑی تبدیلی کا راستہ بند کر دیا ہے ۔

جنرل ضیاء چونکہ ایک ایسا سیاسی ڈھانچہ نہ بنا سکے جو اسلامی تعلیمات اور عصر حاضر کے جدید جمہوری رجحانات پر مبنی ہوتا اور پاکستان کے مخصوص حالات میں قابل عمل بھی ہوتا لہذا اس کے نتیجے میں مغربی سیاسی مفاہیم پر مبنی ڈھانچے ہی کو انہیں قبول کرنا پڑا، غیر جماعتی انتخابات کے نتیجے میں مسلم لیگ کی حکومت بنی لیکن وہ ضیاء صاحب کے شریک اقتدار ہوتے ہوئے ان کی مرضی کے مطابق کام نہ کر سکی، جنرل ضیاء نے سوا تین سال کے اس تجربے کے بعد مسلم لیگی حکومت کو برخواست کر دیا اور نئے انتخابات کا اعلان کیا ، لیکن تقدیر نے انہیں مہلت نہ دی اور عام انتخابات سے پہلے ہی اسلام دشمن بین الاقوامی قوتوں نے غالباً مسئلہ افغانستان کے بارے میں ان کے دو ٹوک ، جرأت مندانہ اور اسلامی مؤقف کی وجہ سے ان کے جہاز کو تباہ کر کے انہیں ختم کر دیا ۔ سینٹ کے چیئرمین جناب غلام اسحاق خاں صاحب نے قائم مقام صدر کی حیثیت سے عدلیہ اور فوج کی مدد سے جماعتی انتخابات کروائے جس میں کوئی جماعت واضح برتری نہ حاصل کر سکی تاہم چونکہ پیپلز پارٹی نے مرکز میں مقابلتاً زیادہ ووٹ لئے تھے اور سندھ میں اسے مکمل کامیابی ہوئی تھی اس لئے مرکز میں پیپلز پارٹی کی حکومت بن گئی اور صوبوں میں دوسری جماعتوں کی یا مخلوط حکومتیں بنیں ۔

پیپلز پارٹی جس مخصوص فکری اور سیاسی پس منظر کی حامل ہے اس میں اس سے اسلامائزیشن کی حمایت کی توقع نہیں کی جا سکتی بلکہ پچھلے پانچ ماہ کے مختصر عرصے کی حکومت کے نتیجے ہی میں اس فکری اور تہذیبی خلفشار کے آثار نمایاں ہونے شروع ہو گئے ہیں جو بالآخر بھٹو صاحب کے زوال کا پیش خیمہ بنے تھے خدا کرے کہ تاریخ اپنے آپ کو نہ دہرائے اور سیاسی

قوتیں ماضی میں کی جانے والی غلطیوں سے سبق سیکھ لیں ۔

تاہم جو بات سورج کی طرح روشن اور واضح ہے وہ یہ ہے کہ کوئی قوم فضا میں زندہ نہیں رہ سکتی ، جب تک پاکستان کی ملت اسلامیہ اور اس کے کار پرداز ان اس حقیقت کا اچھی طرح ادراک نہیں کر لیتے کہ اس ملت کے پنپنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ وہ اسلام کے ابدی اصولوں پر، جن پر مسلمان ہونے کے ناطے وہ ایمان رکھتی ہے ، عمل کرے، منافقت اور دورنگی چھوڑ کر اس راستے پر یکسوئی سے چلے، افراد معاشرہ اپنی انفرادی زندگیوں میں اس دین حنیف کی تعلیمات پر عمل کریں اور اجتماعی زندگی میں ہم اپنے اداروں کی تشکیل و تعمیر اسلامی تعلیمات اور عصری تقاضوں کے مطابق کریں ۔ یہ ہمارے ایمان کا تقاضا بھی ہے اور عقل کا بھی ورنہ اللہ کا فیصلہ تو موجود ہی ہے کہ جو اس کے احکام پر عمل نہ کرے وہ مومن نہیں وہ ظالم ، فاسق اور کافر ہے اور دنیا و آخرت کی رسوائی اس کا مقدر ہے — اور اللہ کی یہ سنت بھی نہیں کہ وہ لوگوں کو زبردستی ہدایت دے ۔ اس کا فیصلہ ہمیں کرنا ہے کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلام کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں یا نہیں، اگر ہمارا فیصلہ اور ہمارا عمل ہمارے نظریات اور عقائد کے مطابق ہوا (کہ جذباتی اور لاشعوری طور پر مسلمان تو ہم ہیں ہی) تو کامیابی انشاء اللہ ہمارے قدم چومے گی، مسلمانوں کا عروج اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ پھر بہت دور کی بات نہیں لیکن اگر ہم نے منافقت اور کفر کا رویہ برقرار رکھا تو پھر ذلت و نکبت سے ہمیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی ۔ خدا کرے ہمارا فیصلہ ایسا ہو جو ہماری دنیا بھی سنوار دے اور آخرت بھی اور اصل کامیابی تو آخرت ہی کی کامیابی ہے ۔

حواشی

–Speechesandstatementsoflqbal,P-13

--SomeRecentSpeechesandWritingsofMr.Jinnah

–Laqat Ali Khan's address in the first Contitutional Assembly in support of Obejectives Resolutions See Debates of Constituent AssemblyofPakistan,Vol–V,P–3March7,1949.

۲ ۔ قرارداد مقاصد کے متن کے لئے دیکھئے ۔

Debates of Constituion Assembly of Pakistan Vol V , P-11, March 7, 1949

۳ ۔ ۲۲ نقاط کے متن کے لئے دیکھئے ۔

K. Ahmad, IslamicLawandConstitiution, P:332-336, Lahore, 1980

۴۔ بی پی سی رپورٹ ، تیسرا باب ۔ سیکشن ۴،۵،۶،۷

۵ ۔ دستوری سفارشات پر پاکستان کے علماء کا متفقہ تبصرہ اور ترمیمات ص ۱۲ ، (جو ماہنامہ چراغ راہ کراچی کے خصوصی سپلیمنٹ کے طور پر شائع ہوا) ۔ تین علماء نے اپنے اختلافی نوٹ میں البتہ کہا کہ مختلف مکتبہ ہائے فکر کے علماء پر مشتمل بورڈ ہونا چاہیے جس کی سفارشات پر عمل درآمد لازمی ہو ۔

۶ ۔ ڈاکٹر ایم اے رزاق ، پاکستان کا نظام حکومت و سیاست صفحہ ۲۳۷

۷ ۔ دستور ۱۹۵۶ جز ۱۲ آرٹیکل ۱۹۸

۸ ۔ دستور ۱۹۵۶ آرٹیکل ۱۹۸ (۳)

۹ ۔ A.K.Brohi, FudamentalLawofpakistan P–784

۱۰ ۔ دستور پاکستان ۱۹۶۲ء ، آرٹیکل ۱ (۱)

۱۱ ۔ Justice (Rtd) M. Munir, Comments on the Constitution of the IslamicRepublicofPakisan, Lahore P-63

۱۲ ۔ اس کمشن میں اسلامی قوانین سے واقفیت رکھنے والا صرف ایک ممبر تھا جو کمشن کے ارکان کے انداز دیکھ کر اس سے الگ ہوگیا ۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے :

Mohammad Najib Ullah Khan, Legislation in Conflict with FundamentalLaw, P-259

۱۳ ۔ ماہنامہ فکر و نظر اسلام آباد مارچ، اپریل ۱۹۸۳ء ا... شن پر اس خصوصی شمارے میں دیکھئے ڈاکٹر تنزیل الرحمن کا مضمون "اسلامی نظریاتی کونسل"۔

۱۴ ۔ دستور پاکستان آرٹیکل ۲

۱۵ ۔ دستور پاکستان آرٹیکل ۲۲۷

۱۶ ۔ دستور پاکستان آرٹیکل ۲۳۰ (۳) و (۴)

۱۷ ۔ دیکھئے فکر و نظر میں ڈاکٹر تنزیل الرحمن کا مضمون ص ۱۵۷

۱۸ ۔ Mehmood Un Nasir, Constitutional History of Pakistan, Lahore, P-146

۱۹ ۔ اس غرض کے لئے باقاعدہ آئین میں ترمیم کی گئی ۔ ملاحظہ ہو ۱۹۸۰ء کا صدارتی حکم نامہ نمبر ۲

۲۰ ۔ Dr. Tanzil Ur Rehman, Enoreement of Islamic Law – A New Approach P-10

۲۱ ۔ ماہنامہ فکر و نظر ، خصوصی شمارہ مارچ ، اپریل ۱۹۸۷ء میں دیکھئے ڈاکٹر تنزیل الرحمن کا مضمون قوانین کی اسلامائزیشن صفحہ ۱۹۹ ۔

۲۲ ۔ مفتی سیاح الدین کاکاخیل سے انٹرویو ۔ مورخہ ۲۹ اگست ۱۹۸۴

۲۳ ۔ Hazoor Bakhsh and M.I.T. chrawdhary Vs Islamic Republic of Pakistan, PLD 1981, Sc122

۲۴ ۔ Clause 203 (A+E) of the Constitutional (Amendment) Order 1980, (Presidential Order 1 of 1980)

۲۵ ۔ حکومت پاکستان نوٹیفیکیشن نمبر ۵-۷۷/(۱)/۷۹ ، مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۷۹ء

۲۶ ۔ روزنامہ جنگ کراچی ۲۵ دسمبر ۱۹۸۱ء

۲۷ ۔ عبوری دستوری آرڈر (چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا آرڈر I آف ۱۹۸۱)

۲۸ ۔ دی فیڈرل کونسل (مجلس شوریٰ) آرڈر ۱۹۸۱ء (پریزیڈنٹ آرڈر نمبر ۱۵ آف ۱۹۸۱ء)

۲۹ ۔ ملاحظہ ہو روزنامہ جسارت کراچی مورخہ ۹ ۔ اپریل ۱۹۸۴ء

۳۰ ۔ دی لاء کمشن آرڈیننس ۱۹۷۹ء (آرڈیننس XVI آف ۱۹۸۹ء)

۳۱ ۔ ملاحظہ ہو اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ نظام عدل پر صفحہ ۱۱۶

۳۲ ۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی تقریر سرگودھا بار میں ، رپورٹ روزنامہ جسارت کراچی مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۸۴ء

۳۳ ۔ پہلے علماء کنونشن کی رپورٹ مطبوعہ وزارت مذہبی امور صفحہ ۹

۳۴ ۔ مشائخ کانفرنس میں جنرل ضیاء کی افتتاحی تقریر ۔ رپورٹ مشائخ کانفرنس مطبوعہ وزارت مذہبی امور، اسلام آباد ، صفحہ ۱۷ ۔

۳۵ ۔ روزنامہ جسارت مورخہ ۲ فروری ۱۹۸۳ء اسلامائزیشن کانفرنس سے متعلق محمد صلاح الدین کی رپورٹ

۳۶ ۔ دوسرے علماء کنونشن کی رپورٹ مطبوعہ وزارت مذہبی امور صفحہ ۱۸۲

۳۷ ۔ مذکورہ رپورٹ صفحہ ۲۱۱

۳۸ ۔ صدر ضیاء کا قوم سے پہلا خطاب ، روزنامہ امروز لاہور مورخہ ۶ جولائی ۱۹۸۴ء

۳۹ ۔ اجتہاد کی شرائط اور دائرہ کار از ڈاکٹر سید عبداللہ روزنامہ جسارت کراچی مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۸۰ء

۴۰ ۔ مسلم لیگ کا دور حکومت از ڈاکٹر صفدر محمود صفحہ ۱۷۶

۴۱ ۔ Mohammad Shahryar Khan. National Reformation where to begin, Monthly 'Concept' Islamabad. June. 1984, P-20

۴۲ ۔ نوائے وقت مورخہ ۵ فروری ۱۹۸۲ء میں وفاقی شرعی عدالت کے (سابق) چیف جسٹس کا انٹرویو

۴۳ ۔ دیکھئے جسارت ۴ اپریل ۱۹۸۴ء کی رپورٹ

۴۴ ۔ روزنامہ جسارت کراچی مورخہ ۳ اپریل ۱۹۸۴ء

۴۵ ۔ مفتی محمد حسین نعیمی کا بیان روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۸۳ء

۴۶ ۔ جسارت یکم فروری ۱۹۸۳ء

۴۷ ۔ علماء کے متفقہ ۲۲ نقاط میں سے آرٹیکل نمبر ۹

۴۸ ۔ روزنامہ امن کراچی مورخہ ۲۸ اپریل ۱۹۸۳ء

۴۹ ۔ دیکھئے جنگ کراچی مورخہ ۷ نومبر ۱۹۸۴ء میں مولانا احترام الحق تھانوی کا بیان

۵۰ ۔ دوسرے علماء کنونشن میں صدر ضیاء کی افتتاحی تقریر مطبوعہ رپورٹ وزارت مذہبی امور ص ۱۶

۵۱ ۔ رپورٹ مطبوعہ وزارت مذہبی امور ص ۱۸ ۔

۵۲ ۔ روزنامہ جسارت کراچی مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۸۴ء

ضمیمہ ۱

قرآن و سنت کی بالادستی کے لیے

قومی اسمبلی کی متفقہ قرارداد

(۱۶ اکتوبر ۸۵ء کو یہ قرارداد قومی اسمبلی نے اپنے اجلاس میں حکومتی پارٹی اور آزاد گروپ کے درمیان ہونے والے معاہدے کے تحت متفقہ طور پر منظور کی ۔)

۱۔ قومی اسمبلی متفقہ طور پر یہ قرار داد منظور کرتی ہے کہ اس کے آئندہ اجلاس میں ایک نئے دستوری ترمیمی بل کے ذریعے درج ذیل دستوری ترامیم کی جائیں :

(الف) آرٹیکل نمبر ۲ میں اسلام پاکستان کا سرکاری مذہب ہے کے بعد اضافہ کیا جائے کہ قرآن و سنت ملک کے بالا ترین (سپریم) قانون اور پالیسی بنانے اور قانون سازی کے لیے اصل منبع ہوں گے

(ب) آرٹیکل نمبر ۲۰۳ (ج) میں ترمیم کی جائے تاکہ درج ذیل کو موثر بنایا جا سکے ۔

i ۔ قانون کی تعریف درج ذیل ہو گی :

قانون میں کوئی بھی رواج یا رسم جسے قانون کی طاقت حاصل ہو شامل ہے ، لیکن اس میں دستور شامل نہیں ہے ،،

ii ۔ جملہ کا بقیہ حصہ مسلم پرسنل لاء سے لے کر آخری لفظ تک حذف کر دیا جائے ۔

iii ۔ ایک وضاحتی شق کا اضافہ کیا جائے تاکہ مالیاتی بینکاری سے متعلق معاملات میں فیڈرل شریعت کورٹ متعلقہ ماہرین کے مشورے کے بعد متعین اقدامات اور ایک مقررہ مدت کی سفارش کرے گی جس مدت میں متعلقہ قانون ساز ادارے کو ضروری اقدامات کرنے ہوں گے تاکہ قانون کو اسلام کے ضابطوں کے مطابق بنایا جا سکے ۔

۲ ۔ مزید برآں قومی اسمبلی یہ قرار داد بھی منظور کرتی ہے کہ وزیر اعظم ایک کمیشن قائم کریں جو چھ ماہ کے اندر اندر پارلیمنٹ کو رپورٹ دے کہ اس قرار داد کے پیرا گراف نمبر ۱ اور دستور کے آرٹیکل نمبر ۲ اے کو پورا کرنے کے لیے دستور میں مزید کن ترامیم و تبدیلیوں کی ضرورت ہے ۔

۳۔ یہ کام ملک میں نفاذِ اسلام کے عمل کو تیز بنانے کے لیے اقدامات اور ذرائع بھی تجویز کرے گا اور پارلیمنٹ کو اس سمت میں ہونے والی پیش رفت سے بھی آگاہ کرے گا ۔

ضمیمہ ۳

سینٹ میں مولانا قاضی عبداللطیف اور مولانا سمیع الحق کے پیش کردہ

شریعت بل کا اصل متن

چونکہ قرار داد مقاصد کو جو کہ سابقہ دساتیر میں بطور تمہید کے رکھا گیا تھا۔ جناب صدر مملکت نے اپنے صدارتی اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کو دستور کا مستقل حصہ قرار دے دیا ہے ۔

اور چونکہ قرار داد مقاصد میں اس ملک کا حاکم اعلیٰ تشریعی اور حکومتی دونوں حیثیتوں سے رب العالمین خالق کائنات کو تسلیم کیا گیا ہے

اور چونکہ یہ ملک مسلمانوں کی عملی زندگی کو قرآن اور سنت کے مطابق ڈھالنے کے لیے معرض وجود میں لایا گیا ہے ۔

اور چونکہ اس ملک کے باشندوں کے ساتھ یہ عہد کیا گیا ہے کہ یہاں قرآن و سنت کا قانون زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی اور نافذ ہو گا ۔

اور چونکہ موجودہ ریفرنڈم اور انتخابات میں عوام نے صدر مملکت اور پارلیمنٹ کو شریعت کے عملی نفاذ کے لیے منتخب کیا ہے ۔

لہٰذا ایوان سینٹ اپنے آئینی اختیارات استعمال کرتے ہوئے حسب ذیل قانون وضع اور منظور کرتا ہے ۔

ابتدائیہ

(دفعہ نمبر ۱) تاریخ نفاذ اور حدود نفاذ (الف) یہ قانون نفاذ شریعت کے نام سے موسوم ہو گا ۔ (ب) یہ قانون منظوری کے مراحل طے کرنے کے بعد فوری طور پر نافذ ہو گا۔ (ج) یہ قانون اسلامی جمہوریہ پاکستان کے تمام علاقوں اور تمام باشندوں پر نافذ ہو گا البتہ غیر مسلم باشندوں کے شخصی معاملات اس سے مستثنیٰ ہوں گے ۔

شریعت کی قانونی تعریف

(دفعہ نمبر ۲) (الف) شریعت سے مراد دین کا وہ خاص طریقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے سے اپنے بندوں کے لیے مقرر کیا ہے۔

(ب) شرعی قوانین کا اصل ماخذ قرآن کریم اور سنت رسول ہے۔

(ج) اجماع امت کو قرآن اور سنت نے حجت قرار دیا ہے۔ اس لیے جو قانون اجماع امت سے ثابت اور ماخوذ ہو وہ بھی شریعت کا قانون ہے۔

(د) جو احکام امت کے معتمد اور مستند مجتہدین نے قرآن و سنت اور اجماع کے قواعد و ضوابط معینہ کے مطابق مستنبط کر کے مدون کئے ہیں وہ بھی شریعت ہی کے قوانین ہیں اس لیے کہ قیاس اور اجتہاد کو بشرطیکہ وہ قرآن و سنت اور اجماع کے خلاف نہ ہو قرآن اور سنت نے حجت قرار دیا ہے۔

شریعت کی بالادستی

(دفعہ نمبر ۳) مقننہ کوئی ایسا قانون یا قرارداد منظور نہیں کر سکے گی جو شریعت کے احکام کے خلاف ہو۔ اگر کوئی قانون یا قرار داد منظور کر لی گئی تو اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی اور اسے وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کے فوراً بعد عدالت کے آخری فیصلہ تک اس پر عمل درآمد ملتوی ہو جائے گا۔

(دفعہ نمبر ۴) ملک کی تمام عدالتیں ہر قسم کے مقدمات بشمول مالی وغیرہ کے شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند ہوں گی اور شریعت کے خلاف کیے گئے فیصلوں کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی۔ (دفعہ نمبر ۵) وفاقی شرعی عدالت کا دائرہ اختیار سماعت و فیصلہ بلا کسی استثنٰی ہر قسم کے مقدمات پر حاوی ہو گا اور عبوری دستور حکم ۱۹۸۵ء کی دستوری ترامیم کے ذریعے لگائی گئی پابندیاں فوراً ختم کر دی جائیں گی۔

(دفعہ نمبر ۶) انتظامیہ کا کوئی بھی فرد بشمول صدر مملکت اور وزیر اعظم کے شریعت کے خلاف کوئی حکم نہیں دے سکے گا۔ اگر ایسا کوئی حکم دے دیا گیا ہو تو اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی اور اسے عدالت میں چیلنج کیا جا سکے گا۔

(دفعہ نمبر ۷) حکومت کے تمام عمال پر بشمول صدر مملکت شرعی عدالت کا فیصلہ ملک کے عام دوسرے باشندوں کی طرح یکساں طور پر نافذ ہو گا اور کوئی بھی ملک کا باشندہ اسلامی قانونی عدل کے مطابق عدالتی احتساب سے بالاتر نہیں ہو گا ۔

(دفعہ نمبر ۸) مسلمہ اسلامی فرقوں کے شخصی معاملات ان کے اپنے اپنے فقہی مسلک کے مطابق طے کیے جائیں گے ۔

(دفعہ نمبر ۹) غیر مسلم باشندگان مملکت کو اپنے بچوں کے لئے مذہبی تعلیم اور اپنے ہم مذہبوں کے سامنے اپنی مذہبی تبلیغ کی آزادی ہو گی اور انہیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون کے مطابق کرنے کا حق حاصل ہو گا ۔

(دفعہ نمبر ۱۰) تمام عدالتوں میں حسب ضرورت تجربہ کار جید اور مستند علماء دین کا بحیثیت جج اور معاونینِ عدالت تقرر کیا جائے گا ۔

(دفعہ نمبر ۱۱) علوم شرعیہ اور اسلامی قانون کی تعلیم اور ججوں کی تربیت کا ایسا موثر انتظام کیا جائے گا کہ مستقبل میں علومِ شرعیہ اور خصوصاً اسلامی قانون کے ماہر جج تیار ہو سکیں ۔

(دفعہ نمبر ۱۲) قرآن و سنت کی وہی تعبیر معتبر ہوگی جو اہل بیت عظامؓ صحابہ کرامؓ اور مستند مجتہدین کے علم اصولِ تفسیر اور علمِ اصول حدیث کے مسلمہ قواعد و ضوابط کے مطابق ہو ۔

دفعہ نمبر ۱۳) انتظامیہ عدلیہ مقننہ کے ہر فرد کے لیے فرائض شریعت کی پابندی اور محرمات شریعت سے اجتناب کرنا لازم ہو گا ۔

دفعہ نمبر ۱۴) تمام ذرائع ابلاغ کو خلاف شریعت پروگراموں فواحش اور منکرات سے پاک کیا جائے گا ۔

(دفعہ نمبر ۱۵) حرام طریقوں اور خلاف شریعت کاروبار کے ذریعے دولت کمانے پر پابندی ہو گی ۔

(دفعہ ۱۶) شریعت نے جو بنیادی حقوق باشندگان ملک کو دیے ہیں ان کے خلاف کوئی حکم نہیں دیا جائے گا۔ اگر ایسا کوئی حکم دیا گیا تو اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی اور اسے عدالت میں چیلنج کیا جا سکے گا۔

مسودہ قانون شریعت کے اغراض و مقاصد و وجوہ

۔ ملک خدا داد پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے۔

۔ اس کی بنیاد اسلام کے نظریہ پر قائم ہے۔

۔ اس مسودہ قانون کی غرض و غایت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور ملک کے اسلامی نظریہ کا استحکام ہے۔

۔ اہلِ ملک جو بلا امتیاز عرصہ سے اس نظام کے لئے بے چین ہیں کو مطمئن کرنا ہے۔

۔ ملک میں صحیح اسلامی معاشرہ کے ذریعے امن و امان اور اسلامی مساوات قائم کرنا ہے۔

(بحوالہ پی سی پی پی آئی ۴۳۴ (۸۵) سینٹ/۳۰۰)

ضمیمہ ۳

متفقہ ترمیمی شریعت بل ۱۹۸۶ء

(جو ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو جامعہ نعیمیہ لاہور میں ترتیب دیا گیا)

ابتدائیہ :
ہر گاہ کہ قرار دادِ مقاصد جو پاکستان میں شریعت کو بالادستی عطا کرتی ہے ، کو دستور اسلامی جمہوریہ پاکستان ۱۹۷۳ء کا مستقل بالذات حصہ بنا دیا گیا ہے ۔ اور ہر گاہ کہ مذکورہ قرار دادِ مقاصد کے اغراض کو بروئے کار لانے کے لیے ضروری ہے کہ شریعت کے فی الفور نفاذ کو یقینی بنایا جائے ۔

لہٰذا حسب ذیل قانون بنایا جاتا ہے ۔

دفعہ ۱: مختصر عنوان ، وسعت اور آغاز نفاذ :

(الف) اس ایکٹ کو نفاذ شریعت ایکٹ ۱۹۸۶ء کہا جائے گا ۔
(ب) یہ ایکٹ تمام پاکستان پر وسعت پذیر ہوگا ۔
(ج) اس ایکٹ میں شامل کسی امر کا اطلاق غیر مسلموں کے شخصی قوانین پر نہ ہو گا ۔
(د) یہ ایکٹ فوری طور پر نافذ العمل ہوگا ۔

دفعہ نمبر ۲ تعریفات

اس ایکٹ میں تاوقتیکہ متن سے کوئی مختلف مفہوم مطلوب ہو ، مندرجہ ذیل اصطلاحات سے وہ مفہوم مراد ہے جو ذیل میں انہیں دیا گیا ہے یعنی :
(الف) قرارداد مقاصد سے مراد وہ مفہوم ہے جو آرٹیکل ۲ الف دستور اسلامی جمہوریہ پاکستان ۱۹۷۳ء میں اسے دیا گیا ہے ۔
(ب) مقررہ سے مراد اس ایکٹ کے تحت مقررہ قواعد ہیں ۔
(ج) شریعت سے مراد قرآن و سنت ہیں ۔
توضیح : قرآن و سنت کے احکام کی تعبیر کرتے ہوئے درج ذیل مآخذ سے رہنمائی حاصل کی جائے گی :

(۱) سنّت خلفائے راشدینؓ
(۲) تعامل اہل بیت عظام و صحابہ کرامؓ
(۳) اجماع امت
(۴) مسلمہ فقہائے اسلام کی تشریحات و آراء

دفعہ نمبر۳ شریعت کی دیگر قوانین پر بالاتری :

کسی دیگر قانون ، رواج ، تعامل یا بعض فریقوں کے مابین معاملہ یا لین دین میں شامل کسی بھی امر کے اس سے مختلف ہونے کے باوجود ، شریعت پاکستان میں بالاتر قانون کی حیثیت سے موثر ہوگی ۔

دفعہ نمبر ۴ عدالتیں شریعت کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کریں گی :

ملک کی تمام عدالتیں تمام امور و مقدمات بشمول مالی امور وغیرہ میں شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند ہوں گی اور شریعت کے خلاف فیصلوں کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی ۔ اگر کسی عدالت میں یہ سوال اٹھایا جائے کہ آیا کوئی قانون یا فیصلہ شریعت کے منافی ہے تو اس مسئلہ کے تصفیہ کے لئے وفاقی شرعی عدالت سے رجوع کیا جائے گا ۔

دفعہ نمبر ۵ وفاقی شرعی عدالت کا دائرہ اختیار :

وفاقی شرعی عدالت کا دائرہ اختیار سماعت و فیصلہ ، بلا استثنٰی تمام امور و مقدمات پر حاوی ہو گا ۔

دفعہ نمبر ۶ شریعت کے خلاف احکامات دینے پر پابندی :

انتظامیہ کا کوئی بھی فرد ، بشمول صدرِ مملکت اور وزیر اعظم ، شریعت کے خلاف کوئی حکم نہیں دے سکے گا ۔ اور اگر ایسا کوئی حکم دیا گیا تو اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی اور اسے وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کیا جا سکے گا بشرطیکہ شکایت کنندہ کے لئے کوئی اور قانونی مداوا موجود نہ ہو ۔

دفعہ نمبر ۷ عدالتی عمل اور احتساب :

حکومت کے تمام عمّال ، بشمول صدر مملکت ، اسلامی قانونِ عدل کے مطابق احتساب سے بالا تر نہیں ہوں گے ۔

دفعہ نمبر ۸ ۔ مسلمہ اسلامی فرقوں کے شخصی معاملات ان کے اپنے اپنے فقہی مسلک کے مطابق طے کئے جائیں گے

دفعہ نمبر ۹ غیر مسلم کو تبلیغ کی آزادی :

یہ شق حذف کر دی گئی ہے (کیونکہ دفعہ (۱) کی شق (ج) کے بعد اس کی ضرورت نہیں)

سفارشی دفعہ نمبر ۱۰ علماء کو جج مقرر کیا جائے گا :

تمام عدالتوں میں حسبِ ضرورت تجربہ کار اور جید علمائے دین کا بحیثیت جج اور معاونین عدالت تقرر کیا جائے گا ۔

سفارشی دفعہ نمبر ۱۱ ججوں کی تربیت کے انتظامات :

علوم شرعیہ اور اسلامی قانون کی تعلیم اور ججوں کی تربیت کا ایسا انتظام کیا جائے تاکہ مستقبل میں علوم شرعیہ اور خصوصاً اسلامی قانون کے ماہر جج تیار ہو سکیں ۔

دفعہ نمبر ۱۲ قرآن و سنت کی تعبیر کا طریق کار :

قرآن و سنت کی تعبیر کا طریق کار وہی ہو گا جو مسلمہ مجتہدین کے علم اصول تفسیر اور علم اصول حدیث و فقہ کے مسلمہ قواعد اور ضوابط کے مطابق ہو ۔

دفعہ نمبر ۱۳ عمال حکوت کے لئے شریعت کی پابندی :

انتظامیہ ، عدلیہ اور مقننہ کے ہر فرد کے لئے فرائض شریعت کی پابندی اور محرمات سے اجتناب کرنا لازم ہو گا ۔

جو شخص اس کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو گا ، وہ مستوجب سزا ہو گا ۔ (یہاں کوئی سزا متعین کر دی جائے) بشرطیکہ کسی دیگر قانون کے تحت یہ جرم مستوجبِ سزا نہ ہو ۔

دفعہ نمبر ۱۴ ذرائع ابلاغ کی تطہیر :

تمام ذرائع ابلاغ سے خلاف شریعت پروگراموں ، فواحش اور منکرات کی اشاعت ممنوع ہو گی ۔ جو شخص اس کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو گا مستوجب سزا ہو گا (یہاں متعین طور پر سزا کا ذکر کرنا مناسب ہو گا مثلاً دو سال قید بامشقت اور جرمانہ) بشرطیکہ کسی دوسرے قانون کے تحت یہ جرم مستوجب سزا نہ ہو ۔

دفعہ نمبر ۱۵ حرام کی کمائی پر پابندی :

خلاف شریعت کاروبار کرنا اور حرام طریقوں سے دولت کمانا ممنوع ہو گا ۔ جو شخص اس کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو گا ۔ مستوجب سزا ہو گا (یہاں سزا متعین کی جائے گی) بشرطیکہ کسی دوسرے قانون کے تحت یہ جرم مستوجب سزا نہ ہو ۔

دفعہ نمبر ۱۶ بنیادی حقوق کا تحفظ :

شریعت نے جو بنیادی حقوق باشندگان ملک کو دئے ہیں ان کے خلاف کوئی حکم نہیں دیا جائے گا ۔

دفعہ نمبر ۱۷ قواعد سازی کے اختیارات :

اس ایکٹ کے مقاصد کے حصول اور شریعت کے عملی نفاذ اور اس قانون پر عمل درآمد کرانے کے لئے مرکزی حکومت کو اختیار ہوگا کہ ضروری قواعد وضع کرے ۔ ان قواعد کا نفاذ اس دن سے ہو گا جس دن مرکزی حکومت انہیں گزٹ میں شائع کرے گی ۔

(نمائندگان کے دستخط)

۱۔ محمد عبد القیوم ناظم اعلیٰ جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور

۲۔ حافظ عبد الرحمٰن مدنی رابطہ علمائے اہل حدیث پاکستان

۳۔ محمد اجمل نائب امیر مرکزیہ جمعیت علماء اسلام پاکستان

۴۔ محمد اسلم سلیمی نائب قیم جماعت اسلامی پاکستان
۵۔ میاں شیر عالم ایڈووکیٹ لاہور نائب صدر ورلڈ ایسوسی ایشن آف مسلم جیورسٹز

ضمیمہ ۳

THE CONSTITUTIONAL (9th Amendment) Act , 1985

[AS INTRODUCED IN THE SENATE]

A

BILL

Further to amend the Constitution of the Islamic Republic of Pakistan.

WHEREAS it is expedient further to amend the Constitution of the Islamic Republic of Pakistan for the purposes hereinafter appearing:

It is hereby enacted as follows:—

1. Short title and commencement. —— (1) This Act may be called the Constitution (Ninth Amendment) Act. 1985.

2. It shall come into force at once.

2. Amendment of Article 2 of the Constitution —— In the Constitution of the Islamic Republic of Pakistan hereinafter referred to as the Constitution in Article after the word "Pakistan", at the end, the words "and the Injunctions of Islam as laid down in the Holy Quran and Sunnah shall be the supreme law and source of guidance or legislation to be administered through laws enacted by the Parliament and Provincial Assemblies, and for policy making by the Government" shall be added.

3. Amendment of Article 203B of the Constitution ——In the Constitution, in Article 203B, in paragraph (c).

(a) For the comma after the word "Constitution" a full stop shall be substituted and

(b) The words commas and semi-colon. "Muslim personal law any law relating to the procedure of any court or tribunal or, until the expiration of ten years from the commencement of this Chapter any fiscal law or any law relating to the levy and collection of taxes and fees or banking or insurance practice and procedure and" shall be omitted.

4. Amendment of Article 203D of the Constitution —— In the Constitution in Article 203D after clause (3), the following new clauses shall be added namely: –

(3A) Notwithstanding anything contained in this Chapter in respect of any fiscal law or any law relating to the levy and collection of taxes and fees or banking or insurance practice and procedure, the Court shall, in case of a law held by it to be repugnant to the Injunctions of Islam, in consultation with persons having special knowledge of the subject, recommend to the Government specific measures and a reasonable time within which to take adequate steps and amend such law so as to bring it in conformity with the Injunctions of Islam:

Provided that the decisions of the Court shall not have retrospective effect and no right or claim shall be based thereon accordingly directly or indirectly.

(3B) Notwithstanding anything contained in the Constitution including this Chapter or clause (3A) or anything done pursuant thereto, or any law or any judgment of any Court to the contrary, all existing laws relating to the levy and collection of taxes and fees or banking or insurance practice and procedure which are the subject matter of decision of the Court referred to in clause (3A), shall continue to remain in force until such time as appropriate laws are enacted by the legislature in substitution of such existing laws as a consequence of the final decision of the Court, as stated in clause (3A), and until the said laws have been enforced:

Provided that nothing contained in clauses (3A) and (3B) shall apply to assessments made, orders passed, prodceedings pending and amounts payable or recovered before the enforcement of the laws enacted in pursuance of clause (3A).

STATEMENT OF OBJECTS AND REASONS

In consonance with the provisions of Articles 2 and 227 of the Constitution of the Islamic Republic of Pakistan, which respectively provide that Islam shall be the State religion of Pakistan and that all laws shall be brought in conformity with the Injunctions of Islam, as also the Objectives Resolution, this Bill seeks to amend Articles 2,203B and 203D of the constitution so as to provide that the Injunctions of Islam shall be the supreme law and source of guidance for legislation and policy-making and to empower the Federal Shariat Court to make recommendations for bringing the fiscal laws and laws relating to the levy and collection of taxes in conformity with the said Injunctions.

IQBAL AHMED KAHAN,
Minister-in-Charge.

ضمیمہ ۵

ENFORCEMENT OF SHARI'AH ORDINANCE, 1988

Dated 15th June, 1988.

Whereas the Principles and Provisions set out in the Objectives Resolution have been incorporated in the Constitution of the Islamic Republic of Pakistan as substantive part thereof;

And whereas the Objectives Resolution provides that the Muslims shall be enabled to order their lives in the individual and collective spheres in accordance with the teachings and requirements of Islam as set out in the Holy Quran and the Sunnah;

And whereas it is necessary to carry out the purposes of the Objectives Resolution and provide that all existing laws shall be brought in conformity with the injunctions of Islam as laid down in the Holy Quran and Sunnah;

Now, therefore, in exercise of the powers conferred by Clause (1) of Article 89 of the Constitution of the Islamic Republic of Pakistan, the President is pleased to make and promulgate the following ordinance:–

1. **Short tile, extent and commencement**––(1) This Ordinance may be called the Enforcement of Shari'ah ordinance, 1988.

(2) It extends to the whole of Pakistan and it shall have effect notwithstanding anything contained in any other law, or any custom or usage having the force of law.

(3) Nothing contained in this Ordiance shall affect the personal laws of the non-Muslims.

(4) It shall come into force at once.

2. **Definitions.** – In this Ordinance, unless there is anything repugnant in the subject or context –

(a) "appropriate Government" means,––

(i) In relation to any matter enumerated in the Federal Legislative in the Federal Legislative List or the Concurrent Legislative List in the Constitution or any matter which relates to the Federation, the Federal Government; and

(ii) In relation to any matter not enumerated in either of the said Lists or any matter which relates to the province, the Provincial Government:

(b) "Court" means a court subordinate to a High Court;

(c) "Mufti" means a Muslim scholar well-versed in Shari'ah appointed under this Ordinance to assist the Supreme Court, a High Court or the Federal Shari'at Court in the interpretation of Shari'ah;

(d) Objectives Resolution" means the Objective Resolution referred to in Article 2-A of the Constitution and reproduced in the Annex thereto;

(e) "Shari'ah" means the injunctions of Islam as laid down in the Holy Quràn and Sunnah.

Explanation -- As envisaged in Article 227 of the Constitution, in interpreting the Shari'ah with respect to the personal law of any muslim sect, the expression "Quran and Sunnah" shall mean the Quran and Sunnah as interpreted by that sect.

3. Supremacy of Shari'ah -- Shari'ah shall be the supreme source of law in Pakistan and Grund Norm for guidance for policy making by the State and shall be enforced in the manner and as envisaged hereunder.

4. Court to decide Cases according to Shari'ah -- If a question arises before a court that a law or provision of law is repugnant to Shari'ah, the court shall, if it is satisfied that the question needs consideration, make a reference to the Federal Shari'at Court in respect of matters which fall within the jurisdiction of the Federal

Shari'ah Court under the Constitution and that court may call for and examine the record of the case and decide the question within sixty days:

Provided that if the question relates to Muslim personal law, any fiscal law or any law relating to the levy and collection of taxes and fees or banking or insurance practice and procedure, the court shall refer the question to the High court which shall decide the question within sixty days:

Provided further that no question as to the repugnancy or otherwise to Shar'ah shall be entertained by the court in respect of a law or provision of law already examined by the Federal Shari'at Court or the Shari'at Appellate Bench of the Supreme Court and found not repugnant to Shari'ah.

(2) The second proviso to Sub-section (1) shall not affect the jurisdiction of the Federal Shari'at Court and the Shari'at Applellate Bench of the Supreme Court to review any decision given or order made by it.

(3) The High Court may, either of its own motion or on the petition of a citizen of Pakistan or the Federal Government or a Provincial Government or on a reference made to it under the first proviso to Sub-section (1), examine and decide the question whether or not any law relating to Muslim personal law, any fiscal law or any law relating to the levy and collection of taxes and fees or banking or insurance practice and procedure or any provision of such law, is repugnant to Shari'ah:

Provided that while examining and deciding the question, the High Court shall call for and hear the views of experts having specialized knowledge in the field to which the question relates and of such other persons as the High Court may deem fit.

(4) Where the High Court takes up the examination of a law or provision of law under Sub-section (3), and such law or provision of law appears to it to be repugnant to Shari'ah, the High Court shall cause to be given to the Federal

Government in the case of law with respect to a matter in the Federal Legislative List or the concurrent Legislative List in the Constitution or to the Provincial Government in the case of a law with respect to a matter not enumerated in either of those List, notice specifying the particular provisions that appear to it to be so repugnant, and afford to such government adequate opportunity to have its point of view placed before the High Court.

(5) If the High Court decides that any such law or provision of law is repugnant to Shari'ah, it shall set out in its decision ---

(a) the reasons for its holding that opinion; and

(b) the extent to which such law or provision is so repugnant:

(6) The High Court shall have power to review any decision given or order made by it under this section.

(7) the jurisdiction conferred on the High Court by this section shall be exercised by a Bench of not less than three judges.

(8) Where a question referred to in Sub-section (1) or Sub-section (3) arises before a Single or Division Bench of the High court, it shall be referred to a Bench of not less than three judges.

(9) Any party aggrieved by the final decision of the High Court in any proceedings under this section may within sixty days of such decision, prefer an appeal to the Supreme Court:

Provided that an appeal on behalf of the Federation or of a Privince may be preferred at any time after the decision but not later than six months of the day on which the decision shall take effect and such extended period as may be allowed by the High Court under Sub-section (5).

(10) Nothing contained in this Ordinance nor decision made thereunder shall affect any proceedcings pending

before any Court or Tribunal or any sentences passed or orders made, judgements pronounced, decrees, passed, liabilities incurred, rights accrued, assessments made, amounts recovered or declared payable under any law by any court or tribunal or authority before the commencement of this Ordinance.

Explanation – For the purposes of this Sub-section, the word "Court" or "Tribunal" shall mean any Court or Tribunal established by or under any law the Constitution at any time before the commencement of this Ordinance and the word "authority" shall mean any authority established under any law for the time being in force.

(11) No court or tribunal including the High Court shall adjourn or stay any proceedings whether pending or initiated after the commencement of the Ordinance by reason only that the question whether a law or provision of law is repugnant to the Shari'ah has been referred to the High Court or the Federal Shari'at Court has otherwise undertaken examination of this question under Section 4 and all such proceedings shall continue and the point in issue therein shall be decided in accordance with the law for the time being in force.

5. Ulema to be appointed as Judges, etc.

(1) Experienced and qualified ulema shall be eligible to be appointed as judges, and amicus curiae in the court.

(2) Persons well-versed in Shari'ah from reputable institutions of Islamic learning and Deeni Madaris in Pakistan or abroad, recognised by the appropriate government for this purpose shall, notwithstanding anything contained in any other law for the time being in force, be eligible for appearing before the court for interpretation of Shari'ah in accordance with the rules to be framed for this purpose.

(3) The President shall, in consulation with the Chief Justice of Pakistan, the Chief Justice of the Federal Shari'at Court and Chairman of the Council of Islamic Ideol-

ogy, make rules for the purpose of Sub-section (1) specifying the qualifications and experience required for appointment of judges, and amicus curiae in the courts.

(4) Persons holding graduate and post-graduate degrees in law and Shari'ah from the universities or International Islamic University, Islamabad, shall, notwithstanding anything contained in any other law for the time being in force, be eligible for being enrolled as advocates in accordance with the rule to be framed for this purpose.

(5) The provisions of the section shall not affect in any manner whatsoever the right of the advocates enrolled under the law relating to legal Practitioners and Bar Councils to appear in various courts, tribunals and other authorities including the Supreme Court, a High Court or the Federal Shari'at Court.

6. **Appointment of Muftis.** (1) The President shall, in consultation with the Chief Justice of Pakistan, the Chief Justice of the Federal Shari'at Court and the Chairman of the Council of Islamic Ideology, appoint in his individual judgement as many Muftis as he may deem fit for rendering such assistance as may be required of them by the Supreme Court, the High Court and the Federal Shari'at Court.

(2) A Mufti appointed under Sub-section (1) shall hold office during the pleasure of the President and shall receive such remuneration as is for the time being admissible to a Deputy Attorney-General for Pakistan.

(3) It shall be the duty of a Mufti to give advice to the Federal Government upon such legal matters involving interpretation of Shari'ah, and perform such other duties as may be referred or assigned to him by the Federal Government; and in the performance of his duties he shall have the right of audience in the Supreme Court and the High court while exercising jurisdiction under this Ordinance and in the Federal Shari'ah Court.

(4) A Mufti shall not plead for any party but shall state, expound and interpret Shari'ah relevant to the proceedings as far as may be known to him and submit to the Court a written statement of his interpretation of Shari'ah.

(5) The Ministry of Justice and Parliamentary Affairs in the Government of Pakistan shall deal with the administrative matters relating to the Muftis.

7. Teaching of and traning in Shari'ah

(1) The State shall make effective arrangements for the teaching of, and training in Shari'ah and Islamic jurisprudence and the holding of refresher programmes at regular intervals in the Federal Judicial Academy, Islamabad, or other similar institutions for the members of the subordinate judiciary.

(2) The State Shall make effective arrangements for providing education and training in various branches of Islamic Law in order to ensure the availability of manpower trained in the administration of justice according to Shari'ah.

(3) The Chief Justice of Pakistan shall make rules for the participation of the Judges of Superior Courts in seminars and programmes connected with Shari'ah.

(4) The State shall make effective measures to include courses in Shari'ah in the syllabi of the law colleges in Pakistan.

8. Islamisation of economy. (1) The State shall take steps to ensure that the economic system of Pakistan is constructed on the basis of Islamic economic principles, values and priorities.

(2) The President shall, within thirty days from the commencement of this Ordinance, appoint in his individual judgement a permanent Commission consisting of economistis, jurists, ùlema, elected representatives and such other persons as he may deem fit, and appoint one of them to be its Chairman.

(3)The Chairman of the Commission shall have the powers to appoint such consultants as he may deem necessary.

(4)The functions of the Commission shall be:

(a)To undertake the examination of any fiscal law or any law relating to the levy and collection of taxes and fees or banking or insurance practice and procedure to determine whether or not these are repugnant to Shari'ah.

(b)To make recommendations to bring such law practices and procedures in conformity with Shari'ah.

(c)To recommend the methods of such changes in the economic system of Pakistan so as to achieve the social and economic well being of the people as envisaged by Article 38 of the Consititution; and

(d)To suggest the manner and actions including suitable alternative by which the system of economy as enunciated by Islam may be brought into effect.

(5) The Commission shall submit its reports, from time to time to the Federal Government.

(6) A comprehensive report containing recommendations of the Commission shall be submitted to the Federal Government within a period of one year from the date of its appointment.

(7) The Commission shall have the power to conduct its proceedings and regulate its procedure in all respects as its may deem fit.

(8) All executive authorities, institutions, and local authorities shall act in aid of the Commission.

(9) The Commission shall monitor the process of Islamization of the economy and bring cases of non-compliance to the notice of the President.

(10) The Ministry of Finance and Economic Affairs in the Government of Pakistan shall deal with the adminis-

trative matters relating to the Commission.

9. **Islamisation of education.** (1) The State shall, for a omprehensive and harmonious development as an Islamic society, take steps to ensure that the education system of Pakistan is based on Islamic values of learning and teachings.

(2) The President shall, within thirty days from the commencement of this Ordinance, appoint in his individual judgment a permanent Commission consisting of educationists, jurists, ulema and elected representatives and such other persons as he may deem fit and appoint one of them to be its Chairman.

(3) The Chairman of the Commission shall have the powers to appoint such consultants as he may deem necessary.

(4) The functions of the Commission shall be to examine the educational system of Pakistan to achieve the objective referred to in Sub-section (1) and make recommendations in this behalf.

(5) The Commission shall submit its reports, from time to time to the Federal Government.

(6) A comprehensive report containing recommendations of the Commission shall be submitted to the Federal Government within a period of one year from the date of its appointment.

(7) The Commission shall have the power to conduct its proceedings and regulate its procedure in all repects as it may deem fit.

(8) All executive authorities, institutions and local authorities shall act in aid of the Commission.

(9) The Commission shall monitor the process of Islamization of education and bring cases of non-compliance to the notice of the President.

(10) The Ministry of Education in the Government of Pakistan shall deal with the administrative matters relating to the Commission.

10. Mass media to promote Islamic values. —— Steps shall be taken by the State so that the mass media promote Islamic values.

11. Laws to be interpreted in the light of Shari'ah. —— For the purpose of the Ordinance:–

(i) While interpreting the statute law, if more than one interpretation is possible, the one consistent with the Islamic principles and juriprudence shall be adopted by the Court, and

(ii) Where two or more interpretations are equally possible, the interpretation which advances the Principles of Policy and Islamic provisions in the Constitution shall be adopted by the Courts.

12. Expeditious codification of Islamic Law. (1) The Council of Islamic Ideology shall take urgent steps to fulfil its function as envisaged by Sub-Clauses (c) and (d) of Clause (1) of Article 230 of the Constitution.

(2) The State shall take early steps to place the recommendations made to it by the Council of Islamic Ideology, before the Parliament for the purpose envisaged in Clause (4) of Article 230 of the Constitution.

13. Continuance of International financial obligations —— Notwithstanding anything contained in this Ordinance or any decision given thereunder, the financial obligations incurred or which may be incurred, and contarcts made or which may be made, before or after the commencement of this Ordinance, between a National Institution and a Foreign Agency shall continue to remain valid, binding and operative and no court including the High Court and the Supreme Court shall have any jurisdiction to pass any order or make any decision under this Ordinance

in respect of such obligations and contracts.

Explanation-- In this section, the expression "National Institution" shall include the Federal Government or Provincial Government, a statutory corporation, company, institution, body, enterprise or any person in Pakistan and the expression "Foreign Agency" shall include a foreign Government, a foreign financial institution, foreign capital market, including a Bank or any foreign leading Agency, including an individual.

14. Fulfilment of existing obligation. -- Nothing contained in this Ordinance or any decision given thereunder shall affect the validity of any financial obligations incurred including under any instruments, whether contractual or otherwise, promises to pay, or any other financial commitment made by or on behalf of the Federal Government or a Provincial Government or a financial or statutory corporation or other institution to make payments envisaged therein, and all such obligations, promises and commitments shall continue to remain valid, binding and operative.

15. **Rules.** --The appropriate Government may, by notification in the official Gazette, make rules for carrying out the purpose of this Ordinance.